WWW.URDUBOOKS.NET

ادبی خوشخبری

جنید علی کا شاہکار ناول

ساز سے سوز دروں

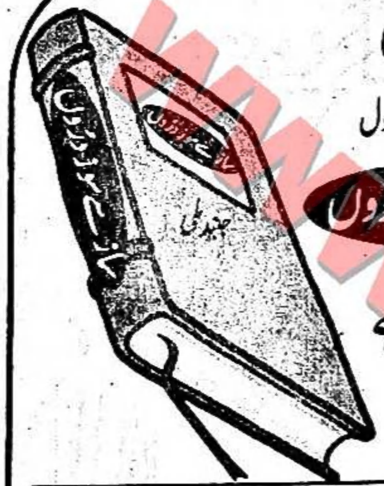

شائع ہو گیا ہے

نمایاں خصوصیات:۔

☆......اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والی ہر دو اصناف کی دلچسپیوں سے مرصع۔

☆......مسحور کن اندازِ قصہ گوئی۔

☆......لسانی رنگینیوں کا گلدستہ۔

☆......تاریخ، فلسفہ، رومانس اور شاعری کے اجزاء سے مرکب پلاٹ۔

☆......سنجیدگی اور مزاح کا امتزاج۔

☆......کہانی معاشرے کے ایک جانے پہچانے کردار کی

☆......کہانی جسے بطور ہیرو بہت کم پیش کیا گیا۔

......علمی و ادبی بذلہ سنجیوں سے آراستہ۔

☆......عام سطح کے قارئین کیلئے بھی سامانِ حظ سے معمور۔

قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا رہنمائی کیلئے

رابطہ کریں: 0332-4735953-0333-4551507

لاثانی

www.lasaniindustries.com

پاکستان کا نمبر 1 برانڈ

نام بھی لاثانی

معیار بھی لاثانی

وزن گھٹائیں
صحت پائیں

عرق مہزل TM

ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو کم کرنے کیلئے مؤثر دوا

لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ

lasanipharma@yahoo.com

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

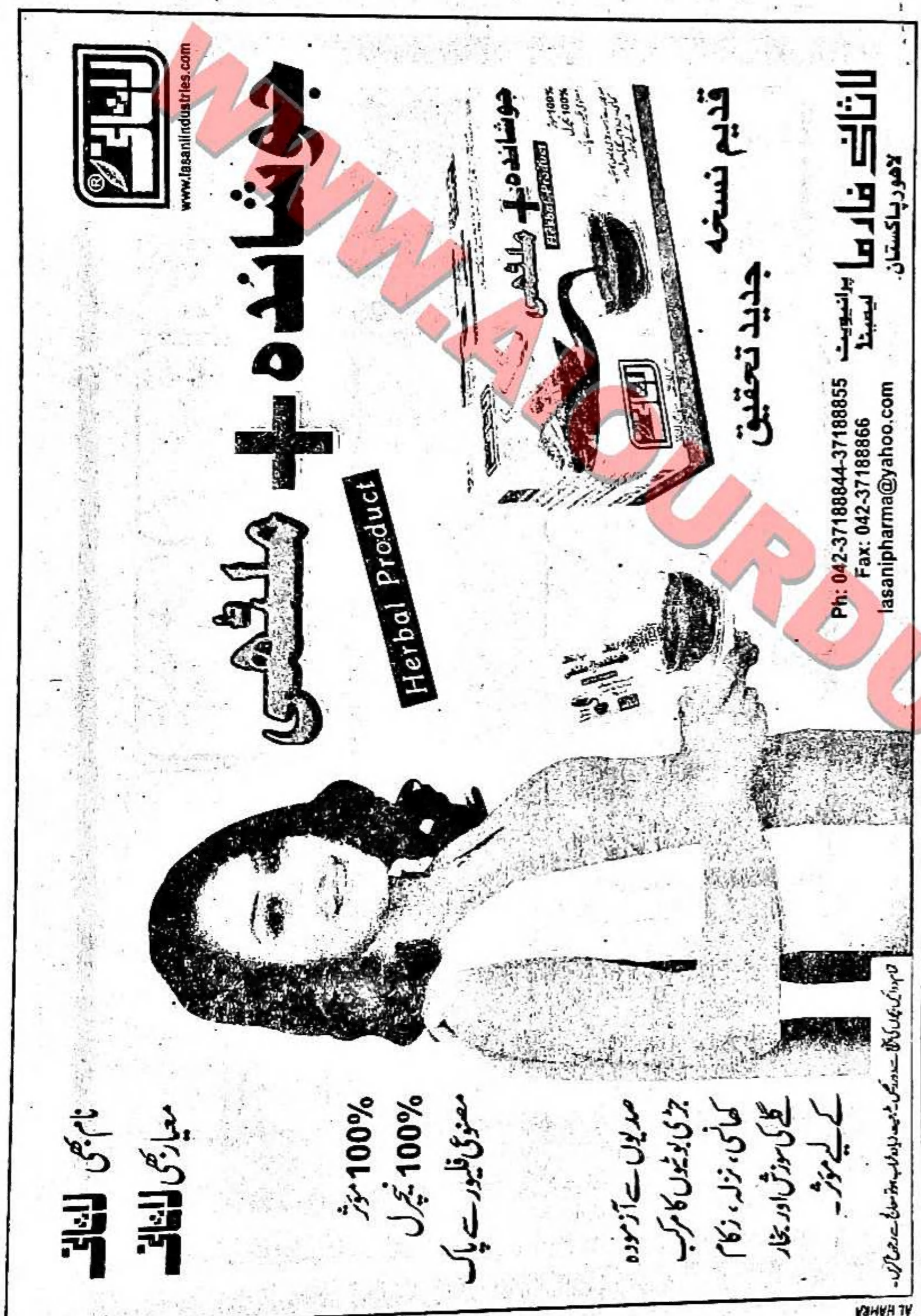

نورِ مُبین

جولوگ (اللہ کی) کتاب سے اُن (آیتوں اور ہدایتوں) کو جو
اُس نے نازل فرمائی ہیں چھپاتے اور اُن کے بدلے تھوڑی
سی قیمت (یعنی دُنیاوی منفعت) حاصل کرتے ہیں وہ اپنے
پیٹوں میں محض آگ بھرتے ہیں ایسے لوگوں سے اللہ قیامت
کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ اُن کو گناہوں سے پاک کرے گا
اور اُن کے لئے دُکھ دینے والا عذاب ہے (174)

سورۃ البقرۃ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ماہنامہ

حکایت

لاہور

جلد: 46 | سالنامہ فروری 2016ء | شمارہ: 06

بانی
عنایت اللہ (رح)
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
اعزازی مدیر: دستگیر شہزاد
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ
شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت
ابدال بیلا — عظمت فاروق
میم الف — ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نغمہ علی — ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

سرکولیشن مینجر
فضل رزاق
محمد نثار رانجھا
شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن
کمپوزنگ
محمد زبیر
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564

قیمت /120 روپے

ہیڈ آفس 26 ... لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

لاثانی
www.lasaniindustries.com
نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی

ٹانسلز کے آپریشن سے پہلے ایک بار ضرور آزمائیں

صرف توت سیاہ نہیں ... بلکہ

لاثانی توت سیاہ + ملٹھی

• درد میں افاقہ کرتا ہے۔ • گلے کی سوزش دور کرتا ہے۔
• آواز بیٹھ جانے میں مفید ہے۔ • گلے کی خرابی کی وجہ سے ہونے والی حرارت کو ٹھیک کرتا ہے۔

T.M # 277568 C.R # 24432

کلپین TM

صرف بیرونی استعمال کیلئے

نام بھی لاثانی
معیار بھی لاثانی

T.M # 165025
C.R # 10955

Ph:
042-37188844-
042-37188855
Fax:
042-37188866

پٹھوں کے درد، جوڑوں کے درد، موچ، کمر درد اور اعصابی درد کے لئے موثر ہے

درد مٹائے آرام پہنچائے فوری جذب ہو کر اثر دکھائے

لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ
lasanipharma@yahoo.com

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس شمارے میں

خصوصی فیچر		
پھندہ یا شکنجہ؟	افضال مظہر انجم	15
جرم و سزا		
ڈرامہ جو میں نے کھیلا	عبدالخالق	23
اغوا کے بعد	احمد یار خان	33
طب و نفسیات		
جذبات کا جہنم	ڈاکٹر فیاض احمد ہرل	58
دستِ شفاء	ڈاکٹر رانا محمد اقبال	237
مکافاتِ عمل		
اللہ کی سنت	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	62
سلسلہ وار ناول		
ایک دل ہزار داستان قسط:2	ایم اے صفی	65
میں بھول نہیں سکتا		
ضمیر کا مجرم	رضوان قیوم	83
لمحۂ فکریہ		
وہ اپنے ملک سے......	ابدال بیلا	93
ناولٹ		
خواب سے عذاب تک	نسیم سکینہ صدف	
ایک تاثر		
اللہ وکیل	حبیب اشرف صبوحی	110
علم و تحقیق		
جادو، جنات اور عامل قسط:3	محمد افضل رحمانی	113
دستورِ کامل	حافظ محمد عادل	183
کشمیر کہانی		
وقت کے قیدی	دستگیر شہزاد	129
چار دیواری کی دنیا		
اور وہ پاگل ہوگیا	فرزانہ نگہت	139

اس شمارے میں

جگ بیتی			
شناخت		ڈاکٹر مبشر حسن ملک	145
طنز و مزاح			
رن OUT		خادم حسین مجاہد	177
معاشرت			
درز		شازیہ حسن	188
ایک حقیقت ایک افسانہ			
کالو		پیرزادہ علیم معصومی	193
بات ہے رسوائی کی			
اسیرِ فریب		دستگیر شہزاد	215
ضربِ سکندری			
پوسٹنگ		سکندر خاں بلوچ	222
ماخوذ			
روسی ایٹم بموں کی چوری		میاں محمد ابراہیم طاہر	225
افسانہ			
سالِ نو		رحما شاہد	239
اندھیرے سے اُجالے تک			
اشکِ ندامت	آخری قسط	رمیز احمد	241
ایک تاثر ایک کہانی			
بزدل		محمد سعید اعوان	253
خصوصی کہانی			
جنت سوزاں	آخری قسط	اختر حسین شیخ	257
فریب خوردہ		رزاق شاہد کوہلر	289
ناقابلِ فراموش			
لسوڑے والا گھر		محمد نذیر ملک	279

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کہنے کی بات

ملک میں دہشت گردی کی تازہ لہر

ہمارے ملک عزیز میں جیسے ہی امن وامان کی صورت بہتر ہونے لگتی ہے، ہمارے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے تنخواہ دار ایجنٹوں اور گماشتوں کے ذریعے دہشت گردی اور بدامنی کی کوئی نہ کوئی نئی واردات کروا دیتے ہیں۔

نئے سال کے آغاز سے صرف دو دن پہلے مردان میں نادرا آفس کے باہر قطاروں میں کھڑے معصوم شہریوں پر خودکش حملے نے 26 شہریوں کی جان لے لی اور 56 کو شدید زخمی کر دیا۔

پھر نئے سال کے آغاز کے بعد، 13 جنوری کو جلال آباد (افغانستان) میں ہمارے قونصل خانے پر اور عین اسی روز کوئٹہ میں انسداد پولیو سینٹر پر خودکش حملے کیے گئے جن میں ہمارے 13 پولیس جوانوں سمیت 15 شہری شہید اور 29 زخمی ہوئے۔ اس سے اگلے دن یعنی 14 جنوری کو دہلی میں ہماری قومی ائر لائن پی آئی اے کے مرکزی بکنگ آفس پر بھارتی دہشت گرد تنظیم بجرنگ دَل کے گماشتوں نے ہلہ بول کر توڑ پھوڑ کی اور سٹاف کو ڈرایا دھمکایا، ہراساں کیا اور پاکستان کے خلاف غلیظ نعرے بازی کی۔ 18 جنوری کو مارگٹ کوئٹہ میں ایف سی بلوچستان کی گاڑی کو ریموٹ کنٹرول بم کا نشانہ بنایا گیا جس میں ہمارے 6 جوان شہید ہوئے۔ 19 جنوری کو کارخانو مارکیٹ پشاور میں خاصہ دار چیک پوسٹ کے قریب خودکش دھماکہ کیا گیا جس میں 11 لوگ شہید اور 36 زخمی ہوئے۔ 20 جنوری کو صبح ساڑھے نو بجے باچا خان یونیورسٹی، چارسدہ پر دہشت گردوں نے حملہ کر کے 21 نہتے طالب علموں بشمول ایک پروفیسر، لائبریرین اور سکیورٹی گارڈ کو شہید اور درجنوں کو زخمی کر دیا۔

اگرچہ ہماری مسلح افواج نے فوری اور بروقت کارروائی کر کے چاروں حملہ آور دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا اور یونیورسٹی کو مزید قتل و غارت سے بچا لیا لیکن خوف و دہشت کی فضا تا حال قائم ہے۔ گو کہ ان کے سہولت کار اور معاونین بھی پکڑے گئے ہیں لیکن جب تک ایسے لوگوں کے لئے متاثرہ شہروں میں سر عام پھانسی گھاٹ قائم کر کے انہیں نمونہ عبرت نہیں بنایا جائے گا، مزید تخریب کاری اور دہشت گردی کے خدشات قائم رہیں گے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

محترم و معزز قارئین! ''حکایت'' کے 47ویں سالنامہ کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ مرحوم و مغفور عنایت اللہ کا لگایا ہوا وہ پودا ہے جو اب الحمدللہ تن آور اور بار آور، گھنا سایہ دار، ادبی، علمی، معلوماتی اور اپنی منفرد اور نمایاں شناخت کی بناء پر تن آور درخت بن چکا ہے۔ یہ سب قارئین محترم! آپ کی سرپرستی، لگن، ''حکایت'' سے وابستگی اور محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ انتہائی نامساعد حالات، کمر توڑ مہنگائی، حکومتی اشتہارات کی عدم موجودگی اور قدر ناشناسی کے باوجود ''حکایت'' باقاعدگی سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔

عنایت اللہ مرحوم اپنے وقت کے ایک عظیم صحافی، جنگی وقائع نگار، منفرد ادیب، تاریخی ناول نگار، جی دار، جری اور بہادر انسان تھے۔ انہوں نے سچائی کو عام کرنے، حق کو پھیلانے نظریۂ پاکستان کی اساس کو مضبوط بنانے اور ''پاکستانیت'' کے جذبے کو فروغ دینے میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور کبھی کسی مصلحت کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ انہی کی زندہ و تابندہ روایات کو ان کے فرزند ارجمند مرحوم شاہد بن عنایت اللہ نے آگے بڑھایا ان کے بعد ''حکایت'' کے مدیر المہام جناب عارف محمود اپنے خونِ جگر سے آبیاری کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ قارئین محترم! آپ کی مسلسل سرپرستی، شفقت، عنایات اور تعاون ہی سے ممکن ہو رہا ہے۔

ہمارے بے شمار ایسے قارئین اب بھی موجود ہیں جن کے پاس ''حکایت'' کے پہلے شمارے سے لے کر آج تک کا ہر شمارہ موجود ہے اور کسی ناگہانی وجہ سے اگر کوئی شمارہ ان تک پہنچنے میں تاخیر ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور اپنے فون، خطوط اور ای میلو کے ذریعے اپنے اضطراب کا اظہار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ ایسے ہی معزز قارئین کی دعاؤں سے انتظامیہ کی حوصلہ افزائی اور قدر افزائی ہوتی ہے۔

''حکایت'' اپنے ان بے شمار اور لاتعداد قلمکاروں، ادیبوں، شاعروں اور لکھاریوں کا بھی شکرگزار ہے جن کا قلمی تعاون اور تحریریں ان صفحات کی زینت بن کر آپ تک پہنچتی ہیں۔ عنایت اللہ مرحوم کا یہ بھی ایک قلمی فیض ہے کہ کئی نو آموز لکھاری ''حکایت'' کی سرپرستی کی بدولت کہنہ مشق صحافی، ادیب و شاعر بن کر پورے ملک میں شہرت و ناموری حاصل کر چکے ہیں اور ''حکایت'' اپنی اس روایت کو اپنے نئے لکھنے والوں کے لئے اب بھی زندہ رکھے ہوئے ہے اور ان شاءاللہ آئندہ بھی زندہ رکھے گا!

میاں محمد ابراھیم طاھر

قلم و قرطاس

تیری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ بنوامیہ اور بنوعباس سے لے کر آج تک عالم اسلام آپس میں کتنا برادرانہ یا جارحانہ رہا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اسلام اور مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو آپس میں گڈمڈ کرنا مناسب نہیں۔ ایران اور سعودی عرب کے درمیان جو سرد جنگ چل رہی ہے سب جانتے ہیں لیکن تمام تر تفحیک کے باوجود عالم اسلام کچھ بھی سمجھنے سے انکاری ہے۔ امریکن ری پبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار بننے کے خواہشمند سینٹر کروز نے واشنگٹن میں اپنے حامیوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ایران اور عالمی طاقتوں کے درمیان جوہری معاہدے کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اگر وہ امریکن صدر منتخب ہو گئے تو صدارتی منصب سنبھالتے ہی ان کا پہلا کام اس جوہری ڈیل کی دستاویز کو پرزے پرزے کرنا ہوگا۔

مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا کہ کیا کبھی برادر اسلامی ممالک واقعی آپس میں برادرانہ تعلقات کے امکانات پر غور کر سکیں گے؟ جو مخلص ہیں وہ معاملہ فہم نہیں اور جو معاملہ فہم ہیں عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے نہیں۔ وہ عوام کے ساتھ مخلص نہیں۔ وہ لوگ جو مخلص ہیں ان کی حالت اس نادان کی سی ہے جو گھاس کاٹنے والی مشین کے ساتھ شیو کرنا چاہے۔ زندگی خالی خولی خوابوں اور خواہشوں پر بسر نہیں ہوتی اور سچ یہ ہے کہ گنڈیریوں کی ریڑھی لگانے اور پرچون کی دکان بنانے کے لئے بھی ''فیزیبلٹی'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی ہنر اور حکمت عملی درکار ہوتی ہے۔ جب کہ یہاں تو معاملہ بہت ہی گھمبیر ہے کہ ایک لرزاں و ترساں، شتر بے بہار اور بُری طرح کمچک چکے ملک کو دنیا کی اکلوتی سپر پاور کے نیچے سے نکال کر اس کے اوپر بٹھانا ہے تو پاکستانیو! یہ سب ہوگا کیسے؟ اور اس ہدف کے حصول میں کتنی صدیاں درکار ہوں گی؟ کہ بن لادن اور صدام لائحہ عمل کا انجام تو سامنے ہے۔

جس معاشرے میں شیر خوار بچوں کے لئے خالص دودھ کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو، جہاں لائف سیونگ دوائیں بھی جعلی ہوں، جہاں تکبیر پڑھ کے حلال کئے گئے جانور میں غلیظ پانی انجیکٹ کیا جاتا ہو،

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جہاں بیسن سستا اور چنے کی دال مہنگی ہو، جہاں طلباء اپنے اساتذہ اور وکلاء ججوں پر ہاتھ اٹھائیں، جہاں شرح خواندگی ڈوب مرنے کی حد تک اس حکم کے باوجود شرمناک حد تک کم ہو کہ علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے، جہاں چند پوش بستیاں اور کنٹونمنٹ کے علاقے چھوڑ کر پورے ملک میں گندگی کے ڈھیر ہوں اور وہ بھی اس حکم کے باوجود کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ جہاں فرقوں کی فراوانی اور ذات برادری کی لازوال بہار ہو۔ جہاں لیڈر سے لے کر ووٹر تک بکنے پر تیار ہو۔ جہاں ہر کوئی اپنی حدود سے تجاوز کرنے کے جنون میں مبتلا ہو۔ جہاں پٹرول سستا ہونے پر سستا نہ کیا جائے اور مہنگا ہونے کی افواہ پر ہی مہنگا کر دیا جائے۔ جہاں شب برأت سے لے کر رمضان اور عیدین تک میں ہر چیز کے نرخ اندھا دھند بڑھا دیئے جائیں۔ جھوٹی قسموں سے لے کر جھوٹی گواہیاں تک معمول بن جائیں۔ جہاں اذان کے اوقات سے لے کر عید کے چاند تک پر گروہ بندی اور دھڑے بندی ہو، عمرے رشوت لے کر کئے جائیں۔ جہاں صفیں تو سیدھی ہوں لیکن نیتیں بے حد ٹیڑھی۔ جہاں پنجگانہ نماز کی ادائیگی کرنے والے کو بھی نہ ڈسپلن کی قدر ہو نہ پابندی اوقات کی پروا۔ وہاں ایمان زبان پر تو ہو سکتا ہے ذہن پر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گفتار میں تو ہو سکتا ہے کردار میں نہیں۔ اعلان کی حد تک تو ہو سکتا ہے اعمال میں نہیں کہ ایمان ہی تو عنقا ہے اور یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔

رب ذوالجلال اور جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم وسلم کی قسم! ایمان تو دور کی بات اس کا عکس بھی اس معاشرہ پر سایہ فگن ہوتا تو یہ خاک اڑاتا ریگ زار نور سے چمکتا اور خوشبو سے مہکتا دکھائی دیتا۔ ہم سپر پاور بے شک نہ ہوتے لیکن اس طرح پارہ پارہ پرائے پیروں کی خاک بھی نہ ہوتے۔ ایمان کیا ہم تو اس کی الٹ سمت میں دیوانہ وار بھاگتے چلے گئے کہ ایمان کسی مخصوص حلئے کا نام نہیں ایک خاص حالت کا نام ہے۔

ترا دِل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبالؒ نے اپنی زندگی گھلا دی لیکن ہمارے گلنے سڑنے کا عمل بدستور جاری ہے۔ بلکہ اس میں شدت آتی چلی گئی۔ ہمارا نان سٹاپ انحطاط، زوال پسپائی اور رسوائی ہی ناقابل تردید ثبوت اور دلیل ہے کہ گزشتہ صدیوں سے ہماری حکمتِ عملی ہی درست نہیں۔ کوئی مجھے بتائے کہ قرآن حکیم کی کتنے سو آیات میں تفکر، تدبر، تسخیر کائنات اور تحصیلِ علم کا حکم ہے؟ جو کہ بار بار ہے تو پھر ان احکامات کی تعمیل کیوں نہیں اور ہم ذلیل بھی اسی لئے ہوئے۔

ہمارے حریفوں نے آسمانوں پر ہی کمندیں نہیں ڈالیں، پاتال کی عمیق ترین گہرائیاں بھی کھنگال ڈالیں۔ آج وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ موسم ہماری گرفت میں ہیں، بارش ہماری مرضی سے ہوگی، ہم جہاں کا چاہیں موسم بدل دیں، جہاں اہیں زلزلہ برپا کر دیں۔

آج جدید ترین سیٹلائٹ سسٹم کے ذریعے زمین کے کسی کونے میں چلنے والی چیونٹی پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ انہوں نے پاتال کی گہرائیوں سے وہ مادہ (Mass) اور نکال لیا اور پر اس کا وہ خفیف ترین ذرہ دریافت کر لیا ہے جو بہت کچھ ری شیپ کر دے گا اور ہم؟

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

''امریکن غلامی سے آزادی'' اچھی خواہش اور خوبصورت خواب ہے لیکن غلیل کے ساتھ آدم خور شیر کا شکار کیسے ہو سکتا ہے؟

دستگیر شہزاد

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خصوصی فیچر

پھندہ یا شکنجہ؟

2017ء تک قدرت کے پھندے یا احتساب کے شکنجہ میں کون کس طرح آئے گا؟

محترم افضال مظہر کرپشن اور لوٹ مار پر سب سے پہلی اور لاتعداد کتب لکھنے کے علاوہ مختلف اخبارات میں کالم نگاری اور تجزیہ نگاری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان کے کیے گئے اکثر تجزیے سو فیصد درست ثابت ہوتے رہے ہیں۔ تازہ کتاب ''پھندا یا شکنجہ؟'' ان کا ملک میں ہونے والی اہم ترین تبدیلیوں، کڑا احتساب اور تجزیہ کس حد تک درست ثابت ہوگا آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

☆ افضال مظہر انجم
afzaalmazhar@gmail.com

برصغیر میں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ مسلمانوں کی آمد آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ میں 17 سالہ جرنیل محمد بن قاسم کی آمد سے شروع ہوئی اور 1707ء اورنگ زیب عالمگیر، مغل بادشاہ تک مضبوط اسلامی حکومتیں وقتاً فوقتاً قائم ہوتی رہیں۔ اس دوران محمود غزنوی سے لے کر خاندانِ غلاماں کے بادشاہ لودھی خاندان بھی برصغیر میں کثیر آبادی اور کثیر اقوام والے خطوں پر اپنی اپنی حاکمیت کا جھنڈا گاڑتے رہے۔ شہاب الدین غوری اور شیر شاہ سوری کے بعد مغلیہ خاندان کی پانچ نسلوں کو قدرت نے یہاں پر حکومت کرنے کا اعزاز بخشا۔

مسلمان حکمرانوں نے آ کر یہاں کے لوگوں کو سماجی اور معاشی انصاف مہیا کیا۔ ذات پات کی تفریق سے آزاد کرایا اور ہر ایک کو اپنی قابلیت کی بناء پر ہی ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے۔ ایک طرف تو حملہ آور حکمرانوں کے روپ میں ایسے بادشاہ یا جرنیل یہاں

حکمرانی کرتے رہے جو تلوار کے دھنی تو تھے ہی، اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ دوسرے انہوں نے لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف کی ایسی ایسی مثالیں قائم کیں جو نہ صرف ان کی حکومتیں مضبوط بنانے یا قائم رکھنے کا سبب تھیں بلکہ ان کا مذہب پھیلانے میں بھی مددگار ثابت ہوئیں۔ انہی جرنیلوں کے ہمراہ مسلمان صوفیائے کرام بھی دینِ حق کی شمع روشن کرنے کے لئے یہاں پر وارد ہوئے۔ جس خطہ پر کابل سے لے کر دہلی اور کلکتہ سے لے کر کراچی تک ہمارے آباء کی حکومت تھی (اب یہ علاقے چار ممالک افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں تقسیم ہیں)۔ اب کراچی سے لے کر پشاور تک محدود رہنے والے علاقہ میں بھی حکمرانی کے یہ دعویدار حکومت کرنے میں مسلسل ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ صرف قدرت کی مہربانی سے ہی یہ ملک محفوظ و مامون ہے۔

نااہل لیڈرز

ملک بنانے سے پہلے 1947ء سے پہلے پیدا ہونے والے انگریز سے آزادی کی جدوجہد اور ملک بنانے کی جدوجہد کرنے والے لیڈروں کا ذکر آپ سنتے اور پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ 1947ء کے بعد صرف نااہل، کرپٹ، ہر کام میں ناکام، نااہل، منافق لیڈر ہی پیدا ہوئے ہیں جن میں محمد نواز شریف، بے نظیر بھٹو، آصف علی زرداری، یوسف رضا گیلانی، الطاف حسین، مولانا فضل الرحمٰن، لیاقت بلوچ اور عمران خان وغیرہ شامل ہیں۔

قوم کی کردار سازی

ماں باپ کے بعد قوم کا کردار بنانے والے تین اہم عناصر کا تعلق ان طبقات سے ہے:

1. لیڈر، سیاستدان اور مصلح
2. علمائے کرام
3. اساتذہ کرام

معاشرہ کرپٹ، منافق، فاسق و فاجر اور پٹڑی سے اترا ہوا ہوگا تو اسی معاشرے سے سیاست دان پیدا ہوگا، یہاں سے ہی مولوی کی پیدائش ہوگی، استادوں کا تعلق بھی اسی مٹی سے ہوگا، جج بھی اس معاشرے کا فرد ہوگا۔ عرصہ دراز سے معاشرہ اپنی پست ترین حالت پر پہنچ چکا ہے۔ نہ صرف معاشرہ بلکہ قوم کا کردار بنانے والے عناصر سیاست دان، علمائے کرام اور اساتذہ کرام کا اللہ ہی حافظ ہے جو آئے روز ان کی اخبارات میں شائع ہونے والی حرکات اور کرتوتوں سے ظاہر ہے اور اپنے آس پاس موجود ان مقدس چہروں کے نت نئے روپ آنے سے ان کی اصلیت سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کا میڈیا یا صحافت بھی خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا قوم کو اخلاقی پستی کی گہرائیوں کی طرف لے کر جا رہا ہے اور قوم میں رہی سہی حمیت مخرب اخلاق پروگراموں اور نیم عریاں کلچر سے ختم کر چکا ہے۔

لیڈروں، علماء اور اساتذہ نے قوم کی اخلاقی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لوٹ مار، کرپشن، ہر جائز ناجائز طریقے سے مال بنانے یا کمانے، برائی کو فروغ دینے، اپنا ضمیر فروخت کرنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔

ملک کنگال، عوام بے حال

اس ملک کو بنے 68 سال ہو چکے ہیں، چین نے ہمارے بعد آزادی حاصل کی، آج وہ سائنس، تعلیم، طب، ٹیکنالوجی، فوجی ترقی میں پوری دنیا کو للکار رہا ہے۔ چین کی مثال لیں یا یورپ، امریکہ اور جاپان کی یہاں کے لیڈروں نے ان ممالک میں ایسا نظام قائم کیا جس میں ہر شخص کو تعلیم، علاج معالجہ کی سہولت میسر ہے، ہر شخص کو انصاف مل رہا ہے۔ کسی سے کسی بھی قسم کی زیادتی کرنے والے کی باز پرس کی جاتی ہے۔ کرپشن اور لوٹ مار کرنے پر اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑتا ہے۔ ان ممالک میں ایک صدر یا وزیر اعظم آتا ہے اور چار پانچ سال گزار کر چلا جاتا ہے۔ ملک کا سارا نظام ویسے کا ویسا ہی چلتا رہتا ہے۔ حکومت میں رہ کر نہ اس کے اثاثے بڑھتے ہیں اور نہ ہی اس کی کابینہ کے وزیروں کے۔ ملک کی ترقی کے تمام منصوبے جن کا مقصد عوام کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہوتا ہے، چلتے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک کی حالت ملاحظہ کریں تو یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ جوں جوں اس ملک کی عمر بڑھتی جا رہی ہے توں توں یہاں کے لوگوں کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ بے روزگاری، بیماری اور مہنگائی عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ ملک دن بدن قرضوں تلے جکڑتا جا رہا ہے۔ 68 سال میں روزگار، تعلیم کی فراہمی، مہنگائی پر کنٹرول، انصاف کی فراہمی تو کیا ایک صاف پانی کا مسئلہ حل کرنے میں بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکے۔ غیر ملکی قرضوں سے ملک کو نجات دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے بلکہ قرضوں کا یہ بوجھ آصف زرداری کی جمہوری حکومت میں اتنا بڑھ چکا تھا کہ ہر پاکستانی یا پیدا ہونے والا نوزائیدہ 83 ہزار روپے کا مقروض ہے۔ موجودہ نواز شریف دور میں مزید اربوں ڈالر کے قرضے لے کر ملک کو مزید مقروض بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔ ملک کو لوٹ کر کھانے، ناجائز اثاثے بڑھانے، دولت بیرون ملک منتقل کرنے، مجرموں کو بچانے اور مکمل احتساب سے اجتناب کرنے میں سبھی طاقتور گروپ یا مافیا سیاست دان، جرنیل، صنعت کار، سردار، جاگیردار، جج، بیوروکریٹس ملوث ہیں۔

قومی دولت، ملکی خزانے، قومی بینک لوٹنے میں سبھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ ابھی تک پاکستان میں کوئی ایسی عدالت نہیں بیٹھی جو یہ ثابت کر سکے کہ سب سے بڑا چور اور لٹیرا کون ہے اس سے چھوٹا کون اور اس کے بعد کن لوگوں کے نام آتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوٹ مار اور کرپشن میں نہ صرف ملک کے سیاست دان ہی ملوث رہے ہیں بلکہ جرنیل حضرات، جج حضرات، صنعت کار، کاروباری افراد، صحافی حضرات، علمائے کرام، سرکاری افسران اور بینک افسران سب اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے ہیں لیکن قوم کے لئے صدقے واری جانے والے، پوری دنیا میں ملک کا نام کرپشن کی وجہ سے روشن کرنے والے، لیڈری کے دعویداروں کا حصہ اس میں سب سے زیادہ ہے۔ تبھی اس ملک میں عوام روٹی، علاج، گوشت سے محروم ہیں۔ بے روزگاری عام ہے، ملک قرضوں تلے جکڑا ہوا ہے۔ توانائی کے منصوبے مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بجلی میں کمی کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور لوگوں کی تقدیر اور ملک کے مستقبل میں بھی اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔

جمہوریت اسمبلیوں میں بیٹھنے کا نام نہیں

یورپ اور امریکہ میں جمہوری سیاسی نظام رائج ہے۔ روس اور چین میں یورپ اور امریکہ کی طرح کی جمہوریت نافذ نہیں۔ جمہوریت ایسا نظام ہے جس میں زیادہ سے زیادہ عوام کی شرکت ہوتی ہے اور عوام یا عوامی نمائندے ہی مملکت کے ہر کام میں شریک اقتدار ہوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے عوام کی فطرت کا ہی تقاضا ہے کہ وہاں یہ نظام کامیابی سے چل رہا ہے کیونکہ نہ تو عوام ہی وہاں انتخاب کے دوران کوئی غلط فیصلہ کرتے ہیں اور نہ ہی اقتدار کی مسند پر بیٹھنے والا ہی عوام کو کبھی مایوس کرتا ہے۔ انتخاب سے مراد ایک گلی محلے کے کونسلر سے لے کر ملک کے اعلیٰ ترین عہدیدار صدر کے انتخاب کے لئے عوام بھی سوچ سمجھ کر ووٹ دیتے ہیں اور اہل اور مخلص

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

افراد کو سامنے لاتے ہیں اور منتخب ہو کر آنے والا بھی ان کی امیدوں پر پورا اترتا ہے۔

پاکستان، انڈیا، بنگلہ دیش، سری لنکا جیسے جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی طرح نہیں کہ ووٹ لے کر اسمبلی میں پہنچ گئے، اپنے مفادات حاصل کئے، عوام کے کاموں کے لئے مختص فنڈز کھا گئے، قرضے ہڑپ کئے اور بعد میں خزانے خالی کر دیئے اور عوام پر ٹیکس لگا کر اور بجلی، گیس، پٹرول کے نرخ بڑھا بڑھا کر عوام کا جینا دوبھر کئے رکھا۔

پاکستانی سیاست کے نرالے انداز

اس ملک میں سیاست کے انداز دنیا کے دوسرے ممالک کی نسبت انوکھے اور نرالے ہیں۔ قوم کی خوشحالی اور عوام کی ضروریات اور روزگار کی فراہمی کے لئے بنائے گئے منصوبوں میں سیاسی پارٹیاں، قوم پرست جماعتیں، مذہبی انتہا پسند جماعتیں رکاوٹ ڈالتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف اس علاقے کے عوام ہی تعلیم، علاج معالجہ اور دیگر سہولتوں سے محروم رہتے ہیں بلکہ پورے ملک کے عوام کو اس محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے اور ملکی معیشت بھی کمزور ہوتی ہے بالآخر غیر ممالک سے قرضے لے کر یہ ضرورت پوری کی جاتی ہے۔

کسی صوبہ میں ڈیم بنانے کا شوشا چھوڑ کر، کسی صوبہ میں ملک کے دوسرے حصوں سے آئے ہوئے لوگوں کو آباد ہونے سے روکنے کے لئے قوم پرست اور سیاسی پارٹیاں سرگرم کردار ادا کرتی ہیں حالانکہ ڈیم بنانے سے بجلی 18 کروڑ عوام اور ملک کے کارخانوں کو حاصل ہوتی ہے اور پسماندہ صوبوں میں انڈسٹری لگانے سے ان صوبوں کے عوام کا ہی ہر صورت فائدہ ہوتا ہے لیکن اس ملک کے لیڈر، سردار، جاگیردار، قوم پرست بشمول مذہبی لیڈر اپنے سیاسی اور مذہبی مفادات کی خاطر ملک اور عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کا گھناؤنا کھیل عرصہ دراز سے کھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

29 سال میں آٹھ اسمبلیاں ناکام

29 سال کے عرصہ میں آٹھویں پارلیمنٹ ا[ور] چھٹی جمہوری حکومت بھی ان قومی مجرموں پر مشتمل ہے [جو] ماضی میں کرپشن اور لوٹ مار میں ملوث رہے ہیں بلکہ [ہر] مرتبہ مرکز کے علاوہ چار مرتبہ سب سے بڑے صوبے [میں] بھی ناکام و نااہل ثابت ہوئے اور اس مرتبہ بھی وہ ا[پنا] پرانا ریکارڈ برقرار رکھیں گے۔ یہ جمہوریت نہیں پاکستا[نی] جمہوریت کا اصل روپ ہے یا جمہوریت چلانے وا[لے] بااثر پاکستانیوں کا روپ۔

ملک کے معاشی مسائل اور عوامی مسائل کے ح[ل] کے لئے فہم و فراست، مخلصی اور جرأت رکھنے ولی ایک شخصیت کی ضرورت ہے جو انقلابی اقدامات اور انقلا[بی] فیصلے کر سکے جو ملک کے تمام سیاسی اور مذہبی لیڈروں میں ناپید ہے۔ ان ٹکوں میں سے کسی ایک میں بھی تیل نظر نہیں آ رہا۔

جمہوریت میں جمہور آؤٹ

یورپ، امریکہ نے ہزاروں برس کی آمریت بادشاہت کے بعد جمہوری نظام کی داغ بیل ڈالی تو ا[س] کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی:

[De]mocracy by the people of the [pe]ople for the people.

یعنی وہ نظام جو عوام کے لئے ہو، عوام کے ذر[یعے] سے ہو اور عوام کی خاطر ہو۔

1947ء سے لے کر 2014-15ء تک جمہور[یت] کے 34 سال جمہوریت کی نشوونما، عوام کے مسا[ئل حل] کرنے، ملک کو مستحکم و مضبوط بنانے کے لئے

تھوڑی مدت نہیں ہے۔ گو اس میں تسلسل تو نہیں ہوتا رہا یہ ایک الگ بحث طلب مسئلہ ہے لیکن یہ جمہوریت کو صحیح سمت گامزن کرنے، جمہوری اقدار کی ترویج و فروغ اور قانون اور آئین کی حکمرانی کے لئے کوئی تھوڑی مدت نہیں تھی۔ یہ گھوڑوں گدھوں کا دور نہیں تھا کہ جب حضرت عمرؓ یا شیر شاہ سوری جیسے حکمرانوں کے دور میں بھی ہزاروں میل طویل علاقے میں انصاف کی عملداری قائم کی جاتی تھی۔

اربوں روپے کے فنڈز بھی ہر صوبائی اور مرکزی حکومت کے پاس وافر ہوتے رہے لیکن اس دور میں ہی مسائل کو کم کرنے کی بجائے بڑھایا جاتا رہا، آئین کی دھجیاں اڑائی جاتی رہیں، عدالتوں پر حملے کئے جاتے رہے۔ اس وقت اصل مسئلہ عوام کو اسمبلی سے باہر کر کے سرداروں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور پیسے والوں خصوصاً بلیک منی کے حامل لوگوں کے اسمبلی میں آنے کا سے روکنا ہے۔

علماء، مذہبی جماعتوں کا ننگِ ملت کردار

اس ملک کے علماء اور مذہبی پارٹیوں نے ہر غلط کرپٹ، بدکردار حکمران یا حکومت کا ساتھ دے کر یا خاموشی اختیار کر کے برائی کو بڑھانے میں شرمناک کردار ادا کیا ہے۔ ایک ہی وقت میں لاکھوں لوگ مذہبی جماعتوں سے بھی وابستہ ہیں لیکن اس کے باوجود بھی برائی، بداعمالی، لوٹ مار، کرپشن، اغوا، ملاوٹ، شراب نوشی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

عدلیہ کی تباہی کس طرح ہوئی؟

9 فروری 1999ء کو لاہور ہائی کورٹ کے ججوں کے یہ ریمارکس سامنے آئے کہ وکلاء، پولیس، عدالتوں نے نظام عدل کا بیڑہ غرق کیا۔

5 مارچ 2000ء کو چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس ارشاد حسین کا بیان آیا کہ عوام عدلیہ سے کسی طور پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔

3 نومبر 1999ء کو بیرون ملک میں مقیم پاکستانی قانون دان کا بیان آیا کہ عدلیہ کے احتساب کے بغیر کسی کا احتساب ممکن نہیں۔

9 نومبر 2001ء کو جسٹس بشیر جہانگیری نے اپنے بیان میں کہا کہ عدالتی نظام تباہ ہو گیا، بہتری کی کوئی امید نہیں۔

10 ستمبر 2015ء سستا اور فوری انصاف نہیں دے سکے، ایسا نظام بدل دینا ناگزیر ہے۔ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس جواد ایس خواجہ۔

200 ارب ڈالر کے بیرون ملک اکاؤنٹس

21 دسمبر 1999ء کی اطلاعات اور مختلف اداروں کی تحقیق کے مطابق لوٹ مار، کرپشن کے 60 ارب ڈالر (آج کے 6000 ارب روپے) کے بیرون ملک اکاؤنٹس کا انکشاف کیا گیا۔ آج 14 سال بعد کیا ملک سے پرواز کر جانے والی دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؟

1990ء سے جب نواز شریف نے "اپنی اور کرپٹ ساتھیوں کی دولت باہر بھجوانے" کے لئے یہ قانون بنایا تو آپ اندازہ لگائیں کہ عرصہ 22 سال کے دوران کتنے کھربوں روپیہ اس ملک سے بیرون ملک ٹرانسفر ہو چکا ہے تبھی جب 1999ء میں نواز شریف نے اربوں روپے قرضہ ہڑپ کرنے کے عوض اپنی فیکٹریاں حکومت کو دے دیں تو یہ کھوکھلی اور ناکارہ مشینوں پر مشتمل تھیں۔

اس طرح سے ہر بڑے صنعت کار، جج، جرنیل، سیاستدان، مولوی، سردار اور جاگیردار کی دولت باہر کے ملک میں ہے تاکہ جب بھی اس کی طرف ٹیکس وصول کرنے یا واجبات وصول کرنے والے ادارے ہاتھ

www.aiourdubooks.net

بڑھائیں یا ان پر شکنجہ تنگ ہو تو وہ ٹکٹ کٹائیں اور بیرون ملک پرواز کر جائیں یا یہ کہیں کہ بھئی ہمارے اکاؤنٹ چیک کر لو۔ تبھی یہ لوگ ایسی ناجائز اور حرام کمائی اپنے ملک میں نہیں رکھتے۔ خود اس ملک کے موجودہ وزیر خزانہ اسحاق ڈار اس طبقہ کے 200 ارب ڈالر (2000 ارب روپے) بیرون ملک ہونے کا انکشاف کر چکے ہیں۔ یہ لوٹی ہوئی دولت ملک میں واپس لائی جائے تو ملک پر نہ صرف قرضوں کا بوجھ اتر سکتا ہے بلکہ عوام پر ٹیکسوں کے بوجھ میں بھی کمی ہو سکتی ہے۔

اپنے ہی منشور پر عمل نہیں کیا

1971ء سے لے کر تا حال 44 سال تک صوبوں اور مرکز میں اقتدار میں رہنے والی کسی پارٹی نے اپنے ہی منشور پر عمل نہیں کیا۔ خواہ یہ سیاسی یا مذہبی پارٹیاں جمہوری ادوار میں حکومت کی ساتھی رہی یا خود اقتدار پر بیٹھی رہی یا فوجی ڈکٹیٹروں کے زیر سایہ صوبے یا مرکز میں کلی یا جزوی طور پر اقتدار کی مسند پر بیٹھے رہے۔ ان پارٹیوں میں:

1- پیپلز پارٹی، ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم کی زیر قیادت 1971ء تا 1977ء۔

2- پیپلز پارٹی زیر قیادت بے نظیر بھٹو 1988ء تا 1990ء، دوبارہ 1993ء تا 1997ء۔

3- مسلم لیگ، زیر قیادت نواز شریف 1990ء سے 1993ء، دوبارہ 1997ء تا 1999ء، تیسری مرتبہ 2013ء، تا حال 2015ء۔

4- پیپلز پارٹی زیر قیادت یوسف رضا گیلانی، آصف علی زرداری 2008ء تا 2013ء، شامل ہے۔

صوبوں میں حکومت کرنے والی ایم کیو ایم، جماعت اسلامی، عوامی نیشنل پارٹی اور جمعیت العلمائے اسلام (فضل الرحمان) بھی اسی کشتی کے سوار ہیں۔

بے چارے عوام

ان سیاسی، قوم پرست اور فرقوں کے علاوہ قومیت کے نام پر نفرت کا بیج بونے والے سرداروں، جاگیرداروں، سیاستدانوں اور علماء کی پانچوں گھی میں ہیں کیونکہ اقتدار کی مسند پر بیٹھتے ہیں تو یہی لوگ۔ قوم میں نفاق پیدا کرنے کے لئے امریکہ، ایران، سعودی عرب اور انڈیا سے روپیہ وصول ہونے کی صورت میں جھولیاں بھرتے ہیں تو یہی عناصر۔ عوام کے ہاتھ کیا آتا ہے بھوک، ننگ، غربت ناانصافی اور موت۔

پنجاب میں دہشت گردی سے مریں تو عوام
کراچی میں ٹارگٹ کلنگ سے مریں تو عوام
بلوچستان میں موت کا شکار ہوں تو عوام
خیبر پختونخوا میں بم دھماکوں کا نشانہ بنیں تو عوام
بھوک سے مرے تو غریب
دوا نہ ملنے سے موت کا شکار ہو تو غریب
ناانصافی کا نشانہ بنے تو غریب
حالات کی چکی میں پسے تو غریب

دنیا میں بھی سزا مل گئی

یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ اگلے جہاں میں دیا جائے گا لیکن اکثریت کو ان کے کئے کی سزا دنیا میں بھی ملتی رہی ہے اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو، اگر کوئی عبرت پکڑنے والا ہو تو چند مثالیں سامنے ہیں:

☆......سابق صدر آصف زرداری 9 برس جیل کی کوٹھڑی میں رہے۔

☆......سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے چار سال جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے گزارے۔

☆......نواز شریف (تین مرتبہ وزیراعظم) 9 سال جلاوطنی پر مجبور ہوئے۔

☆......بیگم نصرت بھٹو کا ذہن ماؤف ہونے کی وجہ سے غیر ملکی بینکوں (جہاں بھٹو خاندان کی دولت تھی) کے کوڈ یاد نہیں رہے تھے۔

قدرت کی لاٹھی برسنے کا عمل شروع

7000 سے زائد افراد سیاست سے آؤٹ ہوں گے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے دس سال بیس سال پچاس سال نہیں ملک بنے 68 سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے لیکن لوٹ مار، کرپشن، بے ایمانی، دھوکہ دہی، قتل و غارت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جب ملک کی اعلیٰ ترین مسند پر بیٹھی شخصیات ہی لوٹ مار کرنے، کرپشن سے ناجائز اثاثے بڑھانے اور ہر جائز ناجائز طریقے سے ملکی خزانے خالی کر کے اپنے گھر کی تجوریاں بھرنے میں جت جائیں تو کون کس کو غلط کام سے روکے گا؟ کون غلط کام کرنے میں رکاوٹ بن سکے گا؟ اس ملک کی وزارت عظمیٰ، صدر کے اہم ترین عہدوں پر بیٹھنے والی شخصیات، جاگیردار، سردار، صنعت کار، تاجر، فضائیہ، آرمی اور بحریہ کے جرنیل اور افسر، سرکاری محکموں کے سیکرٹری، ڈی سی ایس پی، کسٹم، انکم ٹیکس، پولیس، انہار، پی ڈبلیو ڈی، قانون، ریلوے، ڈویلپمنٹ اتھارٹی، تعلیم، صحت سمیت ہر محکمہ کے افسر و ملازم لوٹ مار، کرپشن اور رشوت خوری میں ملوث ہیں۔ عدالتوں کے سابقہ کئی جج خواہ ان کا تعلق سپریم کورٹ، ہائی کورٹ یا لوئر عدالتوں سے ہو قومی خزانے سے پلاٹ لے کر حکومت کے حق میں سیاسی فیصلے کرنے میں ملوث ہوں یا مجرم پر نرم ہاتھ رکھنے پر مجبور ہوں اس ملک کے ڈاکٹر لوگوں کے گردے نکال کر لاکھوں روپے کما رہے ہوں۔ ایسے کام آج کے دور کے درندے یا جانور بھی نہیں کر رہے جو اس ملک کے مسلمان اور چہرے پر داڑھی سجانے والے کرتے نظر آ رہے ہیں۔ قوم کے روحانی باپ اساتذہ کرام کی بلند مسند پر بیٹھی شخصیات بھی اپنے شاگرد طلباء و طالبات کو ظلم اور زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہوں تو ہم پر زلزلے، سیلاب اور دیگر آفتوں کی شکل میں تو عذاب آئیں گے ہی لٹیرے حکمرانوں کی حاکمیت کے روپ میں بھی مسلسل عذاب جاری رہے گا۔ اس ملک میں پیدا ہونے والی اشیاء کی کمیابی کی صورت میں یہ عذاب ہم جھیل رہے ہیں۔ آئے روز ہر شے کے نرخ بڑھا کر عام آدمی کو روٹی سے دور کرنے کی صورت میں یہ عذاب 10 کروڑ غریب لوگ برداشت کر رہے ہیں۔

ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا

اب ملک میں کرپشن، لوٹ مار، ناجائز اثاثے بنانے، منی لانڈرنگ میں ملوث، ٹیکس چوروں، کسٹم ڈیوٹی ادا نہ کرنے میں ملوث منشیات یا ناجائز کاروبار سے کمائی کرنے والوں کو عدالتی یا احتسابی کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا خواہ اس کا تعلق سیاست دان، جاگیردار، صنعت کار، سرکاری و فوجی افسر، تاجر، صحافی، عدلیہ کے طبقہ سے ہو اور وہ جتنا بااثر شخص ہی کیوں نہ ہو اور یہ لاٹھی کس طرح سے چلتی ہے جلد ہی سب کچھ سامنے آ جائے گا۔

انقلاب کب آئے گا؟

اس ملک میں عرصہ 68 سال سے درجنوں آئے ہوئے حکمران سیاسی، جماعتیں، فوجی حکمران، بیورو کریٹ حکومتیں کبھی جمہوریت کے نام پر ملک کو لوٹنے کے ڈرامے کرتے آ رہے ہیں، کبھی فوجی بوٹوں والے ملک کو بچانے کی خاطر لٹیروں کو بچانے کے ڈرامے کرتے نظر آ رہے ہیں۔ کبھی سوشلزم کے نام پر عوام کو بیوقوف بنایا جاتا رہا ہے کبھی عوامی حکومت کے نام پر عوام کا ہی کچومر نکالا جاتا رہا ہے۔ کبھی شریعت کے نام پر انسانیت کو ہی بوٹوں تلے روندا جاتا ہے۔ کبھی انصاف

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کے ترازو میں صرف اور صرف طاقتوروں، زور آوروں اور مالداروں کا پلڑا بھاری رکھا جاتا ہے۔ ہر مصیبت، ہر مسئلہ ہر پریشانی، ہر آفت عوام کو ہی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مسلسل 68 سال سے یہی کھیل اس ملک کے کروڑوں عوام سے کھیلا جا رہا ہے۔

دوسری طرف معاشرہ کی حالت ملاحظہ کریں تو ایک شخص ایک گاڑی سے دوسری گاڑی، دوسری سے تیسری اور چوتھی خرید رہا ہے۔ اس کے خاندان کے ہر فرد کے پاس 30-30 لاکھ کی کرولا گاڑی ہے۔ یہی افراد ایک پلاٹ سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا اور تیسرے سے چوتھا خرید رہے ہیں اور ہر پلاٹ کا نرخ ایک کروڑ سے 3 کروڑ روپے تک ہوتا ہے۔ پلازوں اور پراپرٹی کے انبار لگانے میں مصروف ہیں۔ رات کو آپ لاہور، اسلام آباد، کراچی، فیصل آباد، ملتان، پشاور جیسے شہروں کے ہوٹلوں میں کھانے پینے یا وقت گزارنے والوں کا رش دیکھیں جہاں سڑک پر بکنے والا 40 روپے والا برگر 1000 روپے میں فروخت ہو رہا ہے اور روزانہ لاکھوں کی تعداد میں اربوں روپے لوگ صرف ان ہوٹلوں میں ایک وقت کے کھانے پر صرف کر رہے ہیں۔

بڑے لوگوں کے تعلیمی اخراجات دیکھیں تو چھ ماہ پر مشتمل ہر سمسٹر کی فیس 90,000 روپے یا ایک لاکھ 80 ہزار روپے ہے۔ باقی پرائیویٹ اکیڈمیوں کی فیسیں اور میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ کالجوں کی پندرہ پندرہ لاکھ فیسیں اس کے علاوہ ہیں۔ دوسری طرف کروڑوں کی تعداد میں ایسے بچے ہیں جن کے پاس سکول جانے کے لئے پاؤں میں جوتے اور صاف ستھرے کپڑے یا یونیفارم نہیں ہے۔

علاج معالجہ کی حالت دیکھیں تو پرائیویٹ ہسپتالوں میں 6,000 روپے روزانہ کرایہ کے کمرے موجود ہیں یعنی سٹار ہوٹلوں کے برابر کرایہ امیر مریض ادا کر رہے ہیں اور ان کی دیکھ بھال یا علاج معالجہ کے لئے ڈاکٹروں کے لاکھوں روپے کے اخراجات علاوہ ہیں۔

اگر 10 کروڑ کی تعداد والا یہ بھوکا ننگا غریب اٹھ کھڑا ہوا تو تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو بہا کر لے جائے گا کیونکہ اس کی قیادت کسی کے پاس نہیں ہو گی لیکن اگر یہ طبقہ اپنے حقوق کی خاطر نہ اٹھ سکا تو ملک پہلے سے بھی بدترین طاقتور مافیا کے شکنجے میں ہمیشہ کے لئے جکڑا جائے گا جو انگریز سے بھی بدترین غلامی کا دور ہو گا۔

پھندے اور شکنجے کے 10 سال

2007ء میں بے نظیر بھٹو کے سیاست سے آؤٹ ہونے یعنی قدرت کے پھندے میں آنے کے بعد کون کس طرح سے قدرت کے پھندے یا احتساب کے شکنجے میں آئے گا اور بڑے سیاستدانوں، پارٹیوں، سربراہوں اور پارٹیوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ ساری تفصیل مصنف کی کتاب "پھندا یا شکنجہ" میں آپ پڑھ سکیں گے۔

☆......کیا نواز شریف سیاست سے آؤٹ ہو جائیں گے؟

☆......کیا عمران خان کے ہاتھ اقتدار آ سکے گا؟

☆......آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی، جنرل پرویز مشرف، اسحاق ڈار، خواجہ آصف، سید قائم علی شاہ، فاروق ستار، پرویز الٰہی، چوہدری شجاعت حسین، راجہ پرویز اشرف، جہانگیر ترین کو شکنجے میں آنے کے بعد ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا؟

☆......الطاف حسین کا مستقبل کیا ہو گا؟

☆......مولانا فضل الرحمان، ہمایوں اختر، محمد منشاء، ملک ریاض، جنرل اسلم بیگ احتساب کے شکنجے سے بچ سکیں گے؟

جرم وسزا

ڈرامہ جو میں نے کھیلا

عورت نے اے ایس آئی پر چاقو کے تین وار کیے۔ اے ایس آئی فرش پر گر پڑا۔ میں نے اس کو پیچھے سے پکڑ لیا اور چاقو چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

☆ عبدالخالق

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آپ کے رسالے میں احمد یار خان صاحب اور محبوب عالم صاحب کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھا کرتا ہوں۔ میں نے پولیس میں بہت لمبی نوکری کی ہے اور میں اسی زمانے میں پولیس میں نوکر ہوا تھا جس زمانے میں یہ دونوں انسپکٹر صاحبان پولیس سروس میں تھے۔ میں آپ کو سچ بتاتا ہوں کہ وہ جو کہانیاں آپ کو سناتے ہیں وہ بالکل سچی ہوتی ہیں۔ مجھ کو معلوم ہے کہ آج کل کے زمانے میں اس اچھے زمانے کی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ بہت دفعہ میرا دل کیا ہے کہ اسی طرح کی تفتیش کی سچی کہانیاں آپ کو سناؤں لیکن میں دل کو سمجھاتا ہوں کہ دوسروں کا پردہ فاش کرنے سے کیا فائدہ؟ پھر یہ بھی سوچ آتی ہے کہ آج کل ان کہانیوں کو کون سچا مانے گا۔ مثال کے طور پر غیرت ایک ایسی چیز ہے جس پر ہمارے زمانے میں لوگ مرتے تھے اور مار بھی دیتے تھے۔ آج کل غیرت کی بجائے دولت دماغوں پر سوار ہو گئی ہے۔ بے غیرتی آج کل کا فیشن بن گئی ہے۔

میں آپ کو ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔ یہ قتل کی واردات تھی۔ میں ایک بات آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ میں یہ کہانی اس طرح نہیں سناؤں گا جس طرح آپ کے دونوں انسپکٹر صاحبان سناتے ہیں۔ اس کو آپ تفتیش کی نہیں، غیرت کی کہانی سمجھ لیں۔ میرے دماغ میں عقل بہت تھوڑی ہے اسی لئے میں ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے سے اوپر ترقی نہیں لے سکا اور اسی عہدے پر پنشن پر آ گیا تھا۔ میں اپنی تھوڑی عقل سے ایک بات کہتا ہوں۔ اگر آپ کو بُرا لگے تو مجھ کو معاف کر دینا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ہماری قوم میں ہمارے زمانے والی غیرت ہوتی تو ہمارا پاکستان آدھا نہ ہوتا۔

ان باتوں کو چھوڑیں، آپ ناراض ہو کر کہیں گے کہ یہ دیہاتی جانگلی کیسی فضول باتیں کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں اس وقت اس علاقے کے ایک تھانے میں ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتا تھا جس علاقے میں میو ذات کے مسلمان رہتے تھے۔ مسلمانوں میں جو غیرت مندی میں سارے ہندوستان میں مشہور تھے۔ میں آپ کو اس وقت کی بات سنا رہا ہوں جب اس ملک میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ میو قوم اکٹھی ایک ہی علاقے میں رہتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد یہ لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور سارے ملک میں بکھر گئے لیکن ان کی غیرت مندی کی کہانیاں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

ہمارے تھانے کا سب انسپکٹر مسلمان تھا اور اے ایس آئی ہندو تھا۔ پولیس میں بدمعاشی تو ہر کوئی کرتا لیکن یہ ہندو اے ایس آئی بہت ہی بدمعاش بددیانت آدمی تھا۔ میو قوم کے ایک گاؤں میں ایک جوان آدمی قتل ہو گیا۔ اس کی لاش گاؤں سے ایک میل دور پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو اس طرح مارا گیا تھا کہ اس کے گلے میں رسّی ڈالی گئی اور اس سے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ سب انسپکٹر نے اس واردات کی تفتیش اے ایس آئی کے سپرد کر دی۔ اے ایس آئی نے مجھ کو اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچا۔

زمین کچی تھی۔ اگر رات کو آندھی نہ چلتی تو کھرا مل جاتے۔ آندھی نے کھروں پر مٹی ڈال دی تھی۔ اس زمانے میں انگریز کا حکم تھا کہ تفتیشی افسر واردات والے گاؤں میں بیٹھ جائے اور تفتیش پوری کر کے وہاں سے نکلے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجا گیا اور جو کاغذی کارروائیاں ہوتی ہیں، وہ بھی کی گئیں۔ میں آپ کو کوئی اور بات سناؤں گا۔ اے ایس آئی نے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مقتول کی اپنی یا اس کے خاندان کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ ہم کو یہ بات بڑی عجیب لگی کہ نہ مقتول کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی نہ اس کے خاندان کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا تھا۔ یہ ضرور معلوم ہوا کہ مقتول کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا غلط تعلق کس عورت کے ساتھ تھا۔ ایک شک یہ تھا کہ اس نے کسی کی ماں بہن کو چھیڑا ہو گا یا کسی کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو گا اور اس گھر کے آدمیوں نے اس کو قتل کر دیا۔ مخبروں نے بہت زور لگایا لیکن کوئی اشارہ نہ ملا جو ہم کو بتاتا کہ قاتل کون ہے۔

چار پانچ آدمیوں کو مشتبہ بٹھایا گیا۔ ایس آئی نے اور میں نے ان کو مار مار کر ان کی ہڈیاں نرم کر دیں لیکن کوئی بھی اقبالی نہ ہوا۔ ایک جانگلی سکھ کو پکڑا جس کا پیشہ ڈکیتی اور قتل تھا۔ آپ کو یہ بات حیران کر دے گی کہ اس سکھ نے صرف ایک بار چار سال کی قید ڈکیتی کے الزام میں کاٹی تھی۔ اس کے نام پر چار قتل تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ قاتل مکھا یعنی یہی جانگلی سکھ ہے۔ اس کا پورا نام گورکھ سنگھ تھا اور اس کا عرف مکھا لکھتے تھے۔ قتل کی چاروں وارداتوں میں مکھا پکڑا گیا۔ دو میں تو تھانے سے ہی چھوٹ گیا کیونکہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں ملتی تھی۔ قتل کی دو وارداتوں میں پکڑا گیا تو دونوں دفعہ اس کا چالان عدالت میں گیا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا۔ مکھا بہت ہوشیار آدمی تھا۔

ہم کو کسی نے بتایا تھا کہ جس رات کو مقتول مارا گیا اس شام مکھا کو گاؤں کے قریب دیکھا گیا تھا۔ مکھے کو پکڑنا ہمارے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن وہ گاؤں کے قریب موجود پایا گیا اور ہم کو اطلاع ہو گئی۔ میں دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر گیا اور مکھا کو اس وجہ سے آسانی سے پکڑ لیا کہ وہ سویا ہوا تھا۔ اے ایس آئی تنگ آ گیا تھا کہ کوئی مرغا ابھی پھنسا نہیں۔ اس نے مجھ کو کہا کہ اس جانگلی کا وہ حال کر دو کہ دو دن ہوش میں نہ آئے اور جب ہوش میں آئے تو اقبالی ہو جائے۔

ہم نے جس مکان میں ڈیرہ ڈالا ہوا تھا وہ نمبردار نے اپنے مہمانوں اور ان کے گھوڑے مویشیوں کے لئے بنایا ہوا تھا۔ پولیس کی موجودگی میں اس مکان میں وہی شخص آ سکتا تھا جس کو ہم طلب کرتے تھے۔ مکھا کی حالت دہائی کو وہاں کوئی نہیں سن سکتا تھا لیکن مکھا لوہے کا بنا ہوا سکھ تھا۔ اس نے پہلے بھی تھانوں میں بہت مار کھائی تھی۔ اس کو مار کھانے کا بہت تجربہ تھا۔ وہ مار کھاتا رہا۔ نہ وہ بے ہوش ہوا نہ اقبالی ہوا۔ اے ایس آئی نے کہا کہ اس کو اندر کوٹھڑی میں بند کر دو اور اس کو بھوک دو۔ گاؤں کے مکانوں کی کوٹھڑیاں قید خانے کی کوٹھڑیوں سے زیادہ بڑی ہوتی تھیں۔ ان کی نہ کوئی کھڑکی ہوتی تھی، نہ روشن دان، بس ایک دروازہ ہی دروازہ ہوتا تھا۔ میں نے اس کو کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

ہم کو وہاں سات آٹھ دن گزر گئے۔ ذرا سا بھی کھوج نہ ملا۔ ایک رات اس طرح ہوا جس طرح آدمی کو خواب نظر آتا ہے۔ گاؤں کا ایک جوان آدمی جس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی، ہمارے پاس آیا۔ گاؤں کے لوگ سو گئے تھے۔ یہ آدمی کوئی چھوٹا موٹا کسان نہیں تھا۔ وہ بہت ساری زمین کا مالک تھا نمبرداری اس کے خاندان میں تھی اور اس گاؤں میں اسی کی برادری کا زور تھا۔ یہ روپے پیسے والا خاندان تھا۔ اس نے دو گھوڑا بوسکی کی چادر باندھی ہوئی تھی اور بوسکی کا ہی کرتہ تھا۔ بوسکی امیر لوگوں کا لباس ہوتا تھا۔

"چھوٹے تھانیدار صاحب!" اس نے اندر آتے ہی کہا۔ "اس آدمی کو میں نے قتل کیا ہے"۔

"کیوں قتل کیا ہے اس کو؟" اے ایس آئی نے پوچھا۔

"اس لئے قتل کیا ہے کہ اس نے میری بیوی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا"۔ اس شخص نے کہا۔ اس کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ میں اس کو صدیق لکھوں گا۔

"تم مجھ کو یہ تو نہیں بتاؤ گے کہ تمہاری بیوی کا اپنا چال چلن کیسا تھا"۔ اے ایس آئی نے کہا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"یہ میں نہیں بتاؤں گا"۔ صدیق نے کہا۔ "آپ اس طرح کریں کہ گاؤں کے سارے گھروں میں جائیں اور پوچھیں کہ اس عورت کا چال چلن کیسا ہے...... بات یہ ہے تھانیدار صاحب! میری بیوی بہت خوبصورت عورت ہے۔ اس میں ایک عادت یہ ہے کہ ہنسنا ہنسانا اس کو بہت پسند ہے۔ ہر کسی کے ساتھ شرارت اور چھیڑ خانی کرتی ہے۔ مسکراہٹ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر رہتی ہے۔ میں نے خود اس کو بہت دفعہ بولا ہے کہ تم ایسا نہ کیا کرو۔ بعض آدمی شک میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ عورت ہم کو چاہتی ہے۔ یہ آدمی جو میرے ہاتھ سے قتل ہو گیا ہے، اسی شک میں پڑ گیا تھا۔ میری بیوی نے ایک روز مجھ کو بتایا کہ وہ مزار پر دیا جلانے گئی تھی۔ واپس آئی تو اس شخص نے اس کو روک لیا اور کہنے لگا کہ میں تمہارے لئے ادھر کھڑا ہوں۔ تم مجھ کو دیکھ کر دور دور سے ہنستی رہتی ہو۔ میری بیوی نے اس کو سمجھایا کہ میں ہر کسی کو دیکھ کر ہنستی ہوں۔ یہ بات کہہ کر بھی میری بیوی ہنس پڑی۔ یہ شخص اپنے آپ کو بہت خوبصورت اور لٹھا جوان سمجھتا تھا۔ اس نے میری بیوی کا بازو پکڑ لیا اور بولا کہ مذاق نہ کرو، آؤ میرے دل کو ٹھنڈا کر دو......

"میری بیوی نے اپنا بازو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور اس کو پھر سمجھایا کہ وہ اپنی موت کو آوازیں نہ دے لیکن اس شخص نے میری بیوی کو جپھی ڈال لی۔ میری بیوی کو خدا نے میرے جیسے آدمی کی طاقت دی ہے۔ اس نے اس شخص کو دھکا دیا اور گاؤں کی طرف آ گئی۔ اس نے مجھ کو یہ سارا واقعہ سنایا تو میرے دماغ کو گرمی چڑھ گئی۔ میں نے بیوی کو کہا کہ اس شخص کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیوی بولی کہ اس کو جوتے مارنے ہیں تو وہ میں بھی مار سکتی ہوں۔ اس نے کہا کہ دفع کرو، پھر بھی اس نے ایسی حرکت کی تو تم دیکھنا کہ میں گاؤں میں اس کو کس طرح جوتے مارتی ہوں......

"بیوی کی اس بات سے میرا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ دو روز بعد کی بات ہے کہ میں گاؤں کے باہر تین چار آدمیوں کے ساتھ بیٹھا گپیں مارتا رہا۔ رات ہو گئی تھی۔ وہاں سے میں اٹھ کر اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا تو یہ شخص مجھ کو راستے میں مل گیا۔ وہ گاؤں سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس کے بارے میں میری بیوی مجھ کو بات بتا چکی ہے۔ اس نے میرے ساتھ سلام دعا لی۔ میں نے پوچھا کہ کدھر جا رہے ہو۔ اس نے بتایا کہ اینٹوں کے بھٹے پر جا رہا ہوں۔ اس کو اگلے دن اینٹوں کی ضرورت تھی۔ یہ کہہ کر وہ آگے چلا گیا۔ اس کی موت آئی ہوئی تھی۔ اس کا بندوبست اس طرح ہو گیا کہ مجھ کو بیوی کی بات یاد آ گئی۔ میرے دل نے کہا کہ اس شخص نے تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ میں اپنی بیوی کے زور دینے پر دل سے ارادہ نکال چکا تھا کہ اس شخص سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا ہے......

"میرے دل میں انتقام کی آگ لگ گئی۔ ایک منٹ میں میرے دماغ میں ترکیب آ گئی کہ اس کو کس طرح ماروں گا۔ میں اپنے گھر گیا لیکن اندر نہ گیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ ڈیوڑھی میں رسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ مار کر ایک رسی اٹھائی اور پھر باہر نکل گیا۔ میں بھٹے کی طرف بہت تیز چلا گیا۔ وہ مجھ کو راستے میں جاتا ہوا مل گیا۔ اس نے میرے قدموں کی آواز پر پیچھے دیکھا۔ اس نے مجھ کو دیکھ لیا اس لئے میں چلتا ہی گیا کہ اس کو شک نہ ہو۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے پوچھا کہ تم کدھر جا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ میں بھی بھٹے پر جا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ یہ اچھا ہے، اکٹھے چلتے ہیں۔ ہم چل پڑے۔ میں چلتے چلتے ذرا پیچھے ہو گیا اور رسی اس کے گلے میں ڈال کر ایسا پھندا بنایا کہ وہ اپنے آپ کو چھڑا نہ سکا۔ وہ تڑپنے لگا اور پھر گر پڑا۔ میں نے پھندہ اور تنگ کر دیا۔ پھر وہ مر گیا"۔

"تم نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ تم اس شخص کو قتل کرنے جا رہے ہو؟" اے ایس آئی نے صدیق سے پوچھا۔

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "میں جب رسی لینے گیا تو بیوی اندر کمرے میں تھی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ میرے واسطے کھلا ہوا تھا۔ میں نے ڈیوڑھی سے رسی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ اگر میں اپنی بیوی کو بتاتا تو وہ مجھے گھر سے نہ نکلنے دیتی۔ میں جب اس شخص کو جان سے مار کر گھر آیا تو بھی میں نے اپنی بیوی کو نہ بتایا کہ میں کیا کر آیا ہوں۔ میں نے دو دن یہ بات اپنے سینے میں چھپا کر رکھی۔ جس دن لاش ملی اور آپ موقع پر پہنچے اس روز میری بیوی نے ہنس کر مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ تمہارا کام ہی تو نہیں۔ میں نے اس کو بتایا کہ نہیں، تم نے مجھ کو منع کر دیا تھا ورنہ یہ شخص میرے ہی ہاتھوں مرتا......

"چھوٹے تھانیدار صاحب! تیسری رات کا ذکر ہے کہ میری آنکھ کھل گئی اور مجھ کو صاف پتہ چلا کہ کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہلایا تھا۔ میں نے بیوی کو دیکھا۔ وہ سوئی ہوئی تھی۔ مجھ کو صاف پتہ لگا کہ مقتول نے مجھ کو جگایا ہے۔ میرے دل پر ڈر بیٹھ گیا۔ دوسرے روز میں کھیتوں کی طرف گیا تو مجھ کو اس طرح سنائی دیا کہ مقتول نے مجھ کو آواز دی ہے۔ میں نے رک کر ہر طرف دیکھا اور میں جو اتنے مضبوط دل گردے والا آدمی ہوں، ڈر سے کانپنے لگا۔ پھر رات کو مقتول مجھ کو خوابوں میں نظر آنے لگا۔ میں نے دن کے وقت تین دفعہ اس کی آواز سنی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خون دماغ کو چڑھ گیا، وہ خون میرے دماغ کو چڑھ گیا"۔

اس شخص نے اپنی جو حالت بتائی، اس حالت کو ہم لوگ جو پولیس کی سروس میں رہ چکے ہیں، اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انسان کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ خون دماغ کو چڑھ جاتا ہے۔ بعض ملزم پاگلوں جیسی حرکتیں اور باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جب تک وہ اقبال جرم نہ کریں، ان کو چین نہیں آتا۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ قاتل کو اقبالی کرانا مشکل کام نہیں ہوتا۔ ہمارے اس ملزم نے اپنی پوری حالت بیان کی۔ اس کو نیند آنی بند ہو گئی تھی۔ وہ باہر جاتا تھا تو اس کو ڈر لگتا تھا۔

آگے جو اس نے بیان دیا وہ یہ تھا کہ اس نے مجبور ہو کر اپنی بیوی کو بتایا کہ اس شخص کو اس نے قتل کیا ہے۔ بیوی نے اس کو کہا کہ پولیس اتنے سارے دنوں سے اتری ہوئی ہے اور اس کو قاتل کا کھوج نہیں مل رہا، تم جو کچھ کر بیٹھے ہو وہ ہو گیا ہے، اب چپ رہو۔

صدیق نے اس کو بولا کہ وہ رات کو سوتا نہیں اور ڈرتا رہتا ہے۔ اس نے بیوی کو بتایا کہ دن کے وقت بھی اس کے دل پر خوف رہتا ہے۔ بیوی نے اس کا حوصلہ مضبوط کیا لیکن اس شخص کے دل سے خوف نہ نکلا۔

"میں پولیس کے پاس جا کر اقبالی ہو جاؤں گا"۔ صدیق نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تمہارا بیڑہ تر جائے"۔ اس کی بیوی نے گھبرا کر کہا۔ "میں بد بخت بیوہ ہو جاؤں گی۔ تم کو تو سیدھی پھانسی ہو گی"۔

"اگر میں اقبالی نہ ہوا تو میں پاگل ہو جاؤں گا"۔ صدیق نے کہا۔ "اس سے بہتر یہی ہے کہ میں چھوٹے تھانیدار کے پاس جا کر اقبالی ہو جاؤں"۔

بیویاں اپنے خاوندوں کو تو چاہتی ہی ہیں لیکن ہم کو پتہ چلا کہ صدیق اور اس کی بیوی کا تعلق صرف میاں بیوی کی طرح نہیں تھا بلکہ لوگ کہتے تھے کہ اس جوڑے کا حال تو عاشق معشوق والا ہے۔ بیوی نے اس کو اقبالی ہونے سے روک لیا لیکن اس شخص کی حالت بہت بری ہو گئی۔ اس نے دو دن اور برداشت کیا اور آب اس کو مقتول پتہ نہیں کس طرح نظر آیا یا کیا ہوا کہ وہ اپنی بیوی کو یہ بتا کر گھر سے بھاگ آیا کہ میں چھوٹے تھانیدار کے پاس جا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رہا ہوں۔ جب اس نے یہ کہا کہ وہ اپنی بیوی کو بتا کر بھاگ آیا ہے تو اس وقت مجھ کو خیال آیا کہ باہر کوئی اونچی آواز میں باتیں کر رہا ہے۔ میں نے صدیق سے پوچھا کہ اس کی بیوی اس کے پیچھے آئی ہو گی۔ صدیق نے کہا کہ وہ ضرور آئی ہو گی۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر ہمارے کانسٹیبلوں کی آوازیں اور اونچی ہو گئیں اور ایک عورت کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ میں باہر نکل گیا۔

باہر ایک عورت کو دیکھا جو اندر آنا چاہتی تھی اور کانسٹیبل اس کو روکتے تھے۔ اس عورت نے مجھ سے پوچھا کہ اس کا خاوند ادھر آیا تھا، وہ کہاں ہے۔ میں نے اس کو بتایا کہ اس کے خاوند کا نام اگر صدیق ہے تو وہ چھوٹے تھانیدار کو اقبالی بیان دے رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ شہباز کو میں نے قتل کیا ہے۔

بیوی نے بہت تیز تیز بولنا شروع کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ میرے خاوند کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے، وہ تھوڑے دنوں سے بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔ میں نے اس عورت کو سمجھا بجھا کر باہر بٹھا دیا اور کہا کہ وہ صبر کر کے بیٹھی رہے۔ اگر اس نے اندر جانے کی کوشش کی تو چھوٹا تھانیدار ناراض ہو جائے گا۔

میں اندر گیا تو اے ایس آئی نے مجھ کو کہا کہ صدیق کو دوسرے کمرے میں بٹھا دو۔ میں نے اس کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیا۔ ایسا ڈر نہیں تھا کہ وہ بھاگ جائے گا۔ میں اے ایس آئی کے پاس آیا تو اس نے مجھ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ایک بات پر غور کر خالق بھائی!" اے ایس آئی نے مجھ کو کہا۔ "ساری تفتیش تمہارے سامنے ہے۔ میں اس کو عدم پتہ لکھ سکتا ہوں۔ اگر ہم نے خالق کو گرفتار کر کے مقدمہ بنایا تو مقدمہ ثابت کرنا بہت مشکل ہو گا۔ تم غور کرو۔ ہم کیا شہادت عدالت کو دیں گے؟ اس کا اقبالی بیان اس کو مجرم ثابت نہیں کر سکتا"۔

"آپ صاف کہیں کہ آپ اس کو مجرم ثابت نہیں کرنا چاہتے"۔ میں نے اس کو بولا۔ "شہادت جیسی چاہیے ویسی مل جائے گی"۔

"میری بات سمجھ خالقے!" اے ایس آئی نے کہا۔ "یہ موٹی اسامی ہے۔ اس کو ڈرائیں گے کہ پھانسی چڑھ جاؤ گے...... جاؤ تم اس کے ساتھ بات کرو۔ اسے کہو کہ مال نکالو اور اپنی جان بچاؤ"۔

میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ یہ اے ایس آئی بڑا بدمعاش اور بے ایمان آدمی تھا۔ اس کا سسر ضلع میں ڈی ایس پی تھا۔ اس طرح اس اے ایس آئی کی پیٹھ بڑی مضبوط تھی۔ ڈی ایس پی کا داماد ہونے کی وجہ سے وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ قتل جیسی واردات کو عدم پتہ لکھ دینا آسان کام نہیں ہوتا تھا لیکن یہ شخص یہ کام کر سکتا تھا۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ یہ ملزم تو خود ہی سزائے موت لینے آیا ہے۔ یہ ہم کو مال کیوں دے گا۔ اے ایس آئی نے کہا کہ اس کو سمجھاؤ، مال مل سکتا ہے۔

میں صدیق کے پاس چلا گیا۔ اس کو کہا کہ ہم تم کو بچا سکتے ہیں لیکن کچھ روپیہ لگے گا۔ صدیق بولا کہ تم لوگ میرا بیان نہیں لکھو گے تو میں بڑے تھانیدار کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں جب صدیق کے ساتھ بات کر کے واپس اے ایس آئی کے پاس آیا تو دیکھا کہ صدیق کی بیوی وہاں موجود تھی۔ اے ایس آئی نے خود ہی اس کو اندر بلا لیا تھا۔ پہلے میں نے اس عورت کو باہر اندھیرے میں دیکھا تھا۔ اب اندر لالٹین کی روشنی میں دیکھا تو میں اس کا حسن دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اے ایس آئی نے اس سے پوچھا کہ صدیق کیا کہتا ہے۔ میں نے اس کو بتایا کہ وہ نہیں مانتا۔ صدیق کی بیوی اے ایس آئی کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ اس کے خاوند کو گرفتار نہ کرے۔

میں جب صدیق کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اتنی دیر میں اے ایس آئی صدیق کی بیوی کے ساتھ کچھ باتیں کر چکا تھا۔

"دیکھ بی بی!" میں نے صدیق کی بیوی کو کہا۔ "تم کہتی ہو کہ صدیق کو گرفتار نہ کریں لیکن صدیق کہتا ہے کہ مجھ کو گرفتار کرو اور صبح مجھ کو عدالت میں لے جاؤ"۔

"اس کو تو سیدھی سزائے موت ہو گی"۔ اے ایس آئی نے کہا۔

اس خوبصورت اور جوان عورت نے رونا شروع کر دیا اور اس نے پہلے اے ایس آئی کے سامنے اور پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑے اور پھر ہچکیاں لے لے کر کہا کہ ہم کوئی طریقہ کریں اور اس کے خاوند کو چھوڑ دیں۔

اے ایس آئی نے کہا کہ وہ صدیق کو چھوڑتا ہے تو اس کی نوکری جاتی ہے۔ پھر اس نے صدیق کی بیوی کو بہت ڈرایا۔ میں یہ سارے ڈرامے جانتا تھا۔ میں کوئی شریف آدمی تو نہیں تھا۔ پولیس میں رہ کر بہت بدمعاشیاں کی ہیں اور بہت مال کھایا ہے۔ میں نے یہ ڈرامہ کیا کہ اے ایس آئی کو کہا کہ جناب، اس عورت کی جوانی پر رحم کریں اور اس کی مدد کریں۔

"بی بی!" اس نے صدیق کی بیوی سے کہا۔ "کچھ مال نکالو اور میں کچھ کرتا ہوں"۔

"میں کہتی ہوں میرا سارا زیور لے لو"۔ صدیق کی بیوی نے کہا۔ "میرے گھر میں کچھ پیسہ ہے، میں وہ لا دیتی ہوں۔ میرے خاوند کو میرے ساتھ بھیج دو"۔

"زیور نہیں"۔ اے ایس آئی نے کہا۔ "مجھ کو روپیہ چاہیے...... اور...... مجھ کو تمہاری ضرورت ہے"۔

"مجھ کو کیا کرو گے؟"

"رات ادھر ہی ٹھہر جاؤ"۔ اے ایس آئی نے کہا۔ "صبح سویرے اپنے خاوند کو ساتھ لے جانا"۔

میں نے اس عورت کے منہ کی طرف دیکھا۔ اللہ کی قسم، اس کا چہرہ اتنا سرخ ہو گیا جیسے خون پھوٹ کر کھال سے باہر آ جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شرم والی سرخی ہے لیکن ایک دو باتوں سے پتہ چلا کہ اس عورت کے اندر آگ لگ گئی ہے۔

"بولو"۔ اے ایس آئی نے کہا۔ "منظور ہے؟"

"روپیہ اور زیور دے دوں گی"۔ صدیق کی بیوی نے کہا۔ "اپنی عزت نہیں دے سکتی"۔

"اتنی نیک نہ بنو"۔ اے ایس آئی نے کہا۔ "مجھ کو پتہ چلا ہے کہ شہباز کے ساتھ تمہارا یارانہ تھا"۔

"میری بات کان کھول کر سن لے"۔ صدیق کی بیوی نے تن کر کہا۔ "میرے خاوند کے ساتھ مجھے بھی سولی پر کھڑا کر دے۔ اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی"۔

جن لوگوں کا واسطہ پولیس کے ساتھ کبھی پڑا ہے، صرف ان کو معلوم ہے کہ پولیس والے جب بات کرتے ہیں تو آدھی بات گالیوں کی زبان میں کرتے ہیں۔ یہ ہندو اے ایس آئی تو اپنے آپ کو آئی جی سمجھتا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہ دیہات کی عورت ہے اور اس کا خاوند پھنسا ہوا ہے اس لئے یہ زیر ہو جائے گی۔ اسی خیال سے اے ایس آئی نے اس کو ایک ہی سانس میں تین چار گالیاں دے ڈالیں اور بولا۔ میں ابھی تمہیں ننگا کرتا ہوں۔

"تمہارے پچھلے آ جائیں تو وہ بھی مجھے ننگا نہیں کر سکتے"۔ صدیق کی بیوی نے کہا۔ "تجھ دو ٹکے کے ہندو کو میں کیا سمجھتی ہوں"۔

اس کی یہ بات سن کر میں کانپ گیا۔ یہ اے ایس آئی اپنی بے عزتی برداشت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ اٹھا، اس کو غصہ چڑھ گیا تھا۔

"پکڑ اس کو خالق!" اس نے گالی دے کر کہا۔ "میں اس کے کپڑے اتارتا ہوں"۔

جس پلنگ سے اے ایس آئی اٹھا تھا اس کے ساتھ چھوٹی سی ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ میز پر کاغذات

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھے اور س پر بڑے سائز کا ایک چاقو بھی پڑا ہوا تھا۔ یہ چاقو مکھے سے جامہ تلاشی میں برآمد ہوا تھا۔ اے ایس آئی نے یہ چاقو میز پر رکھ دیا تھا۔ اے ایس آئی اٹھ کر صدیق کی بیوی کی طرف آیا تو بیوی نے لپک کر چاقو اٹھا لیا اور اسے فوراً کھول لیا۔ مجھ کو امید نہیں تھی کہ عورت ذات اتنی دلیر ہو گی کہ تھانیدار کو چاقو ٹھ دے گی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے میں ذرا سی سستی کر دی۔ اس عورت نے بائیں طرف سے اے ایس آئی کے پہلو میں چاقو مارا۔ اے ایس آئی دائیں ہو گیا اور جہاں چاقو لگا تھا وہاں ہاتھ رکھا۔

صدیق کی بیوی نے چاقو اے ایس آئی کے پہلو سے نکال کر ایک بار پھر مارا۔ اب چاقو پیٹ میں لگا۔ اے ایس آئی آگے کو جھکا۔ صدیق کی بیوی نے اب اوپر سے پیٹھ میں چاقو اتار دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اب بات کر میرے ناراتے کی...... اب میں تیرے پاس رات گزاروں گی''۔

اس نے اتنی تیزی سے چاقو کے تین وار کیے کہ میں دیکھتا رہ گیا۔ اے ایس آئی فرش پر گرا۔ میں نے اس عورت کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے میں نے چاقو چھیننے کی کوشش کی اور ساتھ ہی صدیق کو آوازیں دیں۔ صدیق دوڑتا ہوا آ گیا۔ ہم دونوں نے بہت مشکل سے اس کے ہاتھ سے چاقو لیا۔ اے ایس آئی کا خون اتنا تیز نکل رہا تھا کہ دیوار تک چلا گیا۔ وہ بہت جلدی مر گیا۔ پوسٹمارٹم میں پتہ چلا تھا کہ چاقو نے اس کا دل کاٹ دیا تھا۔

''اب تیرے اقبالی ہونے کا مجھے غم نہیں رہا''۔ بیوی نے صدیق کو کہا۔ ''اب میں تیرے ساتھ رہوں گی۔ اکٹھے پھانسی چڑھیں گے''۔ اس نے صدیق کو بتایا کہ اے ایس آئی نے اس کو کیا کہا تھا۔

میں نے کانسٹیبلوں کو بلایا۔ میرا تو دماغ چکرا گیا۔ ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ نمبردار کو بلا لائے۔ گاؤں والے سوئے ہوئے تھے۔ نمبردار جاگ کر آ گیا۔ وہ صدیق اور اس کی بیوی کا رشتہ دار تھا۔ اسے بتلایا کہ اے ایس آئی کس طرح قتل ہوا ہے تو نمبردار غصے میں آ گیا۔ وہ باہر چلا گیا اور اپنی برادری کے دس بارہ آدمیوں کو جگا کر لے آیا۔ میں نے نمبردار کو اپنی مدد کے لئے اور اس کو گواہ بنانے کے لئے بلایا تھا لیکن وہ میرے لئے ایک مصیبت لے کر آ گیا۔ اس نے صدیق اور اس کی بیوی سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ دونوں نے بتایا۔

صدیق کی بیوی نے جب کہا کہ اے ایس آئی نے اس کو کیا کہا تھا اور اس نے گندی گالیاں بھی دی تھیں تو نمبردار اور اس کے آدمیوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ صدیق کی بیوی نے میرے اوپر بھی الزام لگا دیا کہ میں بھی اس کو ننگا کرنا چاہتا تھا۔ سب آدمی مجھ کو گالیاں دینے لگے اور سب کہتے تھے کہ اس کو بھی ختم کر دو اور لاشیں دور پھینک آؤ۔

میں اس قوم کو جانتا تھا۔ وہ خالی دھمکی نہیں دیتے تھے۔ میری موت آ گئی تھی۔ دونوں کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ ان کو بھی کہتے تھے کہ مار ڈالو۔ ہم تینوں دیوار کے ساتھ پیٹھیں لگا کر کھڑے ہو گئے اور وہ سب آدمی ہماری طرف بڑھنے لگے۔ موت کو دیکھ کر دماغ صحیح کام کرنے لگا۔ میں نے پولیس میں جو چالاکیاں اور استادیاں سیکھی تھیں، وہ میرے دماغ میں آ گئیں۔ میں نے ان کو کہا کہ ٹھہر جاؤ، میری ایک بات سن لو، پھر ہم تینوں کو قتل کر دینا۔

''ہم کو قتل کر دو گے تو انگریز افسر تمہارے گاؤں پر ہل پھیر دیں گے''۔ میں نے ان کو ڈرانے کے لئے کہا۔ ''انگریز تم کو نہیں چھوڑے گا اور تمہاری جوان عورتوں کو گورے سپاہی خراب کریں گے۔ میں تم کو ایک راستہ بتاتا ہوں۔ تم کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا''۔

انہوں نے کہا کہ جلدی سے وہ راستہ بتاؤ۔

''تمہاری عزت پر جس نے ہاتھ ڈالا تھا اس کی لاش یہ پڑی ہے''۔ میں نے ان کو کہا۔ ''اس نے سزا پا لی ہے۔ اب اگر ہم کو مارتے ہو تو بھی تمہاری بیٹی سزا اور بے عزتی سے نہیں بچ سکتی۔ اگر ہم کو چھوڑ دیتے ہو تو میں تمہاری عزت کی حفاظت کا بندوبست کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تم لوگ باہر چلے جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد یہاں سے ایک آدمی نکل کر بھاگے گا۔ تم سب اس کے پیچھے جا کر اس کو پکڑ لینا۔ آگے میں ثابت کروں گا کہ یہ آدمی جس کو تم لوگوں نے پکڑا ہے، چھوٹے تھانیدار کا قاتل ہے اور شہباز کو بھی اسی نے قتل کیا ہے''۔

''وہ آدمی کون ہو گا؟'' نمبردار نے پوچھا۔

''وہ مکھا ہو گا''۔ میں نے جواب دیا۔ ''وہ جانگلی سکھ جس کو تم جانتے ہو، اس کو ہم نے اندر بند کیا ہوا ہے۔ تم لوگ ایک کام کرو...... میں تم سے کچھ نہیں لوں گا۔ تم کہا میری جان چھوڑ دو۔ یہ دو کانسٹیبل ہیں ان کا پیٹ بھر دو پھر میں ان کو جس طرح کہوں گا یہ اسی طرح کریں گے''۔

ان لوگوں نے میرے ساتھ بحث و تکرار شروع کر دی۔ ان کو ڈر تھا کہ میری طرف سے ان کو دھوکا ہو گا۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان کو دھوکہ نہیں دے رہا تھا۔ میں آپ کو یہ بات بھی سچ سچ بتا دیتا ہوں کہ میں ان کی مدد اس وجہ سے نہیں کر رہا تھا کہ وہ مسلمان ہیں یا ایک ہندو اے ایس آئی نے ایک مسلمان لڑکی کی عزت خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنی جان چھڑا رہا تھا۔ مجھ کو پورا یقین تھا کہ یہ لوگ ہم تینوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کو یہ بھی کہا کہ اس عورت کو جو صدیق کی بیوی تھی، پولیس اور تھانے سے بچاؤ۔ یہ بہت خوبصورت عورت ہے اس کی عزت ہر جگہ برباد ہو گی۔ یہ کس کس کو قتل کرے گی۔

مختصر یہ کہ وہ لوگ میری بات مان گئے۔ میں نے ان کو اپنی استادی اچھی طرح سمجھا دی اور کانسٹیبلوں کو بھی سمجھا دیا۔ نمبردار نے اور دوسرے آدمیوں نے کانسٹیبلوں کو کہا کہ جس طرح ہیڈ کانسٹیبل کہتا ہے، اگر اس طرح سارا کام صحیح ہو گیا تو وہ ان کو اتنا زیادہ دیں گے جتنا ان کو اپنی ساری سروس میں نہیں ملے گا۔

میں نے ان سب کو کہا کہ باہر چلے جائیں اور جب مکھا یہاں سے نکلے گا تو اتنا زیادہ شور شرابہ کریں کہ گاؤں کے لوگ بھی جاگ پڑیں اور باہر نکل آئیں۔ جب یہ سب لوگ، صدیق بھی اور اس کی بیوی بھی، باہر نکل گئے تو میں اس کوٹھڑی میں گیا جہاں ہم نے مکھے کو بند کیا ہوا تھا۔ جوں ہی مکھے نے مجھ کو دیکھا اس نے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ میں نے اس کو کہا کہ گالیاں مت بکو، میں تمہاری چھٹی کرانے آیا ہوں۔ اس نے اے ایس آئی کو گالی دے کر پوچھا کہ اس نے مان لیا ہے کہ میں قاتل نہیں ہوں؟

''ہاں، مکھے! ہاں''۔ میں نے کہا۔ ''اس نے مان لیا ہے اور اس نے مجھ کو کہا ہے کہ مکھے کو چھوڑ کر دو''۔

مکھا خوش خوش اٹھا اور میں اس کو اس کمرے میں لے آیا جہاں اے ایس آئی کی لاش پڑی تھی۔ مکھا پوچھنے لگا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے مکھے کو کہا کہ تم یہاں سے بھاگو ورنہ مارے جاؤ گے۔ مکھا عقل والا ڈکیت تھا۔ اس نے مجھ کو کہا کہ تم مجھ کو کسی اور چکر میں پھنسا رہے ہو۔ میں نے اس کو کہا کہ تم یہاں سے بھاگو۔ اس نے تو بھاگنا ہی تھا لیکن اس کو شک ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ڈرامہ کیا جا رہا ہے۔ مجھ کو ایک خیال آ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ مکھا کو پھانسی چڑھانا ہی چڑھانا ہے۔ اگر یہ بچ گیا تو باہر آ کر مجھ کو قتل کر دے گا۔

مکھا کمرے سے نکل گیا۔ میں اور دونوں کانسٹیبل اس کے پیچھے گئے اور باہر جا کر ہم تینوں نے بڑی زور

WWW.AOURDUBOOKS.NET

سے شور مچا دیا۔ ''وہ گیا، وہ گیا، وہ گیا، وہ گیا، کھا بھاگ گیا''۔ باہر آدمی تیار کھڑے تھے۔ انہوں نے ہم سے زیادہ شور مچانا شروع کر دیا۔ میں مکھے کے پیچھے دوڑا اور بہت سے آدمی میرے پیچھے پیچھے آئے۔ مجھ کو اب یہ ڈر لگا کہ مکھا ہرن کی طرح قدموں کا بہت تیز تھا، ایسا نہ ہو وہ سچ مچ ہاتھ سے نکل ہی جائے۔

گاؤں کے اور بھی بہت سے لوگ جاگ کر باہر آ گئے۔ گاؤں کے کچھ جوان لڑکے بڑے تیز تھے۔ وہ مکھا کے پیچھے گاؤں سے نکل گئے۔ مکھا میں عقل تو زیادہ تھی لیکن پورے گاؤں کو اپنے پیچھے دیکھ کر اس کی عقل ماری گئی۔ وہ اگر رک جاتا اور گاؤں والوں سے پوچھتا کہ مجھے کو کیوں پکڑتے ہو تو شاید یہ ڈرامہ خراب ہو جاتا۔ اس کے دماغ میں ایسی خرابی آئی کہ وہ بھاگتا رہا۔ اندھیرے میں اس کو پکڑنا مشکل کام تھا لیکن گاؤں کے جوان لڑکوں نے ایسا گھیرا ڈالا کہ اس کو پکڑ لیا۔ اس نے گالیاں بکنی شروع کر دیں اور گاؤں کے لڑکوں نے اس کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔

میں اس کو پکڑ کر واپس لے آیا۔ میں نے نمبردار کے کان میں ایک بات کہی۔ اس پر ہم نے عمل کیا۔ وہ اس طرح تھا کہ اس کو پکڑ کر مقتول اے ایس آئی کے خون کے چھینٹے اس کے کپڑوں پر اور ہاتھوں پر پھینک دیئے۔ میں نے ادھر ہی ایک گواہ برائے برآمدگی آلۂ قتل یعنی چاقو بنا لیا کہ یہ چاقو اس راستے پر پڑا ہوا ملا ہے جس راستے پر مکھا بھاگا تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو تھانے کی طرف دوڑا دیا کہ سب انسپکٹر صاحب کو اطلاع کرے کہ اے ایس آئی صاحب کو مکھا نے قتل کر دیا ہے۔

مکھا کیا کر سکتا تھا۔ پورا گاؤں اس کے خلاف گواہ تھا، اس کو بھاگتے ہوئے پکڑا تھا۔ اس سے آگے جو کہانی ہے وہ میری چار سو بیسی اور استادی کی خفیہ کہانی ہے۔ میں نے اور دونوں کانسٹیبلوں نے سب انسپکٹر صاحب کو بھی شک نہیں ہونے دیا کہ ہم نے مکھا کے ساتھ کوئی ڈرامہ کیا ہے۔ سب انسپکٹر صاحب خود مکھا کی وارداتوں سے تنگ تھے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مکھا پھنسا ہے۔

مکھا کا شور شرابہ کسی نے نہ سنا۔ اس کو گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔ اس کے اقبالِ جرم کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گاؤں کے پچاس سے زیادہ آدمی ہم نے گواہ بنا لئے تھے۔ مکھا کی ہسٹری شیٹ موجود تھی۔ سب انسپکٹر صاحب نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ شہباز کو بھی مکھا نے ہی قتل کیا ہے۔ تین مہینے کے اندر اندر مکھا کو سزائے موت ہو گئی۔ اس دن میں بھی کورٹ میں موجود تھا۔ اس نے فیصلہ سنتے ہی مجھ کو، سب انسپکٹر صاحب کو اور سیشن جج صاحب کو ایسی ایسی گالیاں دیں جن میں سے چند ایک گالیاں میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔

مکھا کا اپیل کرنے والا کون تھا۔ اس نے سرکار کو درخواست دے کر سرکاری وکیل کیا اور اپیل دائر کی جو رد ہو گئی پھر مکھا کو پھانسی دے دی گئی۔

اس گاؤں کے میواتیوں نے دونوں کانسٹیبلوں کو اتنا روپیہ پیسہ دیا جو وہ ساری سروس میں نہیں کما سکتے تھے۔ مجھ کو وہ بہت پیسہ دے رہے تھے لیکن میں نہیں لیتا تھا۔ میں اس کو بہت سمجھتا تھا کہ میری جان بچ گئی تھی لیکن نمبردار نے مجھ کو گاؤں میں بلا کر میری جھولی میں بہت ساری رقم ڈال دی جو میں نے لے لی۔ میں شرافت کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ پھر بھی میں کسی بے گناہ کو سزا نہیں دلاتا تھا۔ مکھا قتل کی اس واردات میں بے گناہ تھا لیکن اس نے پہلے چار قتل کئے اور بری ہو گیا تھا۔ اس طرح میں نے مکھے پر ظلم نہیں کیا تھا۔ اس کو سزا ملنی چاہئے تھی جو اس کو مل گئی۔

◆□◆

جرم و سزا

انوکھے جرم

ٹھیکیدار جس کے پاس دولت کی اور پالے ہوئے غنڈے بدمعاشوں کی طاقت تھی اور جو مزدوروں اور اپنے مستقل ملازموں پر فرعون بنا رہتا تھا، شبانہ کے آگے غلاموں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔

احمد یار خان
تحریر: عارف محمود

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بیوی کی گمشدگی کی یہ کہانی پاکستان کے ایک شہر کی ہے لیکن اس وقت کی ہے جب ابھی پاکستان کا وجود نہیں تھا اور یہ شہر اتنا بڑا نہیں تھا پھر بھی اپنے وقت کا بڑا شہر تھا۔ میں اس کے ایک پولیس سٹیشن کا ایس ایچ او تھا۔ ایک روز صبح سویرے ایک آدمی پولیس سٹیشن میں آیا۔ میں ابھی ڈیوٹی پر نہیں پہنچا تھا۔ اس کو میرے انتظار میں بٹھا لیا گیا۔ میں جب پولیس سٹیشن پہنچا تو میں نے اس شخص کو پہچان لیا۔ بڑا امیر کبیر ٹھیکیدار تھا۔ جنگِ عظیم نے اس جیسے بہت سے لوگوں کو ٹھیکیداریوں کے ذریعے امیر کبیر بنا دیا تھا۔ جنگ سے پہلے ٹھیکیداریاں کم تھیں اور یہ صرف ہندوؤں یا سکھوں کے قبضے میں تھیں۔ مسلمان بے چارے محنت مزدوری یا دفتروں میں لوئر ڈویژن کی کلرکی کرتے تھے۔ جنگِ عظیم میں ہر طرح کی ٹھیکیداریاں جن میں سپلائی کا کام زیادہ ہوتا تھا، بہت عام ہوگئی تھیں۔ سونے چاندی کی نہر نے اس شخص کے گھر کو بھی سیراب کر دیا۔ اس سے پہلے اس کو تو کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔

میں اس شخص کا صحیح نام ظاہر نہیں کروں گا۔ اس کی بجائے اسے ٹھیکیدار ہی لکھوں گا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے بڑے بڑے لوگوں اور سول افسروں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی۔ ان لوگوں میں مَیں بھی شامل تھا۔ چند مرتبہ یہ میرے سلام کے لئے میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کے درمیان تھی۔ میں یہ سمجھا کہ حسبِ معمول سلام کے لئے حاضر ہوا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دل میں میرا ذرا جتنا بھی احترام نہیں۔ یہ تو تھانیداری کو سلام کرتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور دوڑ کر میرے رستے میں آ گیا۔

''آیئے شیخ صاحب!'' میں نے رسمی طور پر اس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور خیر خیریت پوچھی۔ ''کہیے کاروبار کیسا چل رہا ہے؟''

''کاروبار تو ٹھیک چل رہا ہے انسپکٹر صاحب'' اس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ ''میری تو پگڑی گر گئی ہے''۔

''وہ تو نہ جانے کب کی اتری ہوئی ہے''۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو آپ کے سر پر ترکی ٹوپی دیکھی ہے''۔

میں اس کی بات کو مذاق سمجھ رہا تھا لیکن وہ پہلے سے زیادہ رنجیدہ ہو گیا۔

''آپ سمجھے نہیں''۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور میرے دفتر کی طرف چل پڑا۔ میں نے اس کو بٹھایا اور خود بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

''میری بیوی لاپتہ ہو گئی ہے''۔ اس نے کہا۔

''اس عمر میں؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''آپ کے تو بچے بھی جوان ہو چکے ہوں گے.... کسی کے ساتھ کوئی دشمنی عداوت ہے؟''

''میں پہلی بیوی کی بات نہیں کر رہا جس کے بچے جوان ہو چکے ہیں''۔ اس نے کہا۔ ''دوسری بیوی لاپتہ ہوئی ہے''۔

''دوسری شادی کب کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''عمر کیا ہے اس کی؟''

''یہی کوئی تیئس چوبیس سال ہو گی''۔ اس نے جواب دیا۔ ''شادی کا تو ابھی مشکل سے ایک سال ہوا ہے''۔

''پھر یوں کہیں کہ وہ خود لاپتہ ہوئی ہے''۔ میں نے کہا۔

''اس نے پریشانی کا اظہار شروع کر دیا۔ وہ پریشانی کا نہیں بلکہ مظلومیت کا اظہار کر رہا تھا۔ مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس اکتاہٹ میں تھوڑا سا غصہ بھی تھا۔ میں نے اس کی حیثیت اور سوشل سٹینڈرڈ کا لحاظ نہ کیا۔

''شیخ صاحب!'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی طرح ترقی کیوں نہیں کر سکتے؟ وجہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ کسی مسلمان کے پاس روپیہ پیسہ آ جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ اپنی عمر اور جسمانی حالت کو دیکھے بغیر بیاہ رچا لیتا ہے۔ شیخ صاحب! جوان عورت صرف روپے پیسے اور سونے کے زیورات سے ہی خوش نہیں ہوا کرتی۔ جسمانی ضرورت کو الگ رکھیں، جس طرح مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو جوان اور خوبصورت عورت ملے اسی طرح کی خواہش عورت کے دل میں بھی ہوتی ہے''۔

اس نے کوئی جواب دیئے بغیر سر جھکا لیا۔

''مجھ کو کوئی اشارہ دیں شیخ صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ خود گئی ہے اور کسی ایسے آدمی کے ساتھ گئی ہے جس کو وہ شادی سے پہلے چاہتی تھی یا جس کے ساتھ اس نے شادی کے بعد تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اگر آپ کوئی اور شک لکھوانا چاہتے ہیں تو میں لکھ لوں گا...... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے باہر جا کر کہیں خودکشی کر لی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اس کی لاش ملتے ہی اخباروں میں خبر آ جائے گی۔ اگر وہ ریل گاڑی کے نیچے آئی ہے تو شام سے پہلے پہلے اس کی اطلاع برائے شناخت میرے پاس بھی آ جائے گی۔ یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ خوش تھی یا تنگ تھی''۔

''مجھے اپنی پہلی بیوی کے بھائیوں پر شک ہے''۔ ٹھیکیدار نے کہا۔ ''آپ لکھ لیں، اس کے دو بھائی ہیں اور ان کا اٹھنا بیٹھنا بدمعاشوں کے ساتھ ہے۔ اگر میرا یہ شک صحیح ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہو گا کہ میری بیوی کو اغوا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے گئی ہے تو میں اس کو طلاق دے دوں گا لیکن وہ تمام زیورات اور دو ہزار روپیہ ساتھ لے گئی ہے۔ کیا یہ چوری نہیں؟''

''کوئی شک نہیں یہ چوری ہے''۔ میں نے کہا۔ ''اگر وہ اپنی مرضی سے گئی ہے تو چوری کے علاوہ اس کا دوسرا جرم یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہے لیکن شیخ صاحب! یہ بات کرنا بہت ہی مشکل ہے کہ وہ زیورات چوری کر کے لے گئی ہے۔ صرف ایک صورت ہے کہ وہ پکڑی جائے اور زیورات اس کے قبضے سے برآمد ہوں۔ پھر جناب شیخ صاحب! آپ کہتے ہیں کہ وہ دو ہزار روپیہ نقد ساتھ لے گئی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ جو رقم لے گئی ہے وہ دو ہزار روپے تھی؟ کیا آپ نے یہ رقم گن کر رکھی ہوئی تھی؟''

''یہ میرا اندازہ ہے''۔ اس نے کہا۔ ''رقم زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ میں اسے فالتو پیسے دیتا رہتا تھا۔ میں نے اس کا اٹیچی کیس کھول کر دیکھا ہے، اس میں زیورات بھی نہیں پیسے بھی نہیں''۔

''کیا وہ اپنے ساتھ فالتو کپڑے لے گئی ہے؟''

''میں نے اس کے کپڑے نہیں دیکھے''۔ اس نے جواب دیا۔

''یہ میں چل کے دیکھ لوں گا''۔ میں نے کہا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ نے کہا ہے کہ آپ کی پہلی بیوی کے بھائیوں نے آپ کی دوسری بیوی کو اغوا کیا ہے اور وہ اپنی مرضی سے ان کے ساتھ گئی ہے۔ اپنی سوکن کے بھائیوں کے ساتھ اپنی مرضی سے جانا میری سمجھ میں نہیں آیا''۔

''وہ شاید مجھ سے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہو گی''۔ اس نے کہا۔ ''ان کے ساتھ اس نے خود بات طے کی ہو گی کہ اسے اس گھر سے نکالیں اور اس کی پسند

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کے آدمی تک پہنچا دیں"۔

"اس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں"۔ میں نے کہا۔ "ایک یہ کہ وہ آپ سے بہت تنگ تھی۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی پہلی بیوی کے بھائیوں نے اس کو قتل کی یا کوئی اور دھمکی دے کر کہا ہو گا کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے۔ اس لڑکی نے انہیں کہا ہو گا کہ وہ تو خود ہی بھاگنے کو تیار ہے لیکن اکیلی جائے کہاں؟ آپ کے سالوں نے کہا ہو گا کہ وہ جہاں کہے گی اس کو پہنچا دیں گے...... نہیں شیخ صاحب! ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی غور کریں کہ اس لڑکی کے ساتھ آپ کی شادی ہوئے ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ انہوں نے یعنی آپ کے سالوں نے اگر اس کو غائب کرنا ہوتا تو شروع میں ہی کر دیتے...... کیا آپ نے پہلی بیوی کو اس کے میکے بٹھا دیا ہے؟ کیا آپ اس کو خرچہ نہیں دیتے؟"

"خرچہ پہلے سے زیادہ دیتا ہوں صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "اور میں نے اس کو الگ مکان دیا ہوا ہے۔ بچوں کی ساری ضرورتیں میں خود ہی پوری کرتا ہوں۔ ایک نوکرانی اس کے پاس رہتی ہے۔ ہفتے میں دو دن اور دو راتیں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔ باقی دن نئی بیوی کے ساتھ گزارتا ہوں۔ نئی بیوی کو ایک الگ مکان میں رکھا ہوا ہے"۔

"آپ دو دن اور دو راتیں پہلی بیوی کے ساتھ گزارتے ہیں"۔ میں نے پوچھا۔ "تو کیا ان دنوں میں نئی بیوی اکیلی رہتی ہے؟"

"اس کے پاس نوکر ہوتا ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "جو رات کو بھی گھر میں موجود رہتا ہے"۔

"گزشتہ رات آپ پہلی بیوی کے پاس تھے یا دوسری بیوی کے پاس؟"

"پہلی بیوی کے پاس"۔ اس نے جواب دیا۔ "میں اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ نئی بیوی کا نوکر آیا۔ اسنے بتایا کہ بی بی گھر میں نہیں ہے۔ وہ اتنی سویرے کہاں جا سکتی تھی۔ نوکر سائیکل پر اس کے گھر چلا گیا۔ میں نئی بیوی کے گھر گیا۔ پہلے اس کا اٹیچی کیس کھولا۔ زیورات اور رقم غائب پا کر میرے دماغ میں یہی بات آئی کہ وہ بھاگ گئی ہے یا اغوا کر لی گئی اور زیورات اور پیسے اغوا کرنے والے لے گئے ہیں۔ میں سیدھا آپ کے پاس آ گیا"۔

رات، نئی بیوی اور نوکر

یہ تھوڑی گفتگو ہے جو میں نے پیش کی تا کہ پڑھنے والے بیک گراؤنڈ کو سمجھ لیں۔ اس کے ساتھ اس سے زیادہ گفتگو ہوئی تھی جس سے میں نے اپنے دماغ میں ایک سے زیادہ شبہے بٹھا لئے تھے اور ان کو سامنے رکھ کر تفتیش کرنی تھی۔ ایک شک یہ بھی تھا کہ یہ شخص مجھ کو ٹھیک بات نہیں بتا رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ وہ شرمندہ تھا۔ تیئس چوبیس سال کی لڑکی اپنے سے دگنی عمر کے آدمی کے ساتھ خوش رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس آدمی کی پہلی بیوی بھی تھی اور چار بچے تھے جن میں بڑا لڑکا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ وہ سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ اس پر بھی مجھ کو شبہ تھا۔ اس کی ماں روتی تھی کہ اس کا خاوند دوسری بیوی لے آیا ہے۔ اس لڑکے نے جوشِ جوانی میں اپنی ماں کی سوکن کو غائب کر دیا ہو گا۔

میں نے ضابطے کے مطلوبہ کاغذات تیار کئے اور ٹھیکیدار کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ بڑا اچھا نیا بنا ہوا مکان تھا جو ایک محلے کے کونے پر تھا۔ ایک طرف سڑک تھی اور دوسری طرف کشادہ گلی تھی۔ یہ مکان بائیں طرف ایک مکان سے ملحق تھا اور اس کے پیچھے بھی ایک مکان تھا۔ ٹھیکیدار کا یہ مکان شہری طرز کا بنا ہوا تھا۔

میں نے سب سے پہلے نوکر کو دیکھا۔ اس کی عمر پینتیس سال سے ذرا کم یا زیادہ تھی۔ وہ گندمی رنگ کا تندرست آدمی تھا اور اس نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ دیکھنے میں وہ عام نوکروں جیسا نہیں لگتا تھا اور اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ وہ گھروں میں کام کرنے والے نوکروں جیسا سیدھا سادہ اور بدھو قسم کا آدمی نہیں۔

وہ کمرہ دیکھنا ضروری تھا جس میں لاپتہ لڑکی سوتی تھی۔ میں اس کا اصلی نام چھپانے کے لئے فرضی نام شبانہ لکھوں گا۔ ٹھیکیدار مجھ کو اس کمرے میں لے گیا۔ یہ ان کا بیڈ روم تھا۔ اس میں ڈریسنگ ٹیبل بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبی تپائی تھی جس پر ایک اٹیچی کیس پڑا ہوا تھا۔ اٹیچی کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا کہ اس نے اٹیچی کیس کس طرح کھولا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے چابیاں نکال دیں۔ یہ تین چابیاں تھیں۔ میرے کہنے پر ٹھیکیدار نے ایک چابی لگا کر اٹیچی کیس کھول دیا۔

میں نے اٹیچی کیس کی پوری تلاشی لی۔ اس میں کپڑے تھے۔ اٹیچی کی پاکٹیں بنی ہوئی تھیں، ان میں بھی ہاتھ پھیرا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس میں کوئی خط یا رقعہ ہو گا جو شبانہ کے کسی دوست نے لکھا ہو گا یا اس کے دوست کا فوٹو ہو گا مگر مجھے کچھ بھی نہ ملا۔

دو چابیاں اور تھیں، میں نے ٹھیکیدار سے نہ پوچھا کہ یہ چابیاں کون سے تالوں کی ہیں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ایک دراز میں تالا فٹ کیا ہوا تھا، میں نے اس میں ایک چابی لگائی، یہ نہ لگی۔ دوسری چابی سے تالا کھل گیا۔ اس میں زنانہ پرس پڑا ہوا تھا۔ میں نے یہ کھول کر دیکھا اس میں دس دس اور پانچ پانچ کے نوٹ تھے، ایک انگوٹھی تھی، لپ سٹک تھی اور اس میں ایک جوان آدمی کا فوٹو تھا۔ فوٹو میں یہ خوبصورت جوان لگتا تھا، فوٹو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پاسپورٹ سائز تھا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''یہ اس کا بھائی نہیں، اس کے دو بھائی ہیں جو اس سے چھوٹے ہیں''۔

''کیا آپ کی یہ گمشدہ بیوی اپنے ماں باپ کے گھر جاتی رہتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر جاتی تھی تو کچھ دین وہاں رہتی تھی؟''

''ہاں جی!'' اس نے جواب دیا۔ ''کبھی ایسے بھی ہوتا تھا کہ میں پہلی بیوی کے پاس رہتا تو یہ دو تین دنوں کے لئے اپنے باپ کے پاس چلی جاتی تھی۔ تین چار مرتبہ اس نے ضد کی کہ وہ گھر جانا چاہتی ہے تو میں نے اس کو بھیج دیا''۔

''یعنی وہ ضد بھی کرتی تھی''۔ میں نے کہا۔ ''اور آپ اس کی ہر ضد مان لیتے تھے''۔

''جوان لڑکی تھی''۔ اس نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔ ''ضد ماننی پڑتی تھی''۔

کمرے میں ایک الماری تھی جو دیوار میں تھی، اسے تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے ٹھیکیدار سے پوچھے بغیر تیسری چابی الماری کے تالے کو لگائی، تالا کھل گیا۔ اس میں کتابیں اور رسالے رکھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے پوچھا کہ لڑکی کتنی جماعتیں پڑھی ہوئی تھی؟ اس نے بتایا کہ وہ دس جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں لڑکیوں کو کالجوں میں داخل کرنے کا رواج نہیں تھا۔

میں نے کتابیں دیکھیں، یہ سب اردو کے ناول تھے اور رسالے فلمی تھے۔ ان سے پتہ لگتا تھا کہ لڑکی کا شغل اور ذوق شوق کیا تھا۔ الماری کے ایک خانے میں زیورات کے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ڈبے کھولے تو زیورات ان میں موجود تھے۔ ایک ڈبہ ٹین کا تھا، اس کو صندوقچی کہا جائے تو ٹھیک ہوگا، یہ رنگدار اور پھولدار تھا۔ اسے کھولا تو اس میں کچھ نوٹ سو سو روپے کے اور باقی دس دس اور پانچ پانچ روپے کے تھے اور ایک روپے کے سکے بھی تھے۔ آج مجھے صحیح رقم یاد نہیں رہی، یہ یاد ہے کہ دو ہزار سے زیادہ تھا، شاید تین ہزار پوری نہیں تھی۔

میں نے ٹھیکیدار کی طرف دیکھا اور میں نے کہا کچھ بھی نہیں، وہ بھی چپ رہا۔

''یہ چابیاں آپ کو کہاں سے ملی تھیں؟''

''ڈریسنگ ٹیبل کے دوسرے دراز سے''۔ اس نے جواب دیا۔

میں نے پلنگ کی طرف دیکھا، گھر پہننے والی چپلیاں پلنگ کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا، ایک پلنگ پر رضائی کھلی پڑی تھی، دوسرے پلنگ کی جو اس پلنگ کے ساتھ جڑا ہوا تھا، رضائی تہہ کی ہوئی تھی۔ اس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ ایک پلنگ پر شبانہ سوئی تھی اور دوسرا پلنگ خالی تھا۔ تہہ کی ہوئی اور کھلی ہوئی رضائی کے درمیان مجھے ایک کپڑے کا کونہ دکھائی دیا، کھلی ہوئی رضائی کو ہٹایا تو یہ شفون کا دوپٹہ تھا۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دوپٹہ کسی اور کا ہے، یہ شبانہ کا دوپٹہ تھا۔

پلنگ سے مجھے ایک اور چیز ملی، یہ دو تین چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ میں نے فرش پر دیکھا دو تین ٹکڑے وہاں سے بھی مل گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ لڑکی کو زبردستی اٹھایا گیا ہے۔ اس کا خاوند اس رات اس کے پاس نہیں تھا، پھر چوڑیاں کس طرح ٹوٹیں؟ سوتے سوتے عورت کی ایک چوڑی ٹوٹ سکتی، اتنی نہیں جتنی چوڑیوں کے ٹکڑے مجھے ملے۔

پلنگ پر دوپٹہ اور پلنگ کے ساتھ چپلیاں صاف ثبوت تھا کہ لڑکی کو زبردستی اٹھایا گیا ہے۔ اس کے مزید

ثبوت بھی ملے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے گئی ہوتی تو دوپٹہ پلنگ پر نہ چھوڑ جاتی۔ چپلیاں پلنگ کے ساتھ نہ ہوتیں۔ وہ جوتی پہننے کے لئے وہاں تک چپلیاں پہن کر گئی ہوتی جہاں اس کے سینڈل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ پرس یہیں چھوڑ کر نہ جاتی۔ الماری سے زیورات اور کپڑے ساتھ لے جاتی۔ اپنی مرضی سے جانے کا باعث تو صاف پتہ تھا۔ وہ یہ کہ اس کا خاوند اس کے باپ کی عمر کا تھا اور اس نے پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی اور وہ اس کی تمام ضرورتیں پوری کر رہا تھا اور اس کے پاس رہتا بھی تھا۔

میرے ہاتھ میں ایک فوٹو بھی آ گیا تھا۔ لڑکی کے پرس میں فوٹو کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ اس آدمی کے ساتھ لڑکی کی محبت ہے اور اس کو لڑکی کے ساتھ محبت ہے۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ اس آدمی کے ساتھ وہ گئی ہے تو زبردستی کا معاملہ نہیں تھا، اپنی مرضی سے گئی ہے۔ یہ بھی سوچ آتی تھی کہ یہ آدمی اس کو کہتا ہوگا کہ میرے ساتھ بھاگ چلو لیکن شبانہ نہیں مانتی ہوگی، اس آدمی نے اس کو زبردستی اغوا کیا ہوگا۔

میں نے اس آدمی کو شامل تفتیش کرنا تھا۔

تصویر کس کی تھی؟

میں اسی کمرے میں بیٹھ گیا اور ٹھیکیدار کو بھی بٹھا لیا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی بیوی کو زبردستی اغوا کیا گیا ہے تو آپ کس پر شک کریں گے؟'' میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا۔ ''کیا آپ پہلی بیوی کے بھائیوں پر ہی شک کریں گے...... اس نوکری کی بابت آپ کیا کہتے ہیں، کیا اس پر آپ کو اعتبار ہے؟''

''سولہ آنے اعتبار ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''اعتبار ہے تو اپنی جوان بیوی کی خدمت اور رکھوالی کے واسطے اس کو رکھا ہوا ہے۔ اس کو میں تنخواہ اور روٹی کپڑا بھی دیتا ہوں اور اس کے دو بچوں کو اپنے خرچ پر سکول پڑھا رہا ہوں اس پر مجھ کو ذرا جتنا بھی شک نہیں ہے''۔

''آپ نے جب دوسری شادی کی تھی تو پہلی بیوی اور اس کے بھائیوں نے آپ کو کچھ کہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''شور شرابہ کیا ہوگا، کوئی دھمکی دی ہو گی؟ انہوں نے دوسرے لوگوں کے ساتھ کچھ باتیں کی ہوں گی کہ ہم یہ کر دیں گے، وہ کر دیں گے''۔

''انہوں نے یہ سب کچھ کہا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''دھمکیاں بھی دی تھیں اور لوگوں سے انہوں نے بہت دفعہ کہا تھا کہ وہ میری نئی بیوی کو اغوا کر کے غائب کر دیں گے''۔

''کیا ان دنوں آپ کا یا آپ کی نئی بیوی کا پہلی بیوی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا پہلی بیوی کے بھائیوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟''

''پہلی بیوی کے ساتھ تو ہوتی ہی رہتی ہے''۔ اس نے جواب دیا۔ ''چار پانچ روز پہلے ذرا زیادہ ہو گئی تھی، اتنی زیادہ کہ میرا بڑا بیٹا بھی اپنی ماں کی حمایت میں میرے ساتھ بدتمیزی سے بولا تھا۔ میں نے اس ڈانٹا تو اس نے کہا کہ میں نے آپ کو باپ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، آپ زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ ہمیں خرچہ دینا بند کر دیں گے، کر دیں میں کہیں نوکری کر لوں گا۔ میرے دو ماموں ہیں، وہ ہماری مدد کریں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہم یہ مکان نہیں چھوڑیں گے، جائیداد میں سے ہم اپنا پورا حصہ لیں گے۔ دوسرے دن اس کے دونوں ماموں میرے پاس آئے، میرے بیٹے یا اس کی ماں نے انہیں گزشتہ دن والا لڑائی جھگڑا سنایا ہو گا۔ انہوں نے مجھ کو تو بات ہی نہیں کرنے دی،

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دھمکیاں دے کر چلے گئے"۔

"کیا دھمکیاں دے کر چلے گئے"۔

"ایک تو قتل کی دھمکی تھی"۔ اس نے جواب دیا۔ "انہوں نے کہا کہ اپنی دلہن کی لاش کو ڈھونڈتے تمہاری عمر گزر جائے گی۔ پھر بھی ہماری بہن کو تنگ کرو گے تو تم کو بھی لاپتہ کر دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دولت کے گھمنڈ میں نہ رہنا"۔

"آپ نے بھی کچھ کہا ہوگا؟"

"ہاں صاحب!" ٹھیکیدار نے جواب دیا۔ "میں یہ بکواس خاموشی سے تو نہیں سن سکتا تھا۔ میں نے ان کو کہا تھا کہ اپنے آپ کو اتنا بدمعاش اور دلیر سمجھتے ہو تو میری دوسری بیوی کے گھر کی گلی میں سے گزر کر دیکھنا"۔

ٹھیکیدار نے اس کے علاوہ اور بات چیت جوان دونوں کے ساتھ ہوئی تھی، پوری پوری سنائی تو میں نے دونوں بھائیوں کو مشتبہ بنا لیا۔ ان کے ساتھ ٹھیکیدار کے بیٹے کو بھی مشتبہ سمجھ لیا۔ ٹھیکیدار کو میں نے کمرے سے باہر کیا اور نوکر کو بلایا۔ میرے پہلے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ شبانہ صبح بہت جلدی سورج نکلنے سے پہلے جاگ اٹھتی تھی ور نوکر اس کو کمرے میں ناشتہ دیا کرتا تھا۔ اس صبح اس نے دیکھا کہ دیر ہو گئی ہے اور شبانہ ابھی باہر نہیں نکلی تو نوکر کو اس کے کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ کھلا ہوا دکھائی دیا۔

نوکر نے بیان دیا کہ وہ کمرے میں گیا تو شبانہ وہاں نہیں تھی۔ باہر کا دروازہ دیکھا تو وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ یہ نوکر نے نہیں کھولا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ رات کو اس نے روزمرہ کی طرح دروازہ اندر سے چٹخنی چڑھا کر بند کیا تھا۔ اس نے کہا یہ اس کی روزمرہ کی عادت تھی اور جس رات ٹھیکیدار گھر نہیں ہوتا تھا اس رات وہ زیادہ احتیاط کرتا تھا۔

"شیخ صاحب اور بیوی آپس میں کس طرح رہتے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے خوش رہتے تھے یا ان میں ناچاقی رہتی تھی؟"

"ٹھیک ٹھاک رہتے تھے"۔ اس نے جواب دیا۔ "بی بی کو میں ہمیشہ خوش دیکھا کرتا تھا"۔

"تمہارے ساتھ بی بی باتیں کرتی ہوگی"۔

"ہاں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "وہ صاحب کی بہت تعریفیں کرتی تھی"۔

اس شخص سے مجھ کو کوئی خاص بات حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بی بی کس طرح گھر سے نکلی ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جانب!" اس نے جواب دیا۔ "ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ وہ خود گئی ہے"۔

"میں کہتا ہوں اس کو زبردستی لے جایا گیا ہے" میں نے کہا۔ "اور لے جانے والوں کو تمہاری مدد حاصل تھی"۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر انکار کیا اور کانپنے لگا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ شیخ صاحب جیسے ہمدرد اور نیک مالک کو دھوکہ دینے کا تو دماغ میں خیال بھی نہیں لا سکتا۔

"کیا بی بی اندر سے دروازہ بند کر لیتی تھی؟"

"ہاں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "وہ اکیلی ہوتی تھی تو میں اس کو ضرور کہتا تھا کہ بی بی جی اندر سے چٹخنی چڑھا لینا"۔

اس کمرے کی ایک کھڑکی برآمدے کی طرف تھی۔ اس کے آگے بڑا خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر پردہ ہٹایا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی، یہ کی تھی۔ میں نے اس کی دہلیز کو دیکھا، ایک جگہ ایسے شک ہوا جیسے جوتی کا نشان ہو۔

"یہ کھڑکی رات کو کھلی ہوتی تھی؟" میں نے نوکر سے پوچھا۔

"نہیں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "یہ رات کو بند رہتی ہے"۔

"یہ کس نے کھولی ہے؟"

"میں نے جناب!" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم یہ روزانہ کھول دیتے ہو؟"

"ہاں جناب!" اس نے جواب دیا۔ "روزانہ کھول دیتا ہوں"۔

"ایک بات اپنے دماغ میں بٹھا لو"۔ میں نے اس کو کہا۔ "اگر بعد میں مجھ کو پتا لگا کہ تم نے کوئی بات جھوٹ بتائی ہے تو پھر سوچ لو کہ تمہاری خیر نہیں"۔

اس نے حسب معمول ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ جو کچھ بتا رہا ہے سچ بتا رہا ہے۔ ابھی تو میں نے اپنے صحیح طریقے سے تفتیش شروع نہیں کی تھی۔ میں ابھی زمین ہموار کر رہا تھا۔ یہ نوکر مجھ کو کچھ مشکوک نظر آ رہا تھا۔

میں کمرے سے نکلا اور مکان کو اندر سے دیکھا پھر میں اوپر چلا گیا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اوپر سے یعنی اس مکان کے ساتھ والے مکانوں کی چھتوں کی طرف سے اس مکان میں آنا آسان ہے یا نہیں۔ مکانوں کی ساخت ایسی تھی کہ ادھر آنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ لڑکی کو زبردستی اٹھایا گیا ہے لیکن مجھ کو اندر آنے کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ٹھیکیدار کے ساتھ کچھ اور باتیں کر کے اور اس کے نوکر کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا۔

بیوی نے اُودھم مچا دیا

تھانے میں جا کر میں نے شبانہ کے باپ کو، ٹھیکیدار کی بیوی کے دونوں بھائیوں کو اور اس کے بڑے بیٹے کو تھانے طلب کیا۔ سب سے پہلے شبانہ کا باپ آیا اور میں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی بیٹی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھ کو کچھ معلوم نہیں جناب!" اس نے جواب دیا۔

"روپے پیسے کے لالچ میں آپ نے اپنی جوان بیٹی اپنی عمر کے آدمی کے ساتھ بیاہ دی تھی"۔ میں نے کہا۔ "اب اس کا نتیجہ دیکھ لو۔ میں آپ کو یہ کہنا نہیں چاہتا کہ یہ ایک جوان لڑکی پر ظلم کیا گیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی بیٹی کو تلاش کیا جائے...... کیا آپ کی بیٹی ٹھیکیدار کے ساتھ خوش تھی؟"

"نہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "وہ اداس رہتی اور اکثر روتی بھی تھی"۔

"کیا وہ کسی اور کے ساتھ یعنی اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی تھی؟"

"شاید نہیں"۔ اس نے ذرا جھجک کر جواب دیا۔

میں نے وہ فوٹو جو شبانہ کے پرس سے برآمد ہوا تھا، اس کے آگے رکھ دیا اور پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اس نے فوٹو دیکھا تو میں نے نوٹ کیا کہ اس کے چہرے کی حالت بدل گئی تھی ور اس کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس میں اس نے فوٹو پکڑا ہوا تھا۔

"یہ ہمارے محلے کا لڑکا ہے"۔ اس نے کہا۔ "ہمارے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر اس کا گھر ہے"۔

میرے پوچھنے پر سے نے بتایا کہ یہ لڑکا بی اے پاس کر کے ایک سرکاری دفتر میں سٹینوگرافر لگا ہوا ہے اور اس کا باپ ایڈووکیٹ ہے۔ شبانہ کے باپ نے بتایا کہ یہ بڑا شریف اور معزز خاندان ہے اور خوشحال بھی ہے۔ شبانہ پردہ کرتی تھی اور برقعے میں باہر نکلا کرتی تھی لیکن اس گھرانے کے ساتھ پردہ نہیں تھا۔

ایڈووکیٹ کے اس لڑکے کا اصل نام تو کچھ اور تھا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

لیکن میں اس کو عظیم لکھوں گا۔ عظیم شبانہ کے گھر آتا جاتا تھا اور شبانہ اس کے گھر جاتی رہتی تھی۔ اس طرح ان کی آپس میں اتنی بے تکلفی پیدا ہوگئی جسے محبت کہتے ہیں۔ میں نے شبانہ کے باپ سے پوچھا کہ عظیم کے واسطے اس کے والدین نے شبانہ کا رشتہ کبھی مانگا تھا؟

"جی ہاں"۔ اس نے جواب دیا۔ "میں تو چاہتا تھا کہ اس سے بہتر اور کوئی گھرانہ نہیں ملے گا اور شبانہ کا رشتہ عظیم کو دے دیا جائے لیکن میری بیوی نہیں مانتی تھی"۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "لڑکا اچھا نہیں یا اس کے گھر والوں میں کوئی خرابی ہے؟"

"نہیں صاحب!" اس نے اکتاہٹ سے جواب دیا "لڑکا شریف ہے، اس کی طبیعت کو میں جانتا ہوں، خوش رہتا ہے اور دوسروں کو خوش رکھتا ہے۔ میں نے محلے میں اس کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں سنی۔ میں نے، آپ کو بتایا ہے کہ یہ بڑا شریف اور عزت دار گھرانہ ہے"۔

"پھر آپ کی بیوی نے آپ کی بات کیوں نہیں مانی؟"

"سچی بات بتاؤں صاحب!" اس نے کہا۔ "میری بیوی لالچی عورت ہے، میں تو اسی کو دولت سمجھتا ہوں کہ حلال کی باعزت روٹی مل جائے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے مگر میری بیوی کے خیالات مجھ سے الٹ ہیں۔ یہ ٹھیکیدار جو میری عمر کا ہوتے ہوئے میرا داماد بنا ہے، میرے ملنے جلنے والوں میں سے ہے، اس نے میری بیٹی کو دیکھا کہ جوان ہوگئی ہے تو میری بیوی کا منہ بھرنا شروع کر دیا۔ اس نے میری بیوی کو بڑے بڑے مہنگے تحفے دیئے اور مجھے شبہ ہے کہ وہ میری بیوی کو کیش بھی دیتا رہا ہے، آخر اس نے میری بیٹی کا رشتہ مانگا، میں نے تو انکار کر دیا لیکن میری بیوی نے ایسا اودھم مچایا کہ میں مجبور ہو گیا اور اس طرح میری بیٹی کی قسمت پر کالی مہر لگ گئی ہے"۔

مجھ کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ شبانہ کا بیاہ ٹھیکیدار کے ساتھ باپ نے کرایا تھا یا ماں نے، میں تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شبانہ ٹھیکیدار کے ساتھ خوش تھی یا نہیں اور اگر وہ خوش نہیں تھی تو اس کا رویہ کیسا تھا۔ پھر میں نے دوسری بات یہ معلوم کرنی تھی کہ عظیم کیسا آدمی تھا اور کیا عظیم شبانہ کو اپنے ساتھ بھگا کر لے جانے کی ہمت رکھتا تھا یا نہیں، اس کو میں نے تھانے میں بھی طلب کیا۔

میں شبانہ کے باپ کو اپنے دفتر میں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکلا اور ایک اے ایس آئی کو بلایا۔ اس کو عظیم کے گھر کا اور دفتر کا پتہ دیا اور کہا کہ معلوم کرو کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ یہ بھی معلوم کرنے کے واسطے کہا کہ گزشتہ رات وہ کہاں تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اے ایس آئی کو ساری بیک گراؤنڈ اور واردات بتائی۔ یہی اس کا کام تھا جس کی اس کو ٹریننگ بھی حاصل تھی اور تجربہ بھی۔

شبانہ کا باپ کہتا تھا کہ اس کو عظیم پر ذرا جتنا بھی شک نہیں کہ اس نے شبانہ کو اغوا کیا یا کرایا ہو گا۔ یہ تو میں بھی سوچتا تھا کہ شبانہ کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ اگر عظیم نے اس کو اغوا ہی کرانا تھا تو اس نے ایک سال انتظار کیوں کیا؟ پھر یہ خیال بھی آتا تھا کہ شبانہ اس قدر تنگ آ چکی ہوگی کہ اس نے عظیم کو مجبور کر دیا ہو گا کہ وہ اس کو اس جہنم سے نکالے۔ بہر حال یہی تو میں نے معلوم کرنا تھا کہ لڑکی کہاں غائب ہوگئی ہے۔

ٹھیکیدار کی پہلی بیوی کے دونوں بھائی آئے ہوئے تھے، میں دونو بھائیوں کی الگ الگ تفتیش نہیں لکھوں گا، ان سے میں نے ایک ہی طرح کے سوال پوچھے تھے اور ان کے جواب بھی ایک ہی جیسے تھے۔

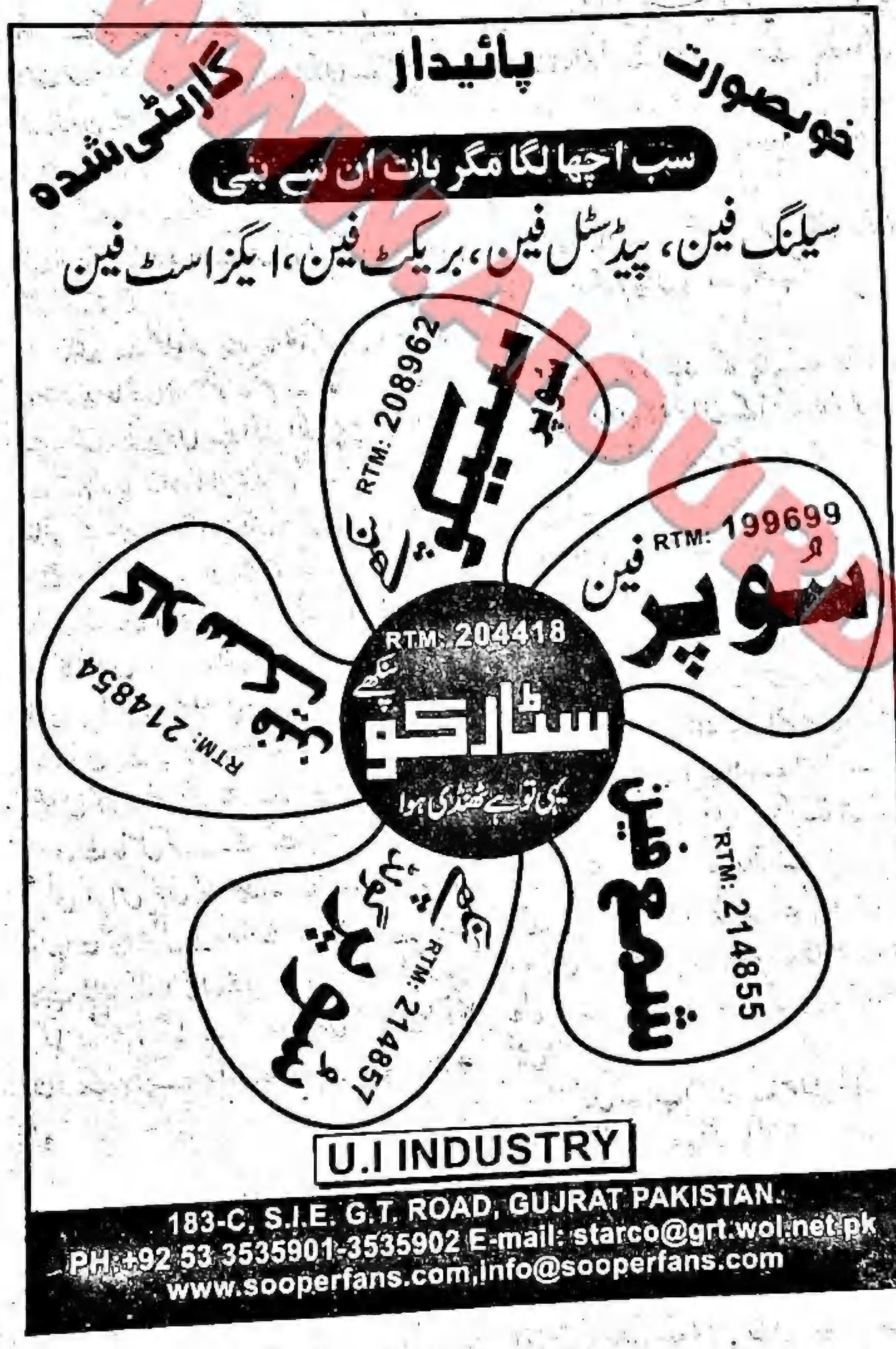

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دونوں نے کہا کہ انہوں نے ٹھیکیدار کی دوسری بیوی کو غائب کرنا ہوتا تو پہلے ہی کر دیتے۔ دونوں نے تسلیم کیا کہ کچھ دن پہلے ٹھیکیدار کے ساتھ ان کی تکرار ہوئی تھی اور انہوں نے ٹھیکیدار کو دھمکیاں دی تھیں۔ میں ان کو کہتا تھا کہ وہ اگر یہ حرکت کر بیٹھے ہیں تو لڑکی واپس کر دیں اور میں یہ معاملہ تھانے میں ختم کر دوں گا لیکن وہ نہیں مانتے تھے۔

میں نے ٹھیکیدار سے سنا تھا کہ ان دونوں کا دوستانہ بدمعاشوں اور مشکوک قسم کے اشخاص کے ساتھ ہے۔ میں نے دونوں سے الگ الگ پوچھا تو دونوں نے تسلیم کر لیا کہ ان کا دوستانہ اسی قسم کے اشخاص کے ساتھ ہے لیکن وہ جرائم پیشہ نہیں۔ میں نے ان کے نام پوچھے تو انہوں نے تین نام بتا دیئے۔ میں نے ان دونوں بھائیوں کو باہر الگ الگ بٹھا دیا اور اپنے تین ہیڈ کانسٹیبلوں اور اے ایس آئی وغیرہ سے ان تین آدمیوں کی بابت معلوم کیا۔ ان کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ اشخاص نہیں، پھر بھی میں نے ان تینوں کی بابت معلومات حاصل کرنے کے واسطے کہہ دیا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس کیس کو ڈھیلا نہ چھوڑوں۔ یہ اغوا کی واردات تھی جو قتل کی واردات بھی بن سکتی تھی۔ میں جب شبانہ کے بھائیوں کو فارغ کر چکا تھا تو مجھ کو بتایا گیا کہ عظیم آ گیا ہے۔ عظیم وہ آدمی تھا جس کا فوٹو شبانہ کے پرس سے برآمد ہوا تھا۔ میں نے اس کو بلا لیا۔

پھوکا فائر

"عظیم بھائی!" میں نے اس کو کہا۔ "تم تعلیم یافتہ آدمی ہو، میں تمہاری عزت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے والد صاحب ایڈووکیٹ ہیں، میں ان کو جانتا ہوں، عزت دار آدمی ہیں۔ میں تم کو یہ نصیحت کروں گا کہ سچ بولنا۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی ہے تو وہ بھی صاف صاف بتا دینا۔ جوانی میں انسان الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھتا ہے...... کیا تم کو پتہ ہے کہ شبانہ لاپتہ ہو گئی ہے، تم شبانہ کو جانتے ہو؟"

"ہاں صاحب!" عظیم نے کہا۔ "میں شبانہ کو جانتا ہوں اور مجھ کو یہ بھی پتہ لگ چکا ہے کہ شبانہ لاپتہ ہے"۔

"تمہارا یہ فوٹو شبانہ کے پرس سے برآمد ہوا ہے"۔ میں نے اس کا فوٹو اس کے آگے رکھ کر پوچھا۔ "شبانہ کے ساتھ تمہارے مراسم بڑے گہرے معلوم ہوتے ہیں"۔

"بہت گہرے صاحب!" اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے پرس نکالتے ہوئے کہا۔ "شبانہ کا فوٹو میرے پاس ہے"۔ اس نے شبانہ کا فوٹو پرس سے نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور کہنے لگا۔ "میں نے یہ فوٹو اپنے کیمرے سے لیا تھا...... شبانہ کے ساتھ میری اسی قسم کی محبت تھی جس محبت کے آپ افسانے پڑھا کرتے ہیں اور جو محبت آپ فلموں میں بھی دیکھا کرتے ہیں"۔

"عظیم یار!" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "فلمی محبت اچھی تو نہیں ہوتی، ہیروئن گم ہو جاتی ہے ہیرو جان کی بازی لگا کر اس کو زمین کی تہوں سے نکال کر لے آتا ہے۔ کیا تم بھی ایسے ہی ہیرو نہیں؟"

"نہیں صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "ہماری محبت فلموں جیسی نہیں، یہ ایک پاکیزہ محبت ہے۔ میرے کہنے پر میرے والدین نے شبانہ کا رشتہ مانگا تھا شبانہ کی ماں نے انکار کر دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عورت امیر بننے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس عورت نے اپنی بیٹی کو شادی کے نام پر بیچ دیا ہے...... میں جانتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس مقصد کے لئے طلب کیا ہے کہ شبانہ کی گمشدگی میں میرا ہاتھ ہو سکتا ہے"۔

"ہاں عظیم!" میں نے کہا۔ "یہ قدرتی بات ہے، گمشدہ لڑکی کے پرس سے تمہارا فوٹو برآمد ہوا تو تم پر شبہ ہو گیا کہ لڑکی کو تم لے گئے ہو۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہو گے؟"

"آپ خود غور کریں صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "اس کو اغوا کر کے میں رکھتا کہاں؟ میں اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جو نہیں ہو سکی۔ میں اب بھی چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ شادی ہو جائے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ بوڑھا ٹھیکیدار اس کو طلاق دے دے۔ لڑکی کو اس کے خاوند کے گھر سے بھگا لے جانے سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ شادی بھی نہیں ہو سکتی۔ شادی کے واسطے ضروری ہے کہ خاوند اس کو طلاق دے دے۔ آپ یہ بھی سوچیں صاحب کہ میں جیسا کہ آپ نے خود بھی کہا ہے کہ ایک عزت دار ایڈووکیٹ کا بیٹا ہوں۔ میرے والد صاحب مجھ کو بھی وکالت میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے ایل ایل بی کی سٹڈی شروع کر دی ہے۔ والد صاحب نے میرے واسطے ایک اور جگہ پیدا کر لی ہے۔ وہ مجھ کو اس دفتر سے نکلوا کر سیشن کورٹ میں سٹینو لگوانا چاہتے ہیں تاکہ مجھے کورٹوں کا اور کیسوں کا تجربہ حاصل ہو جائے۔ مجھے اس کا بہت رنج ہے کہ شبانہ کے ساتھ میری شادی نہیں ہوئی لیکن میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ شبانہ کو بھگا کر اپنے اتنے معزز خاندان کو بدنام کر دوں"۔

"کیا تم نے شبانہ کی محبت اپنے دل سے نکال دی ہے؟"

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "ہماری محبت ایسی نہیں جو دل سے نکل جائے"۔

"پھر تو شادی کے بعد بھی تم اسے ملتے رہتے ہو گے؟"

"ہاں صاحب!" اس نے جواب دیا۔ "وہ جب بھی اپنے گھر آتی تھی تو میری اس کے ساتھ الگ بیٹھ کر ملاقات ہوتی تھی۔ یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ ہم کس طرح ملتے تھے اور کہاں کہاں ملتے تھے...... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ دو مرتبہ میں رات کو اس کے خاوند کے گھر جا کر بھی ملا تھا۔ اس کو میں نے پہلے بتایا ہوا تھا۔ اس وقت اس نے دروازہ کھول دیا اور میں اندر چلا گیا۔ آپ شاید یقین نہیں کریں گے کہ ہماری یہ ملاقاتیں گناہ سے پاک تھیں"۔

"اپنے خاوند اور اپنی ازدواجی زندگی کی بابت وہ کیا بتاتی تھی؟"

"روتی تھی"۔ اس نے جواب دیا۔ "کہتی تھی کہ اللہ نے معلوم نہیں کس گناہ کی سزا دی ہے۔ وہ تو اپنی ماں کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اپنے خاوند کو تو اس نے نچانا شروع کر دیا تھا۔ میں آپ کو یہ بات بھی صاف صاف بتا دیتا ہوں کہ مجھ کو بھی بہت غصہ تھا۔ میں شبانہ کو بتاتا رہتا تھا کہ وہ اس طرح ٹھیکیدار کو تنگ کرتی رہے تاکہ وہ تنگ آ کر شبانہ کو طلاق دے دے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ ٹھیکیدار اس کو طلاق دے اور میں اس کے ساتھ شادی کروں"۔

"کیا شبانہ پردہ نشین لڑکیوں کی طرح سادہ لڑکی تھی یا ہوشیار اور چالاک تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں غلط قسم کی چالاکی ذرا جتنی بھی نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "اور اس میں ایسی سادگی بھی نہیں کہ خاموشی سے ظلم برداشت کرتی رہے۔ عقل والی اور جرأت والی لڑکی ہے۔ وہ مجھ کو بتاتی رہتی تھی کہ ٹھیکیدار کو وہ کس طرح تنگ کر رہی ہے۔ آخری بار اس نے بتایا تھا کہ ٹھیکیدار اس سے بہت ہی تنگ آ چکا ہے، یہاں تک

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تک کہ ایک روز ٹھیکیدار نے اس کو تھپڑ مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو شبانہ نے اپنی جوتی ہاتھ میں لے لی اور اس کو کہا کہ اس پر اس نے ہاتھ اٹھایا تو وہ اس کے منہ پر جوتی مارے گی"۔

عظیم نے وہ سارے طریقے بتائے جو شبانہ ٹھیکیدار کو تنگ کرنے کے لئے اختیار کرتی تھی۔ ان میں دو طریقے ایسے تھے جو کوئی بھی خاوند برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک یہ کہ دوسرے تیسرے دن وہ اس طرح کی حرکت کرتی تھی کہ ٹھیکیدار کے گھر آنے کا وقت ہوتا تو شبانہ شاپنگ کے بہانے گھر سے نکل جاتی۔ دوسرا طریقہ تو ہر مرد کے واسطے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ شبانہ نے ٹھیکیدار کو خاوند کا درجہ دینا عملی طور پر چھوڑ دیا تھا۔ شبانہ کے میں نے فوٹو دیکھے تھے۔ وہ جتنی جوان تھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ ایسی دلکش لڑکی اگر اپنے خاوند کے ہاتھ نہ آئے اور حق زوجیت ادا کرنے سے انکاری ہو جائے تو خاوند مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔

"کیا شبانہ نے کبھی خاوند کے گھر سے اکیلے ہی بھاگ جانے کا یا خودکشی کر لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھی جب وہ بہت ہی تنگ آ جاتی تھی تو کہتی تھی کہ اس زندگی سے مر جانا ہی بہتر ہے"۔ عظیم نے جواب دیا۔ "میں اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا اور میں نے اس کو ایک وظیفہ بتایا تھا کہ ہر نماز کے بعد یہ وظیفہ کرتی رہے، جو وہ بتاتی تھی کہ کر رہی ہے۔ میں نے خود بھی کچھ دنوں سے ایک وظیفہ شروع کیا ہوا ہے۔ اب شبانہ لاپتہ ہو گئی ہے تو میں مایوس ہو گیا ہوں لیکن عقیدے کے مطابق دل کو تسلی دیتا ہوں کہ اللہ کے کرم سے مایوس ہونا گناہ ہے۔ میں نے وظیفہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اگر شبانہ زندہ ہے تو مجھے اللہ کی بارگاہ میں پوری امید ہے کہ وہ اب اپنے خاوند کو نہیں بلکہ مجھے مل جائے گی"۔

میں اس شخص سے متاثر ہو گیا۔ جھوٹ تو ہر ملزم بولتا ہے لیکن تفتیشی افسر گہری نظر سے دیکھے تو صاف پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ شخص سچ نہیں بول رہا۔ تجربہ ہو تو بولنے والے کے انداز سے اور اس کے چہرے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جھوٹ کہہ رہا ہے یا سچ۔ عظیم کے ساتھ میری بہت زیادہ بات چیت ہوتی تھی۔ میں نے آپ کو تھوڑی باتیں سنائی ہیں۔

عظیم سے مجھے یہ پتہ لگا کہ شبانہ اپنے خاوند سے تنگ تھی اور ان دونوں کے درمیان عداوت کی دیوار کھڑی ہو گئی تھی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شبانہ اپنے ماں باپ سے بھی تعلق توڑ چکی تھی۔ اس سے مجھے یہ شبہ ہوا کہ شبانہ نے کہیں جا کر خودکشی کر لی ہو گی۔ عظیم کو میں نے اس معاملے میں بری پایا پھر بھی اپنے ذہن میں اس پر شبہ قائم رکھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ٹھیکیدار کی پہلی بیوی کے بھائی کس قسم کے اشخاص ہیں۔

"بیکار اور کھوکھلے آدمی ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "دونوں بھائی پھوکے فائر کرتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں۔ فضول اور بے غیرت لوگوں کے ساتھ ان کا یارانہ ہے"۔

لڑکی کا چہرہ شناسا تھا۔

میں عظیم کو فارغ کرنے ہی والا تھا کہ اے ایس آئی اندر آیا اور اس نے بتایا کہ ایک ایڈووکیٹ صاحب آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے بیٹے کو شامل تفتیش کیا گیا ہے۔ میں نے اسی وقت اس کو اندر بلا لیا اور اٹھ کر ملا، اس کو بٹھایا۔ وہ عظیم کا باپ تھا اور پریشانی کی حالت میں آیا تھا۔ اس کو ہائی کورٹ میں کسی نے بتایا

تھا کہ اس کے بیٹے کو شبانہ کی گمشدگی کی تفتیش میں تھانے میں طلب کیا گیا ہے۔ اس کو بجا طور پر اپنے بیٹے کا غم تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ اس کے بیٹے کو کس بناء پر شامل تفتیش کیا گیا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا فوٹو دیکھا تو کچھ پریشان ہو گیا۔ میں نے اس کو تسلی دی کہ اپنے بیٹے کے بارے میں اس کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے خلاف میرے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ میں نے عظیم کو باہر بھیج دیا۔ یہ اچھا سبب تھا کہ ایک ایسا لائق ایڈووکیٹ میرے پاس آ گیا تھا جو شبانہ اور اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے شبانہ کی گمشدگی کی بابت اس کو تفصیل بتا کر پوچھا کہ اس کی رائے کیا ہے۔

"میں شبانہ کو ہمیشہ ایک شریف لڑکی سمجھتا رہا ہوں"۔ عظیم کے باپ نے کہا۔ "اس کی شرافت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے ہی میں نے اپنے بیٹے کے واسطے اس لڑکی کو پسند کیا تھا لیکن لڑکی کی ماں کو کوئی شریف اور معزز گھر پسند نہیں تھا، وہ تو لڑکی کا سودا کرنا چاہتی تھی جو اس نے کر لیا۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ لڑکی خود کسی کے ساتھ نہیں گئی، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر تنگ آ چکی ہو کہ پاگل پن میں باہر نکل گئی ہو اور کسی بدمعاش کے ہاتھ لگ گئی ہو۔ آپ دوسرے تھانوں میں اشتہار شور و غوغا فوراً بھجوا دیں۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ لڑکی اس طرح نکلی ہے جس طرح میں نے بیان کیا ہے یا وہ خودکشی کے ارادے سے نکلی تھی جو اس نے کر لی ہو گی۔ اگر وہ دریا میں کودی ہے تو پھر اس کی لاش کچھ دنوں بعد ہی ملے گی اور یہ بھی اتفاق کی بات ہو گی کہ لاش مل جائے"۔

میں اس ایڈووکیٹ کے ساتھ کچھ دیر تک تبادلہ خیالات کرتا رہا لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ایڈووکیٹ اپنے بیٹے عظیم کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

مزید دو دن تفتیش اور مختلف اشخاص سے پوچھ گچھ جاری رہی۔ مخبروں نے عظیم کی بابت بڑی صاف رپورٹ دی۔ ٹھیکیدار کی بابت یہ رپورٹ ملی کہ انتہائی بدمعاش اور بدکردار آدمی ہے۔ یہ بھی پتہ لگا کہ دو ایسے اشخاص اس نے اپنی مٹھی میں بند رکھے ہوئے ہیں جو سزا یافتہ بھی ہیں۔ یہ اسی شہر کے ایک اور تھانے کے ریکارڈ پر تھے جس کو ہم ہسٹری شیٹر کہتے ہیں۔

ٹھیکیدار کی پہلی بیوی کے بھائیوں کی رپورٹ وہی تھی جو عظیم مجھ کو پہلے دے چکا تھا کہ پھوکے فائر کرنے والے آدمی ہیں۔ یہ شبہ بھی ظاہر کیا گیا کہ دونوں ٹھیکیدار کا مال بھی کھاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ واردات کی رات یہ دونوں بھائی گھر میں موجود تھے۔ ان کی دوستی جن بدمعاشوں اور مشکوک چال چلن کے اشخاص کے ساتھ بتائی گئی تھی وہ گھٹیا قسم کے بدمعاش تھے جو زیادہ سے زیادہ یہ بدمعاشی کرتے تھے کہ چرس کا کش لگا کر گلیوں میں بڑھکیں مارتے پھرتے تھے۔

غالباً چوتھا دن تھا، وقت شاید صبح کے دس ساڑھے دس کا تھا۔ ایک اے ایس آئی جس کے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا، ایک جوان لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے میرے تھانے میں آیا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، یہ تینوں میرے دفتر میں داخل ہوئے تو میری نظر سب سے پہلے لڑکی کے چہرے پر گئی، مجھ کو چہرہ اس طرح لگا کہ پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ میں نے ان کو بٹھایا۔ کانسٹیبل باہر نکل گیا۔ مجھے خیال آیا کہ اس چہرے کا فوٹو میرے پاس ہے، میں نے دراز میں سے شبانہ کا فوٹو نکالا۔

"انسپکٹر صاحب!" اے ایس آئی نے کہا۔ "یہ لڑکی اپنا نام شبانہ بتاتی ہے اور اس نے بیان دیا ہے کہ اس کو گھر سے زبردستی رات کے وقت اٹھایا گیا تھا"۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اسے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایس آئی نے لڑکی کا تحریری بیان جو راولپنڈی پولیس ہیڈ کوارٹر میں لیا گیا تھا، میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے اپنی تسلی کے واسطے ضروری سمجھا کہ میں خود شبانہ کا بیان لوں۔ اس کے بعد اس بیان کو اس کے تحریری بیان کے ساتھ ملا کر دیکھوں۔ میں نے اے ایس آئی کو باہر بٹھا دیا اور محرر ہیڈ کانسٹیبل کو کہا کہ اس کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ اے ایس آئی راولپنڈی سے آیا تھا۔

میں نے اس کے باہر جانے کے بعد شبانہ سے پوچھا کہ اس کے باپ اور اس کے خاوند کے نام کیا ہیں۔ اس نے دونوں نام بتا دیے۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ ٹھیکیدار اور شبانہ کے باپ کو فوراً تھانے بلایا جائے تا کہ وہ لڑکی کو شناخت کریں۔

میرے کہنے پر شبانہ نے اپنا بیان دینا شروع کیا۔

بری امام کے میلے پر

اس نے جو بیان دیا وہ میں اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔ پہلے تو اس نے بتایا کہ ٹھیکیدار کے ساتھ اس کی شادی کس طرح ہوئی۔ یہ وہی باتیں ہیں جو میں پہلے دوسروں کی زبانی سنا چکا ہوں۔ پھر اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ ٹھیکیدار سے کتنی تنگ تھی۔

"تم بھی تو اس کو بہت تنگ کرتی تھیں"۔ میں نے کہا۔

"میں خود تنگ آئی ہوئی تھی" اس نے کہا۔ "میں نے تو اس کو اپنا خاوند مانا ہی نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کو ایک منٹ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی"۔

اس کے اغوا کی رات کا قصہ اس کی زبانی اس طرح سامنے آیا کہ اس رات ٹھیکیدار اپنی پہلی بیوی کے گھر گیا ہوا تھا اور اس نے رات وہیں گزارنی تھی۔ شبانہ سوئی ہوئی تھی، اس کو کھٹکا سا سنائی دیا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں زیرو کا بلب روشن تھا، شبانہ نے دیکھا کہ کھڑکی کے پردے میں سے ایک آدمی سامنے آیا۔ شبانہ اٹھ کر بیٹھ گئی، کمرے کا دروازہ بالکل قریب تھا۔ اس شخص نے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ شبانہ پردہ دار لڑکی تھی، وہ اتنی زیادہ خوفزدہ ہو گئی کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی۔

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی اندر آئے۔ ان تینوں آدمیوں کے چہرے صافوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ شبانہ پلنگ پر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس نے بڑی زور سے اپنے نوکر کو آواز دی۔ ایک آدمی نے اس کو کہا کہ وہ چپ رہے ورنہ اس کو جان سے مار دیا جائے گا۔ دو آدمیوں نے اس کے بازوؤں کو پکڑا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں سمجھ گیا کہ اس طرح پکڑنے سے اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئی ہوں گی۔ ان کے ٹکڑے مجھے پلنگ سے ملے تھے۔

ان اشخاص نے شبانہ کو اس طرح پلنگ سے کھینچا کہ وہ فرش پر گر پڑی۔ ایک آدمی نے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا۔ پھر تینوں نے اس کو اٹھایا۔ دو کے پاس لمبے لمبے کھلے ہوئے چاقو تھے۔ ایک نے چاقو کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھی۔ دوسرے نے چاقو کی نوک اس کے پہلو میں چبھوئی اور اس کو کہا کہ اس نے زبان کھولی تو اس کا پیٹ چاک کر دیا جائے گا اور اس کی شہ رگ بھی کاٹ دی جائے گی۔ شبانہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اس پر اتنی دہشت پڑی کہ اس کو غشی آنے لگی۔ اس کو یاد تھا کہ اس کو باہر لے گئے۔ مکان کے ایک طرف سڑک تھی۔ وہاں ایک تانگہ کھڑا تھا۔ شبانہ کو [illegible] کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور ان آدمیوں نے اس کے اوپر ایک کمبل ڈال دیا۔ دو آدمی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ ایک آدمی تانگے والے کے

ساتھ آگے بیٹھا۔

تانگہ چل پڑا۔ شبانہ پر کمبل اس طرح ڈال دیا گیا تھا کہ جس طرح گھونگھٹ نکال جاتا ہے، اس کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ تانگہ کدھر جا رہا ہے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد تانگہ رکا۔ شبانہ کو اتارا گیا اور اس کو ایک مکان کے اندر لے گئے۔ ان تینوں نے اس پر مجرمانہ حملے کئے۔ وہ خوف اور تشدد کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ دوسرے دن وہ ہوش میں تھی تو اس کو کھانا وغیرہ کھلایا گیا۔ ان تینوں نے دن کو بھی شبانہ کو تشدد کا نشانہ بنائے رکھا۔ شبانہ کی یہ رات اور اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔

پھر جو رات آئی تو شبانہ کو باہر نکالا گیا۔ اس پر کمبل پڑا ہوا تھا۔ اس کو اغوا کرنے والے قتل کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اس کو پیدل چلاتے ہوئے ایک جگہ لے گئے اور اٹھا کر اوپر بٹھا دیا۔ تب اس نے دیکھا کہ یہ ایک ٹرک ہے۔ اس میں کچھ سامان وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ ٹرک کا پیچھے والا تختہ چڑھا دیا گیا اور ٹرک چل پڑا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا اور صبح سے پہلے پہلے ایک جگہ پہنچا۔ شبانہ کو صرف یہ محسوس ہوتا رہا کہ کوئی پتھریلی جگہ ہے اور یہاں کوئی آبادی نہیں لیکن ارد گرد لوگ موجود تھے۔

میں آپ کو پہلے ہی بتا دیتا ہوں کہ یہ جگہ نور پور شاہاں تھی جہاں راولپنڈی کا مشہور بری امام کا میلہ لگا کرتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اس میلے یا عرس کے اور طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔ اُن وقتوں کے لوگوں کو یاد ہو گا کہ پاکستان بننے سے پہلے بری امام کا سالانہ میلہ دراصل بڑے پیمانے کے جوئے بازوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے نامی گرامی جوئے باز اور بٹیر باز جمع ہوتے تھے بلکہ انڈیا کے مختلف حصوں کے جوئے باز بھی وہاں پہنچ جاتے تھے۔ صوبہ سرحد اور پنجاب کی طوائفیں اور ناچنے گانے والیاں بھی وہاں آ کر ڈیرے ڈال دیتی تھیں۔

یہ جگہ اسلام آباد اور مارگلہ کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ اس وقت اسلام آباد نہیں ہوتا تھا۔ یہ تمام علاقہ دور دور سے آئے ہوئے لوگوں سے گنجان آباد ہو جاتا تھا۔ خیمے لگتے تھے۔ بردہ فروش عورتوں اور طوائفوں کی خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ گانے اور ناچنے والیاں خوب کماتی تھیں۔ بٹیروں کی لڑائیوں پر ہزارہا روپوں کی بازیاں لگتی تھیں۔ کوئی روک رکاوٹ نہیں تھی نہ کوئی باز پرس تھی۔ پولیس کی نفری کافی تعداد میں موجود ہوتی تھی۔ وہ دنگا فساد نہیں ہونے دیتی تھی یا وہ کسی جرم کے مجرموں کو اس وقت پکڑتی تھی جب پولیس کو باقاعدہ رپورٹ ملتی تھی۔ یہ میلہ کئی دن لگا رہتا اور جوئے بازی میں لکھوکھہا روپیہ جیتا اور ہارا جاتا تھا۔

شبانہ کو اغوا کرنے والے اس کو اس میلے میں لے گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اس کو بیچنے کے واسطے لے گئے تھے۔ اس کو انہوں نے ایک خیمے میں رکھا۔ دن کے وقت گاہک آتے رہے اور شبانہ کو دیکھتے رہے۔ شبانہ کو معلوم نہیں تھا کہ اس کی حیثیت بھیڑ بکری جیسی ہو گئی ہے اور وہ جو ایک ایک دو دو آدمی خیمے میں آتے اور اس کو دیکھتے تھے، اس کے خریدار تھے۔ یہ میں جانتا تھا کہ اس کا سودا طے نہیں ہو رہا تھا۔

رات کو یہ تینوں آدمی خیمے میں کھانا کھانے لگے تو انہوں نے ساتھ شراب بھی رکھ لی۔ وہ شاید زیادہ پی گئے ہوں گے۔ وہ جھومنے لگے اور ننگی باتیں کرنے لگے۔ یہ تینوں بے وقوف تھے کہ اغوا کی ہوئی لڑکی کو ساتھ رکھ کر شراب سے اپنے ہوش گم کر رہے تھے۔ ان کو بیدار اور ہوشیار رہنا چاہئے تھا۔ وہ پیتے رہے، ان میں سے ایک اٹھ کر شبانہ کی طرف چلا لیکن وہ قدم اٹھاتا تو اس کو پتہ بھی نہیں لگتا تھا کہ قدم کہاں رکھے۔ اس نے دو قدم اٹھائے اور گر پڑا۔ دوسرے دونوں کا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھی یہی حال تھا۔

شبانہ نے اپنے بیان میں کہا کہ تینوں بے ہوش ہو گئے۔ میرے پوچھنے پر شبانہ نے بتایا کہ میلے میں پہنچ کر تینوں نے اپنے چہرے بے نقاب کر دیئے تھے اور وہ سمجھتے ہوں گے کہ ان کا جرم مکمل ہو گیا ہے اور اب مال کی قیمت وصول کرنی ہے۔ خیمے میں لالٹین جل رہی تھی۔ یہ خیمہ اور بستر وغیرہ کرائے کے تھے۔ شبانہ نے دیکھا کہ تینوں بے ہوش ہو گئے ہیں تو اس نے وہی کمبل اپنے اوپر لے لیا جو اس کو اغوا کرنے والے اس کے اوپر ڈال کر لائے تھے۔ وہ خیمے سے نکل گئی۔

نوکر مشکوک تھا

اس نے باہر جا کر دیکھا تو اس کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہاں بہت سے لوگ تھے، روشنیاں تھیں، پیٹرو میکس لیپ جل رہے تھے، قوالیاں ہو رہی تھیں، مجرے بھی ہو رہے تھے، لوگوں کا شور وغل سنائی دے رہا تھا۔ شبانہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہاں مکان نہیں تھے، درخت بے شمار تھے۔ شبانہ نے وہاں کا منظر بیان کیا جو اس کے لئے ڈراؤنا تھا۔ وہ واپس خیمے میں تو جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے اب بھاگنا ضروری تھا۔ اس کو بہت اچھا موقع مل گیا تھا مگر اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جائے کہاں۔

اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اللہ سے مدد مانگنی شروع کر دی۔ اس کو آیت الکرسی، سورہ مزمل اور سورہ رحمٰن زبانی یاد تھیں جو اس نے پڑھیں اور دل ہی دل میں دعا کیا۔ اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو کسی بھی طرف منہ کر کے بھاگ جاتا۔ وہ پہاڑی علاقہ تھا، چھپ چھپ کر نکل جانے کے واسطے علاقہ بہت اچھا تھا لیکن پردہ نشین لڑکی ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس علاقے سے واقف بھی نہیں تھی۔

وہ اس خیمے سے دور چلی گئی جس سے وہ فرار ہوئی تھی۔ اس کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس خیمے سے نکل کر بھی کتنے بڑے خطرے میں ہے۔ وہاں رات کے وقت جوئے باز، بردہ فروش، طوائفوں کے دلال شرابی، چرسی اور جرائم پیشہ لوگوں کے سوا کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ اگر اس کو اس خطرے کا علم ہو جاتا تو وہ اسی سے بے ہوش ہو جاتی۔

اللہ کا ہاتھ اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ اس ہنگامے سے دور ہٹتی گئی۔ اس نے ٹھوکریں کھائیں، ایک دو ڈھلوانوں سے اتری اور آگے جا کر اوپر چڑھی۔ اس کو کچھ دور آگے روشنی دکھائی دی، وہ وہاں تک پہنچ گئی۔ یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا، باہر دو آدمی آگ جلا کر بیٹھے ہوئے تھے، شبانہ نے اسی آگ کی روشنی کو دیکھا تھا۔

شبانہ اپنے سر سے کمبل اتار کر رو پڑی اور ان دونوں کو بتایا کہ اس کو تین آدمی اغوا کر کے یہاں لے آئے تھے اور وہ وہاں سے بھاگ آئی ہے۔ یہ دونوں پہلے تو اس کو ٹالنے لگے لیکن شبانہ کا رونا دیکھ کر ایک نے دوسرے کو کہا کہ مولوی صاحب کو جگاتے ہیں۔ دوسرا آدمی اٹھا اور ایک دروازے پر دستک دی۔

یہ گاؤں کی مسجد کے مولوی کا گھر تھا۔ وہ باہر آیا تو ان آدمیوں نے شبانہ کو اس کے پاس لے جا کر بتایا کہ یہ لڑکی کیا کہتی ہے۔ شبانہ نے مولوی کو دیکھا تو پہلے سے زیادہ رونا شروع کر دیا اور رو رو کر بتایا کہ وہ پردہ دار لڑکی ہے۔ اس کی جس طرح شادی ہوئی تھی، اس نے وہ بھی سنائی اور اپنے اغوا کی کہانی بھی سنائی۔ مولوی کو متاثر کرنے کی غرض سے اس نے قرآن کی آیات پڑھنی شروع کر دیں اور اس پر ظاہر کیا کہ صوم صلوٰۃ کی پابند لڑکی ہے۔

مولوی اس کو لے گیا اور اپنی بیوی کو شبانہ کے

بارے میں بتایا۔ اس نے کہا کہ اس وقت راجا صاحب کو جگانا مناسب نہیں، وہ ناراض ہوں گے۔ صبح ان کو مسجد میں بتائیں گے۔

اغوا کے بعد شبانہ نے پہلی رات آرام اور سکون سے گزاری۔ صبح مولوی کی بیوی نے اس کو نہانے کے لئے گرم پانی دیا۔ فجر کی نماز کے بعد دو معزز قسم کے ادھیڑ عمر آدمی مولوی کے گھر آئے اور انہوں نے شبانہ کے ساتھ بات چیت کی۔ شبانہ نے اپنی بپتا پھر سنا دی اور ان معززین کو اپنے شہر کا نام بتا کر اپنے خاوند اور اپنے باپ کے نام اور ایڈریس بتائے۔

یہ دونوں تھے تو تقریباً ان پڑھ دیہاتی لیکن انہوں نے جو کارروائی کی وہ دانشمندوں والی کی۔ ان دونوں کو بعد میں بطور گواہان طلب کیا گیا تو ان کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کو پولیس کے سپرد کرنا تھا۔ نزدیکی پولیس بری امام کے میلے کی تھی لیکن لڑکی کو وہاں لے جانے میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ لڑکی کو اغوا کرنے والے مل سکتے تھے۔ خطرہ تھا کہ وہ چاقو، خنجر یا ریوالور نکال کر ان سے لڑکی کو چھین لیں گے۔

گاؤں کے دو آدمی آ گئے، انہوں نے بھی مشورے دیئے، آخر فیصلہ ہوا کہ لڑکی کو راولپنڈی شہر لے جایا جائے اور کسی تھانے کے سپرد کر دیا جائے۔ وہ ایک تانگہ لے آئے۔ تین معزز آدمی شبانہ کے ساتھ تانگے میں بیٹھے اور سٹی پولیس سٹیشن جا پہنچے۔ وہاں کے ایس ایچ او نے واردات سنی تو ڈی ایس پی سے ٹیلی فون پر بات کی۔ اوپر سے فیصلہ ہوا کہ لڑکی کو ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر بھیج دیا جائے۔

اس طرح شبانہ ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچی جہاں اس کا بیان قلمبند کیا گیا اور اس کو اس کے آبائی شہر میں میرے پولیس سٹیشن میں لے آئے۔

میں نے شبانہ کا وہ بیان پڑھا جو اس نے راولپنڈی میں دیا تھا اس میں اور مجھے دیئے ہوئے بیان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں نے راولپنڈی سے آئے ہوئے اے ایس آئی کو شبانہ کی وصولی دے کر فارغ کر دیا۔ اس سے میں نے ان اشخاص کے ایڈریس بھی لے لئے تھے جن کے پاس شبانہ گاؤں میں پہنچی تھی اور وہ اس کو راولپنڈی پولیس کے پاس لے گئے تھے۔

اگر شبانہ خود گھر سے گئی ہوتی تو میں اس کا بیان لے کر اس کو اس کے خاوند کے حوالے کر دیتا لیکن یہ جبری اغوا کی واردات تھی۔ میں اس کمرے کو اندر سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا جس میں سے شبانہ کو اٹھایا گیا تھا۔ وہاں جبری اغوا کے آثار بالکل صاف تھے۔ پلنگ پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے، دو رضائیوں کے درمیان شبانہ کا دوپٹہ، پلنگ کے پاس گھر میں پہننے والی چپلیاں۔ مجھے اس واردات کی تفتیش کرنی تھی۔

اب مجھے یاد آیا کہ کمرے کی کھڑکی کو میں نے کھلا ہوا پایا تھا اور کھڑکی کی دہلیز پر مٹی کا ایسا نشان دیکھا تھا جیسے کسی نے یہاں پاؤں رکھا ہو۔ یہ ننگے پاؤں کا نشان نہیں بلکہ کسی کی جوتی کا تھا۔ شبانہ نے بیان میں کہا کہ ایک آدمی کھڑکی میں سے اندر آیا تھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اس کو کہا کہ وہ ٹھیکیدار کے نوکر کو ساتھ لے آئے۔

"کیا تمہارے سونے والے کمرے کی کھڑکی رات کو کھلی رہتی تھی؟" میں نے شبانہ سے پوچھا۔

"نہیں جی!" اس نے جواب دیا۔ "دن کو نوکر کھڑکی کھولا کرتا اور شام کو بند کر دیتا تھا"۔

"کیا تم رات کو دیکھا کرتی تھیں کہ کھڑکی بند ہے؟"

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ کام نوکر کا تھا،

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس نے کھڑکی کبھی کھلی نہیں چھوڑی تھی"۔

"نوکر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم اس کو قابل اعتبار سمجھتی ہو؟"

"شیخ صاحب (خاوند) کو تو اس پر اعتبار ہے لیکن مجھے یہ آدمی کبھی بھی اچھا نہیں لگا"۔ شبانہ نے جواب دیا۔

"کوئی خاص وجہ؟"

"میں ایسے محسوس کرتی تھی جیسے اس نوکر کا میرے اوپر پہرہ لگایا ہوا ہے"۔ شبانہ نے کہا۔ "ویسے میرے ساتھ ٹھیک رہتا تھا"۔

"اچھا پہرہ دیتا تھا کہ تم کو ان تین آدمیوں نے پکڑا اور تم نے نوکر کو آواز دی اور وہ تمہاری مدد کو آیا ہی نہیں"۔ میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ "کیا وہ تمہارے کمرے سے دور کسی کمرے میں سوتا تھا؟"

"اس کا کمرہ تو ذرا دور ہی ہے"۔ شبانہ نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خاوند جس رات گھر نہیں ہوتا تھا اس رات نوکر باورچی خانے میں سوتا تھا۔ اس رات بھی وہ باورچی خانے میں سویا تھا۔ باورچی خانہ میرے کمرے کے قریب ہے"۔

"میرا خیال ہے وہ نشہ کرتا ہے"۔ میں نے کہا۔ "اور رات کو بے ہوشی کی نیند سوتا ہے۔ عظیم تمہارے پاس گھر میں آتا رہا ہے اور نوکر کو پتہ نہیں لگا"۔

شبانہ اس طرح چونکی جیسے میں نے اس کو سوئی چبھو دی ہو۔

"حیران مت ہو شبانہ!" میں نے کہا۔ "تمہارے پرس سے عظیم کا فوٹو نکلا تھا، میں نے عظیم کا بیان لیا ہے، اس نے بڑا اچھا بیان دیا ہے اور اس نے مجھے ساری باتیں بتائی ہیں۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم اپنے خاوند کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی تھیں؟"

میں نے اس کو عظیم کے بیان کی کچھ ضروری باتیں سنائیں اور اس کو یہ یقین دلایا کہ اس پر کوئی الزام نہیں۔ اس کا حوصلہ بڑھا تو اس نے عظیم کے بیان کی تصدیق کر دی اور اس کے آنسو نکل آئے۔ میں اس کے ساتھ نوکر کے پہرے کی بات کر رہا تھا۔

"عظیم نے شاید آپ کو ایک بات نہیں بتائی"۔ اس نے میرے ہمدردانہ رویے سے متاثر ہو کر کہا۔ "ایک رات عظیم پہلی بار میرے پاس آیا تو نوکر کو پتہ نہیں لگا۔ دوسری بار عظیم آیا تو نوکر نے دیکھ لیا۔ میں نے اس کو بیس روپے دیئے اور دس روپے اس کو عظیم نے دیئے۔ وہ خوش ہو گیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تیسری بار عظیم آیا تو میں نوکر کے کمرے میں گئی اور اس کو جگا کر تیس روپے دیئے۔ اس نے روپے لے کر کہا۔ "کیوں شرمندہ کرتی ہیں بی بی جی! یہ خیال رکھنا وہ جلدی چلا جائے"۔

اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ نوکر کیسی ذہنیت کا آدمی ہے۔

کون سا سچ؟

شبانہ کا باپ اور ٹھیکیدار آ گئے تھے۔ میں نے ان کو بلا کر شبانہ دکھائی۔ انہوں نے شناخت کر کے کہا کہ یہی ان کی گمشدہ لڑکی شبانہ ہے۔ میں نے ان کو باہر جانے کو کہا۔ شبانہ کا باپ تو باہر چلا گیا، اس کا خاوند وہیں رہا۔ اس نے مجھے پوچھا کہ یہ کہاں سے آئی ہے، کیا اس کو کوئی زبردستی لے گیا تھا؟

"ابھی آپ باہر چلے جائیں"۔ میں نے اس کو کہا۔

وہ دروازے کی طرف چلا اور رک کر میری طرف مڑا۔

"میں اس کو گھر لے جاؤں؟" اس نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے یہ مل گئی ہے۔ میری طرف سے آپ

مزید کارروائی بند کر دیں"۔

"آپ باہر کیوں نہیں چلے جاتے!" میں نے اس کو ذرا سخت لہجے میں کہا۔

وہ باہر نکل گیا، میں مزید کارروائی بند نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اغوا کی سنگین واردات تھی۔

کچھ دیر بعد نوکر آ گیا۔ میں نے شبانہ کو الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ نوکر کو اندر بلا کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔

"اگر تم نے جھوٹ بولنا ہے تو تم کو کھلی اجازت ہے"۔ میں نے اس کو کہا۔ "لیکن یہ سوچ لو کہ میرے پاس سچ پہنچ چکا ہے۔ تمہارے واسطے جھوٹ بولنے کی گنجائش ختم ہو چکی ہے"۔

"کون سا سچ جناب عالی؟" اس نے معصوم سے لہجے میں پوچھا۔ "آپ کون سے جھوٹ اور سچ کی بات کر رہے ہیں؟"

میں اس کی "خاطر تواضع" کے واسطے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے پکا شبہ ہو گیا تھا کہ اغوا میں اس کا تعاون شامل تھا۔ اس نے جب معصوم بن کر میری بات کا جواب دیا تو میں نے اس کے پیچھے ہو کر اس کے دائیں طرف منہ پر پوری طاقت سے تھپڑ مارا۔ وہ کرسی سمیت بائیں طرف فرش پر گرا۔ وہ اٹھا تو میں نے اس کو کرسی سیدھی کر کے بیٹھنے کو کہا۔

"تم شیخ صاحب کی بیوی سے پیسے لے کر اس کے گھر میں اس کی ملاقات ایک آدمی سے کراتے رہے ہو"۔ میں نے کہا۔ "کہو یہ جھوٹ ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ تمہاری بی بی تھانے میں آ گئی ہے۔ وہ بیان دے چکی ہے۔ وہ آدمی بھی بیان دے چکا ہے جس نے پہلی بار تم کو دس روپے دیئے تھے اور شبانہ نے تم کو بیس روپے دیئے تھے۔ اپنی زبان سے بولو کہ یہ سچ ہے"۔

"سچ ہے حضور!" اس نے کہا۔ "غریب آدمی ہوں، بیوی بچوں کے پیٹ کس طرح بھروں؟"

"چلو، یہ کوئی جرم نہیں کہ میں تم کو گرفتار کر لوں"۔ میں نے کہا۔ "تم غریب ہو تو میں تم پر رحم کروں گا۔ باقی بھی سچ بتا دو۔ میرے پاس مکمل شہادت آ گئی ہے۔ جھوٹ بولو گے تو یہاں تمہاری ہڈیاں توڑ دی جائیں گی...... فوراً بولو کہ بی بی کے سونے کے کمرے کی کھڑکی تم نے کھلی رکھی تھی اور باہر کا دروازہ بھی تم نے کھولا تھا"۔

وہ چپ چاپ میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے اپنی میز سے قلم اٹھایا اور اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر قلم اس کی درمیانی اور شہادت کی انگلی کے درمیان رکھ کر دونوں انگلیاں اپنے ہاتھ سے دبائیں۔ وہ درد سے تڑپنے لگا۔ میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ اور زیادہ کر دیا۔ وہ تڑپتے ہوئے اٹھا اور رکوع کی پوزیشن میں دوہرا ہو گیا۔ میں نے نیچے سے اپنا گھٹنا اس کے منہ پر مارا جو اس کے ہونٹوں اور ناک پر لگا۔ وہ سیدھا ہو گیا۔

"سچ بولو"۔ میں نے اس کی انگلیوں کو اور زیادہ دبا کر کہا۔ "فوراً بولو...... تم باورچی خانے میں لیٹے ہوئے تھے اور تمہیں بی بی کی آواز نہیں سنائی دی"۔

"بولتا ہوں حضور!" اس نے درد اور اذیت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مر جاؤں گا، میرا ہاتھ چھوڑ دیں"۔

میں نے اپنے ہاتھ کا دباؤ کم کر دیا لیکن ہاتھ چھوڑا نہیں۔ یہ تو بسم اللہ تھی۔ اس طرح انگلیوں میں پنسل یا قلم رکھ کر دبانے کو ہم ایذا رسانی کا الف کہا کرتے تھے۔ یہ شخص اسی میں ڈھیر ہو گیا۔

"ہاں حضور!" اس نے کہا۔ "آپ کو ٹھیک اطلاع ملی ہے"۔

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"میں نے اپنے مالک کا حکم مانا تھا حضور!" اس نے کہا۔ "اب مالک باہر عیش عشرت کرتے پھریں گے اور اندر ہم ہوں گے"۔

"پورا بیان دے دو"۔ میں نے اس کو کہا۔ "میں تم کو بچا لوں گا۔ وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا۔ پہلے ان تین آدمیوں کے نام اور پتے بتاؤ جنہوں نے بی بی کو اغوا کیا تھا"۔

اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اس کو ٹھیکیدار سے بچا لوں گا۔

"حضور!" اس نے کہا۔ "سب سے پہلے تو ٹھیکیدار صاحب کا نام لکھیں۔ اپنی بیگم کو انہوں نے خود اغوا کرایا تھا"۔

"کیا بکتے ہو!" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "تم ہوش میں ہو، کیا اتنا امیر خاوند اپنی بیوی کو بیچنا چاہتا تھا؟"

"بیچنا نہیں چاہتا تھا حضور!" اس نے جواب دیا۔ "قتل کرانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں بی بی زندہ کس طرح آ گئی ہے"۔

"باقی ملزموں کے نام بتاؤ"۔ میں نے کہا۔

اس نے دو نام اسی شہر کے اشخاص کے بتائے۔ تیسرے کو وہ نہیں جانتا تھا۔ میں پہلے بھی یہ دو نام سن چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ٹھیکیدار کچھ جرائم پیشہ اور بدمعاش اشخاص کی پرورش کرتا ہے۔ ان میں یہ دو نام بھی تھے۔ میں باہر نکلا اور اے ایس آئی کو یہ دونوں نام اور ان کے پتے دے کر کہا کہ ان کو گرفتار کرنا ہے لیکن کوئی بھی وردی میں نہ جائے۔ وجہ یہ بتائی کہ یہ دونوں شاید راولپنڈی سے نہیں آئے ہوں گے۔ لڑکی ان کے قبضے سے بھاگ آئی ہے اس واسطے یہ مفرور یا روپوش ہوں گے۔

اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ اس کو راولپنڈی والا اے ایس آئی سارا روقوعہ سنا گیا ہے۔ یہ سن کر میرے اے ایس آئی کو مزید ہدایات کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ ملزمان کو گرفتار کر لے گا۔

میں نے دوسری کارروائی یہ کی کہ شبانہ کے خاوند ٹھیکیدار کو حوالات میں بند کر دیا۔ اس نے بہت شور مچایا، رشوت پیش کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بلینک چیک دوں گا۔

اغوا کے بعد

ٹھیکیدار کے نوکر کو میں شروع میں گھروں کے عام نوکروں کی طرح سیدھا سادہ سا سمجھا تھا۔ اب بھی میں اس کو ایسی ہی سمجھتا تھا لیکن اس نے بیان دینا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں عقل بھی ہے۔ وہ ٹھیکیدار کے خاص ملازموں میں سے تھا۔ اس میں ایسی خوبیاں موجود ہوں گی جن کے باعث ٹھیکیدار نے اس کو اپنا معتمد خاص بنایا تھا مگر ٹھیکیدار نے اس کو یہ ٹریننگ نہیں دی تھی کہ کبھی پولیس کے پھندے میں پھنس گئے تو اس میں سے کس طرح نکلنا ہے۔ اس نوکر نے اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے اس جرم میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس کو تو پانچ سو روپیہ ملا تھا جو ایک غریب آدمی کے واسطے بہت بڑی رقم تھی۔ آج کے حساب سے یہ رقم دس ہزار سے زائد تھی۔ صرف اس ایک آئٹم سے حساب لگائیں کہ بکرے کا گوشت جو آج بڑے شہروں میں آٹھ سو روپے کلو بک رہا ہے یہ اس وقت پچاس پیسے (آٹھ آنے) سیر ملتا تھا۔ قصبوں اور دیہات میں گوشت کا ریٹ چھ آنے سیر تھا۔

نوکر نے اپنے بیان میں بتایا کہ ٹھیکیدار نے شبانہ کے ساتھ شادی تو کر لی لیکن شبانہ نے اس کو نچا کر اور چکرا کر رکھ دیا۔ پہلے پہل شبانہ خاموش رہی۔ نوکر اس کا عینی شاہد تھا کہ ٹھیکیدار جس کے پاس دولت کی اور پالے ہوئے غنڈے بدمعاشوں کی طاقت تھی اور جو مزدوروں اور اپنے مستقل ملازموں پر فرعون بنا رہتا تھا، شبانہ کے آگے غلاموں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے جھکا جھکا پھرتا تھا۔ یہ بڑھاپے اور جوانی کا تصادم تھا۔ قدرتی امر ہے کہ ہتھیار بڑھاپے کو ہی ڈالنے پڑتے ہیں۔

نوکر نے بتایا کہ ٹھیکیدار نے پینترا بدلا اور شبانہ کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ یہ بھی کامیاب نہ ہوئی۔ شبانہ جو چپ رہتی تھی، خاوند کی ڈانٹ ڈپٹ کے جواب میں لڑاکی عورت بن گئی۔ ٹھیکیدار ایک کہتا تو شبانہ جواب میں دس سناتی تھی۔ نوکر نے بتایا کہ کئی مرتبہ شبانہ نے ٹھیکیدار کو کہا کہ تمہاری ہڈیوں میں پانی پڑ چکا ہے اور تم بائیس سال کی کنواری لڑکی کو بیاہ لائے ہو۔

پھر تیسرا دور وہ شروع ہوا جو عظیم نے اپنے بیان میں سنایا تھا۔ عظیم کی ہدایت کاری کے مطابق شبانہ نے ٹھیکیدار کو تنگ کرنا بلکہ ترسانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ٹھیکیدار کے ساتھ جسمانی تعلق توڑ لیا تھا۔ ٹھیکیدار گھر آتا تو شبانہ اس کو بتائے بغیر برقع اوڑھتی اور باہر نکل جاتی تھی۔

نوکر نے شبانہ کی یہ بات خاص طور پر بتائی کہ وہ نماز باقاعدہ پڑھتی تھی اور تسبیح پر کوئی وظیفہ بھی کرتی تھی۔

نوکر نے شبانہ کے اغوا کی بیک گراؤنڈ بتائی۔ ٹھیکیدار نے اس نوکر کو ایک روز اپنے دفتر میں بلایا جو اس نے شہر میں کسی اور جگہ بنایا ہوا تھا۔ وہاں وہ دو آدمی موجود تھے جو جرائم پیشہ تھے اور نوکر ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ٹھیکیدار نے ان کو کہا کہ اس کی بیوی کو اغوا کر کے ایک یا دو روز اپنے پاس رکھیں اور اس کو بہت خراب کریں پھر اس کو قتل کر کے لاش ایسی جگہ پھینکیں جہاں سب کو نظر آ جائے۔

میں مختصر کر کے نوکر کا بیان سنا رہا ہوں۔ اس نے ٹھیکیدار کی پوری بات سنائی تھی جو اس نے ان تینوں کے ساتھ کی تھی۔ ٹھیکیدار کہتا تھا کہ میں اس لڑکی سے بہت بُرا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو بہت بڑی قیمت دے کر خریدا تھا اور اس کی ماں پوری قیمت لے کر بھی مجھ سے پیسے بٹورتی رہتی ہے اور لڑکی مجھ کو ایک ٹکے کا آدمی نہیں سمجھتی۔ نوکر نے یہ بھی کہا تھا کہ ٹھیکیدار کہتا تھا کہ میں یہ ثابت کروں گا کہ لڑکی اپنے کسی آشنا کے ساتھ نکل گئی تھی اور آشنا نے اس کو خراب کر کے قتل کر دیا ہے۔

اغوا کرنے والے دونوں آدمیوں نے کہا کہ وہ اپنے ایک اور ساتھی کو ساتھ رکھیں گے۔ وہ اس واردات کا تجربہ رکھتا تھا۔ انہوں نے پانچ پانچ ہزار روپیہ مانگا تھا۔ آخر اڑھائی ہزار روپیہ فی کس سودا طے ہو گیا تھا۔ انہوں نے یہ رقم پیشگی لے لی تھی۔ نوکر کے ذمے یہ کام تھا کہ اس نے واردات کی رات شبانہ کے سونے کے کمرے کی کھڑکی کے کواڑ بند کر کے اوپر اور نیچے کی چٹخنیاں کھلی رکھنی تھیں اور پردے آگے کر دینے تھے۔ نوکر کا دوسرا کام یہ تھا کہ رات گیارہ بجے باہر کا دروازہ کھولنا تھا۔ نوکر کو پانچ سو روپے پیشگی دے دیئے گئے تھے۔

ان سب نے واردات کامیابی سے کر لی۔ اس رات ٹھیکیدار پہلی بیوی کے پاس چلا گیا تھا۔ نوکر کو ٹھیکیدار نے بتایا ہوا تھا کہ صبح وہ اس کی پہلی بیوی کے گھر آ کر بتائے گا کہ شبانہ لاپتہ ہے۔ وہاں جانے سے پہلے اس نے شبانہ کے گھر جا کر پوچھنا تھا کہ شبانہ ادھر تو نہیں آئی؟ نوکر نے اپنی یہ ڈیوٹی بھی پوری کر دی مگر نوکر کو کسی نے یہ نہ بتایا کہ کمرے سے جبری اغوا کے نشان ختم کر دینے ہیں۔ نوکر نے پلنگ پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے نہ دیکھے، دوپٹہ نہ دیکھا، پلنگ کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

پاس چیلیاں نہ دیکھیں۔

ٹھیکیدار بھی بے وقوف آدمی تھا۔ اس نے مجھے یہ رپورٹ لکھوائی تھی کہ اس کی بیوی تمام زیورات اور دو ہزار روپے رقم نقد ساتھ لے گئی ہے لیکن رقم اور زیورات الماری میں موجود تھے جو میں نے اس مقفل الماری کو کھول کر دیکھے تھے۔

نوکر کو میں نے حوالات میں بند نہیں کیا۔ اس کو وعدہ معاف گواہ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے یہ دیکھنا تھا کہ دوسرے ملازم اقبال جرم کرتے ہیں یا نہیں۔ اقبال جرم نہ کرنے کی صورت میں نوکر کو وعدہ معاف گواہ بنانا تھا۔ میں نے اس کو دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ اگلے روز مجسٹریٹ کی عدالت میں لے جا کر اس کا اقبالی بیان قلمبند کرانا تھا۔

میں نے رات بارہ بجے کے ذرا بعد ٹھیکیدار کو حوالات سے نکلوایا اور اپنے دفتر میں بٹھا کر اس کو سمجھایا کہ اس کے بچنے کی اب کوئی صورت نہیں رہی۔ بہتر ہے کہ وہ خود ہی اقبالی بیان دے دے۔ میں نے اس کے آگے جھوٹ بولا کہ دو ملزم پکڑ لئے گئے ہیں اور دونوں نے بیان دے دیئے ہیں۔ اس نے زبان پر بھی الفاظ رکھے کہ مجھ کو اس کیس سے نکال دیں اور اپنے منہ سے جو رقم نکالیں گے وہ میں ادا کر دوں گا۔ میں اس کو کہتا کہ وہ اپنا جرم تو سنائے تاکہ میں اس کو اس تفتیش سے خارج کرنے کیواسطے کوئی راستہ نکالوں۔

وہ میری باتوں میں آ گیا اور اس نے اقبالی بیان دے دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو اس کا نوکر دے چکا تھا۔ ٹھیکیدار نے ذرا زیادہ بتایا کہ وہ شبانہ سے بہت تنگ آ گیا تھا اور اس نے شبانہ سے انتقام لینے کے واسطے یہ سکیم سوچی تھی۔

صبح ہوئی تو نوکر کو اے ایس آئی کے ساتھ مجسٹریٹ کی عدالت میں بھیج دیا جہاں اس نے اقبالی بیان قلمبند کروا دیا۔ اس کے بعد اس کو جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا گیا۔ ٹھیکیدار کو میں نے ابھی حوالات میں ہی رکھا۔ اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لے لیا۔ شبانہ کو رات کو ہی اس کے باپ کے سپرد کر دیا تھا۔

دو دِنوں بعد وہ دو ملزم رات کے وقت جوئے بازی کے ایک اڈے سے پکڑ لے گئے۔ ان کی نشاندہی پر ان کے تیسرے ساتھی کو ایک روز بعد گرفتار کر لیا گیا۔ تینوں نے اقبال جرم کر لیا۔ ان میں سے ہر ایک نے درخواست کی کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیا جائے۔ میں نے ان سے بڑی استادی سے اور کچھ اپنے ہاتھ دکھا کر اقبالی بیانات لئے تھے۔ ان سے وہ رقم بھی برآمد کرائی جو انہوں نے ٹھیکیدار سے لی تھی۔ تھوڑی تھوڑی رقم کم تھی۔

انہوں نے ٹھیکیدار سے اپنی اجرت اس کام کی لی تھی کہ وہ شبانہ کو اغوا کر کے دو روز بعد قتل کر دیں گے لیکن لڑکی کو اغوا کر کے ان کے تیسرے ساتھی نے ان کو مشورہ دیا کہ آج کل راولپنڈی میں بری امام کا میلہ لگا ہوا ہے۔ اگر لڑکی کو قتل کرنے کی بجائے میلے تک پہنچا دیا جائے تو کم از کم بیس ہزار روپے کا سودا ہو جائے گا۔ یہ تیسرا آدمی اغوا اور بردہ فروشی کا کچھ تجربہ رکھتا تھا۔

انہوں نے ایک ٹرک ڈرائیور کے ساتھ معاملہ طے کر لیا کہ لڑکی کو چھپا کر بری امام کے میلے تک پہنچانا ہے۔ اگلے ہی دن ٹرک کو راولپنڈی لے جانے کے واسطے سامان مل گیا۔ ان دنوں ٹرک نئے نئے چلے تھے اور بہت کم تھے۔ اغوا کی ہوئی لڑکی کو ریل گاڑی یا بس سے نہیں لے جایا جا سکتا تھا ورنہ پکڑے جاتے۔

شبانہ کو میلے تک پہنچا دیا گیا۔ وہاں خریداروں کی کمی نہیں تھی لیکن پندرہ ہزار سے اوپر کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا تھا۔ ایک گاہک اٹھارہ ہزار دینے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس نے اگلے روز رقم ادا کرنی اور شبانہ کو لے جانا

تھا۔ اس سودے کی خوشی میں انہوں نے بے تحاشہ شراب پی لی۔ انہیں صبح ہوش آئی تو لڑکی کو لاپتہ پایا۔ پہلے تو وہ اس شک میں رہے کہ جن گاہکوں نے لڑکی کو دیکھا تو وہ اس کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ میلے میں ان گاہکوں کو ملے۔ ہر ایک سے ان کو کورا جواب ملا۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ لڑکی بھاگ گئی ہے اور اپنے وارثوں تک پہنچ گئی ہے۔ وہ لڑکی کو میلے میں ہی ڈھونڈتے رہے، واپس آئے تو گرفتار ہو گئے۔

انہوں نے مجسٹریٹ کو اقبالی بیان قلمبند کرا دیئے تھے۔ ٹھیکیدار نے مجسٹریٹ کے سامنے جا کر یہ بیان دیا کہ وہ اقبالی بیان نہیں دے گا۔ پولیس نے تشدد کر کے اس کو بیان دینے پر آمادہ کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے اس کو جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا۔

میں نے مقدمہ بہت محنت سے تیار کیا۔ مقدمے کی سماعت ایک الگ کہانی ہے۔ میں بات مختصر کرتا ہوں۔ میں نے کسی کو وعدہ معاف گواہ نہ بنایا۔ اغوا کرنے والے تینوں ملزموں کو سات سال سزائے قید ہوئی۔ ٹھیکیدار کو چھ سال قید اور چالیس ہزار روپیہ جرمانہ، عدم ادائیگی جرمانہ ایک سال مزید قید۔ نوکر کو تین سال قید کی سزا ملی تھی۔ نوکر کے سوا سب نے ہائی کورٹ میں اپیلیں دائر کیں جو نامنظور ہو گئیں۔

یہ مقدمہ ختم ہونے کے تقریباً چھ ماہ بعد میں ایک روز سیشن کورٹ میں گیا تو عظیم مجھے دیکھ کر دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے شبانہ کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ وہ اب سیشن کورٹ میں سٹینو لگ گیا تھا۔ اس کے باپ نے کورٹ کے ذریعے ٹھیکیدار سے شبانہ کی طلاق حاصل کی تھی۔ ٹھیکیدار نے ایک سال مزید قید قبول کر لی تھی، جرمانہ ادا نہیں کیا تھا۔

❀❀❀

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب
ریمینال شربت
تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔
اپنے قریبی دوافروش سے طلب فرمائیں
نوٹ
تبخیر معدہ و دیگر امراض کے طبی مشورے کے لئے
ممتاز
ممتاز مطب
سے رابطہ فرمائیں
ممتاز دواخانہ (رجسٹرڈ) میانوالی
فون: 233817-234816

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نفسیات

جذبات کا جہنم

کیا والدین اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے ایک غلط فیصلے کے اثرات کتنے طویل اور خوفناک ہو سکتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر فیاض احمد ہرل
0300-6341947

''ڈاکٹر صاحب! میرا دل چاہتا ہے کہ میں گاتے گاؤں، ڈانس کروں، مجھے لگتا ہے جیسے میرے اندر ایک اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکی کا دل ہے''۔

میں نے نظر اٹھا کر مخاطب مریضہ کو بغور دیکھا۔ سامنے کسی نوجوان لڑکی کی بجائے ایک بزرگ خاتون بیٹھی تھیں۔ عمر کم از کم پچھتر اور اسی برس کے درمیان، سفید برف بال، چہرے پر عمر کے تناسب سے بہت کم جھریاں، سفید رنگت میں سرخی کی آمیزش، نفیس دیدہ زیب اور اعلیٰ تراش خراش کے لباس میں ملبوس، حرکات و سکنات اور چال ڈھال میں چستی اور بے قراری سی جھلکتی تھی۔

یہ میرا صبا اختر بیگم سے چوتھا سیشن تھا۔ شروع کے تین سیشنز میں وہ ذرا دبے دبے انداز میں بات کرتی رہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اپنا مافی الضمیر صحیح طرح بیان نہیں کر پا رہیں یا جھجک آڑے آ رہی ہے۔ اب جبکہ اعتماد کی فضا قائم ہو گئی تھی تو وہ نسبتاً زیادہ سہولت سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگی تھیں۔

''ڈاکٹر صاحب! مجھے شرم آتی ہے کہ میری باتیں سن کر آپ کیا سوچیں گے''۔ بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولیں۔ ''لیکن میں کیا کروں مجھے اندر ہی اندر برداشت کرتے ہوئے سالوں گزر گئے ہیں۔ ہر وقت گرمی ہی گرمی جسم میں محسوس ہوتی ہے۔ ہیٹ اَپ ہو جاتی ہوں حالانکہ میں گرم چیزیں بالکل استعمال نہیں کرتی''۔

ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ جیسے ان کے سینے میں ماضی کا بہت سا غبار جمع ہے جو اظہار کے لئے راستہ ڈھونڈ رہا ہے۔ میری حوصلہ افزائی پر وہ رفتہ رفتہ گزشتہ پچاس برسوں کی راکھ کو کریدنے لگیں۔

ان کا بچپن کسی بھی نارمل گھرانے کے بچے کی طرح خوشیوں اور جوش و جذبے سے بھرپور تھا۔ والد ایک سرکاری محکمے میں افسر تھے۔ ملک کے مختلف حصوں

میں تعیناتی ہوتی رہی جس کی وجہ سے خوب سیر و تفریح اور سیاحت کا موقع ملا۔ مزاج ایسا تھا کہ جسم میں پارہ سا بھرا رہتا تھا۔ ہر وقت تتلی کی طرح ناچنے کودنے کو دل کرتا تھا۔ سارا سارا دن بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس وغیرہ کھیلتی رہتی تھی لیکن تھکاوٹ کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ نئے نئے کام سیکھنے اور کرنے کا شوق تھا۔ کبھی کوکنگ کے نئے نئے تجربے کر رہی ہوتیں تو کبھی پینٹنگ پہ طبع آزمائی، سلائی کڑھائی وغیرہ سے بھی قدرتی ذوق تھا۔ خوش شکل بھی تھیں اور تیز طرار بھی، سو پورے خاندان کی توجہ کا مرکز تھیں۔

زندگی کسی نغمۂ جانفزا کے سُروں کی لے پر سرور میں گزر رہی تھی کہ ایک المیے نے اچانک ہر شے کو تہہ و بالا کر دیا۔ وہ بلوغت کی عمر کو پہنچی ہی تھیں کہ والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ابھی اس صدمے سے سنبھلی نہیں تھیں کہ گھر میں سوتیلی والدہ آ گئیں، گھر کی فضا بدل گئی، والد کی توجہ کم ہو گئی۔ سوتیلی والدہ سارے معاملات کو رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لیتی گئیں۔ ان کے اشارہ ابرو سے گھر کا ہر فیصلہ ہونے لگا۔

ابھی نوجوانی کے اوّلین برس ہی تھے کہ سوتیلی والدہ نے ساز باز کر کے ان کا رشتہ ایک جگہ طے کر دیا۔ ان سے نہ کسی نے پوچھا نہ انہوں نے عندیہ دیا۔ شادی کے موقع پر بھی رسمی بلکہ جبری اجازت سے کام چلایا گیا۔ شادی ہو گئی مگر ان کے سارے سپنے چکنا چُور ہو گئے۔ دلہا باروزگار اور سیدھا سادہ تو تھا لیکن کم صورت بھی تھا اور طبیعت کو نفاست اور ذوق سے بھی کوئی علاقہ نہ تھا۔

اس تضاد نے ایک طویل ازدواجی المیے کو جنم دیا۔ وہ اپنے خاوند کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکیں۔ رسمی نبھاؤ چلتا رہا، بچے پیدا ہو گئے اور جوں توں کر کے پرورش بھی پا گئے لیکن ان کے اندر کی باغ و بہار لڑکی اس صورتِ حال سے سمجھوتہ نہ کر سکی۔ تشنہ جذبات کا طوفان عمر گزرنے کے ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی گیا۔ فطرت صالح تھی اس لئے طبیعت کسی کج روی کی طرف راغب نہ ہوئی لیکن ازدواجی زندگی ایک طویل نوحے کا روپ دھار گئی۔

میں نے اکثر وزٹس پر اُن کے میاں کو ان کے ساتھ آتے دیکھا۔ گہری سانولی رنگت اور موٹے موٹے نقوش کے حامل یہ بزرگ سپاٹ سیدھے سے انسان لگتے تھے۔ اپنی زوجہ کی تکلیف پر فکرمند رہتے تھے اور کسی حد تک اس کی وجہ بھی سمجھتے تھے۔ بظاہر شریف اور نیک طبع لیکن حسِ لطیف سے عاری انسان تھے۔ اپنی زوجہ کے رومانویت پسند دل تک پہنچنے کا کوئی ہنر انہیں نہیں آتا تھا۔ سیشن روم کے باہر بیٹھے جب وہ بار بار کھانستے تو ان کی آواز سن کر صبا بیگم کے وجود میں ناپسندیدگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی جو اکثر ایک ناگوار جھرجھری کی صورت میں ظاہر ہوتی۔

اب جبکہ وہ اسی برس کی عمر کو پہنچ رہی تھیں، ان کی طبیعت کا ہیجان اور بے قراری کم ہونے کی بجائے مزید بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بے چینی اور گھبراہٹ کی حالت میں بار بار اپنے سر اور جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتیں۔

''ڈاکٹر صاحب! دماغ میں شاں شاں ہوتی رہتی ہے، سینہ درد کرتا ہے، گردن کے پٹھوں میں درد ہوتا ہے، کبھی گرمی لگتی ہے کبھی ٹھنڈک، دماغ پر بہت پریشر رہتا ہے، گوشت کھانے کو دل نہیں کرتا، صرف سبزیاں اور پھل استعمال کرتی ہوں، لسی اور دہی بھی لیتی ہوں پھر بھی گرمی ہی گرمی جسم میں محسوس ہوتی ہے''۔

ان کی جسمانی صحت اب بھی قابلِ رشک تھی۔ تمام میڈیکل ٹسٹ ہمیشہ نارمل آتے تھے۔ اپنی ساری نفسیاتی کیفیت کے باوجود گھر کے کافی کام کاج کر لیتی تھیں اور ایک گھنٹہ روزانہ سیر بھی کرتی تھیں۔ صاف اندازہ ہوتا تھا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کہ ان کی کیفیت میں ان کی ازدواجی زندگی کی ناآسودگی کا دخل ہے۔ رفتہ رفتہ جب وہ اپنی جھجک پر قابو پا گئیں تو کسی حد تک تشنہ جذبات کا اظہار کرنے لگیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ جیسے سارے جسم میں کوئی تشنگی سی بھری ہو، ہاتھ پھیرنے سے لطف آتا ہے۔ جب جذبات بھڑکتے ہیں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی جب بہت بے قراری ہوتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی سے لپٹ جاؤں یا کوئی میرے جسم کو نرمی اور پیار سے سہلاتا رہے"۔

ذہن میں رکھیں کہ یہ بات کوئی نوجوان لڑکی نہیں کہہ رہی بلکہ 80 برس کی خاتون کے الفاظ ہیں جو نفسیاتی مریضہ ہے۔

وہ اپنی کیفیات کے بیان میں کھوئی ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا والدین اولاد کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کے ایک غلط فیصلے کے اثرات کتنے طویل اور خوفناک ہو سکتے ہیں۔ عام طور پر ایسے نتائج کو "نصیب" کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے کہ بس کیا کریں، تقدیر میں یہی لکھا تھا لیکن اہم بات یہ ہے کہ اولاد خاص طور پر بیٹیوں کے مستقبل کا فیصلہ کرتے ہوئے والدین غور کریں کہ وہ کسی وقتی مصلحت کا شکار تو نہیں ہو رہے، اپنے کسی ذاتی مفاد کے تحت تو ایسا نہیں کر رہے یا کسی کے ناجائز دباؤ میں تو ایسا فیصلہ نہیں کر رہے۔

ہمارے دینی اور تہذیبی ورثے نے بھی شادی بیاہ کے فیصلے کرنے کے لئے کچھ اصولوں کی تعلیم دی ہے مثلاً دینداری اور کردار کو فوقیت دی جائے، لالچ کے تحت فیصلہ نہ کیا جائے اور اولاد کی پسند ناپسند کو مدنظر رکھا جائے۔ مجھے یاد آیا کہ کلام پاک میں ایک جگہ ان والدین کی طرف سخت ناراضگی کا انداز اپنایا گیا ہے جنہوں نے اپنی بیٹیوں کو زندگی کے حق سے محروم کیا ہو (سورہ تکویر)۔ میں نے سوچا کہ کیا وہ والدین جو اپنی بیٹیوں کو شادی کے وقت رائے دینے کے شرعی حق سے محروم رکھیں اس کے مصداق نہ ہوں گے۔

میری چشم تصور نے اچانک دیکھا کہ میدان حشر بپا ہے اور ساری مخلوق رب کریم سے فیصلہ پانے کے لئے کمربستہ ہے۔ ایسے سارے والدین بھی کٹہرے میں کھڑے ہیں اور صبا اختر اور ان جیسی خواتین حق تعالیٰ کے حضور اپنے کھوئے ہوئے حق کے لئے آہ و زاری کر رہی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

بعد میں ایک دن ایک سیشن کے دوران میں نے کچھ سوچ کر صبا بیگم سے پوچھا۔ "آپ کو جب اپنے والد صاحب کا خیال آتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟"

مجھے لگا جیسے ان کے جسم کو جھٹکا سا لگا ہو پھر وہ بولیں۔

"میں کوشش کرتی ہوں کہ ان کے بارے میں نہ سوچوں کیونکہ پھر میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اور اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتی"۔

وہ شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہیں پائیں۔

میں نے پھر دوسرے زاویے سے بات آگے بڑھائی۔

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کے ابا بھی مجبور تھے اور انہوں نے حالات کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا"۔

"جی ہاں، بہت مجبور تھے"۔ ان کے لہجے میں طنز کا ذائقہ ملا ہوا تھا۔ "لیکن ان کی مجبوری کا میں کیا کروں، اپنی نئی بیوی کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ یہ کیسی مجبوری تھی ڈاکٹر صاحب! جس میں صرف اپنا مفاد سوچا جاتا ہے۔ کیا ان کا کوئی فرض نہیں تھا؟ کیا مجھ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ کرنا ان کا حق تھا؟ بتائیے ڈاکٹر صاحب؟"

وہ روانی میں بولتی چلی گئیں۔ ان کے جذبات پر لگا

ہوا بند ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے انہیں بولنے دیا تاکہ ان کے اندر کا غبار نکل سکے۔

"دیکھیے، مجھے آپ کے جذبات کا احساس ہے"۔

جب وہ ذرا پرسکون ہو گئیں تو میں نے کہا۔ "آپ نے کافی اذیت برداشت کی ہے۔ بے شک آپ کے والد صاحب نے بُرا کیا لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے والد صاحب کو معاف کر سکیں تو اس سے آپ کے اندرونی زخم مندمل ہونے میں مدد ملے گی اور آپ کی طبیعت کو سکون اور قرار آنے کا امکان ہو گا۔ ابھی کوئی فوری فیصلہ کرنے کی بجائے آپ بعد میں سکون سے میری بات پر غور کیجیے گا"۔

وہ کچھ ہفتوں بعد ایک دن آئیں تو بجھی بجھی اور پژمردہ سی لگ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بیٹھی کچھ سوچتی رہیں اور پھر بولیں۔

"ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کی بات پر بہت سوچا ہے، آپ کی بات ٹھیک ہے کہ شاید ایسا کرنے سے میری تکلیف کم ہو جائے گی لیکن یہ میرے بس میں نہیں ہے"۔ وہ چند لمحے رکیں اور پھر بولیں۔ "مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر سے معافی کا لفظ کہیں گم ہو گیا ہے، میں ابا کو معاف نہیں کر سکتی۔ سوری ڈاکٹر صاحب!"

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ وہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں اور پھر بوجھل سے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

(صاحب مضمون ماہر امراض ذہن و نفسیات ہیں اور واپڈا ٹیچنگ ہسپتال لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں)

نوٹ: ڈاکٹر صاحب کی مزید تحریریں پڑھنے کے لئے آپ اُن کے "فیس بک پیج" gulzam-e-khamosh پر وزٹ کر سکتے ہیں۔

WWW.AOURDUBOOKS.NET

جو خدمت کرتا ہے، اس کی خدمت کی جاتی ہے اور جو شخص اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھتا ہے اور دوسروں سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ خدمت سے محروم رہتا ہے۔

مکافات عمل

اللہ کی سُنت

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
0323-4546115

پروفیسر سلطان محمود میرے اچھے دوست ہیں۔ ان سے میرا مزاج اور ذوق تو نہیں ملتا کہ وہ کٹر سائنس کے آدمی ہیں۔ ایم ایس سی کیمسٹری، علم و ادب اور شاعری سے بہت دور لیکن وہ دیانت دار، اصول پسند اور محنتی انسان ہیں اور کسی بھی مشکل میں وہ ہر شخص کی مدد پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے اور ہماری دوستی زندہ سلامت ہے۔

سلطان محمود صاحب بڑے لائق آدمی ہیں۔ 1972ء میں انہوں نے ایم ایس سی کیمسٹری کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ درجہ اوّل میں پاس کیا تھا اسی لئے اگلے ہی سال پبلک سروس کمیشن نے انہیں لیکچرار کی حیثیت سے منتخب کر لیا اور ان کی تقرری اپنے گھر کے قریب ہی فیصل آباد کے ایک بڑے قصبے کے گورنمنٹ کالج میں ہو گئی۔

سلطان محمود صاحب کے والدین زندہ تھے، ان کی تھوڑی زرعی زمین بھی تھی۔ وہ لائق اور محنتی تھے، بڑی آسانی سے پی ایچ ڈی کر سکتے تھے اور گھر کے قریب رہ کر والدین کی خدمت بھی کر سکتے تھے اور ملازمت کے حوالے سے ان کے لئے ترقی کے وسیع امکانات تھے لیکن بدقسمتی سے ان پر جلد از جلد دولت بنانے اور امیر بننے کا بھوت سوار ہو گیا اور وہ لیکچرار بننے کے ایک سال کے اندر کوشش کر کرا کے کینیڈا چلے گئے اور پندرہ سال کا طویل قیمتی عرصہ انہوں نے غیروں کی خدمت کرنے اور ڈالر بنانے میں صرف کر دیا۔

سلطان محمود صاحب تین چار سال کے بعد کبھی پاکستان کا چکر لگایا کرتے اور شادی کے بعد تو یہ وقفہ اور بھی طویل ہو گیا۔ اس دوران میں ان کے والد وفات پا گئے اور وہ ان کے جنازے میں بھی شامل نہ ہو سکے۔ تاہم یہ ان کی خوش بختی تھی کہ وہ والدہ کی شدید علالت کی خبر پا کر ان کے انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے وطن آ گئے اور چند روز انہیں ان کے پاس گزارنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

سلطان محمود صاحب کو اللہ نے چار بچے عطا کئے۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ سب کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ سب بہت خوبصورت تھے۔ بڑی بیٹی تو وہ بھی رعنائی اور دلکشی کی مثال تھی۔ سلطان محمود صاحب میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ساری دولت پرستی کے باوجود ان میں دینداری اور دینی غیرت وافر تھی چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ بڑی بیٹی جوان ہو رہی ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں کینیڈا کی معاشرت اسے متاثر نہ کرے، تو انہوں نے بوریا بستر باندھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مستقلاً پاکستان آ گئے۔

یہاں سلطان محمود صاحب نے ایک جدید بستی میں پلاٹ خریدا۔ اس پر سکول کی عمارت کھڑی کی اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موصوف نیک نیت تھے، دیانت دار اور مخلص تھے، اس لئے اللہ نے ان کے کاروبار میں برکت اور وسعت عطا کی اور انہیں دوہرا نفع حاصل ہونے لگا۔ علم کی اشاعت بھی اور رزق کی فراہمی بھی۔

پاکستان آ کر انہوں نے سارے بچوں کو مختلف تعلیمی اداروں میں داخل کرا دیا۔ بڑی بیٹی زرین نے فارمیسی میں گریجوایشن کر لی۔ دونوں بیٹوں شاہد محمود اور حامد محمود نے انٹر کے بعد کمپیوٹر سائنس میں مطلوبہ کورس کر لئے اور چھوٹی بیٹی صدف نے بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔

کم و بیش دس سال پہلے کی بات ہے، ایک روز پروفیسر صاحب میرے پاس آئے۔ بہت پریشان تھے۔ کہنے لگے حامد محمود کو سمجھائیں، اس نے رٹ لگا رکھی ہے کہ میں کینیڈا جاؤں گا۔ کہتا ہے میرے سارے دوست مجھے طعنے دیتے ہیں کہ تم تو بالکل ہی بے وقوف ہو، تمہارے پاس کینیڈا کی نیشنلٹی ہے اور تم پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہیں تو فوراً کینیڈا چلے جانا چاہئے۔ وہ پاکستان کے حالات سے بہت بددل ہے اور کسی طرح یہاں نہیں رہنا چاہتا...... لیکن میری خواہش ہے کہ وہ یہیں رہے، یہیں ملازمت یا کاروبار کرے۔ کینیڈا کا ماحول ایمان کے حوالے سے انتہائی خطرناک اور نقصان دہ ہے، میں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں چلا جائے۔

میں نے سلطان محمود صاحب کے کہنے پر حامد محمود سے ملاقات کی۔ اسے بہت قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کینیڈا نہ جائے پاکستان ہی میں سیٹل ہونے کی کوشش کرے اور والدین کے قریب رہ کر ان کی خدمت کی سعادت حاصل کرے مگر وہ کسی طرح ڈھب پر نہ آیا۔ وہ شدت کے ساتھ بضد تھا کہ وہ لازماً کینیڈا جائے گا، اس کا اصرار تھا کہ پاکستان ایسا ملک نہیں کہ یہاں سکون سے باعزت زندگی گزاری جا سکے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ حامد محمود کینیڈا چلا گیا، اسے اس اقدام سے کوئی بھی نہ روک سکا...... تاہم سلطان محمود صاحب مطمئن تھے کہ ان کا بڑا بیٹا شاہد ان کے پاس پاکستان ہی میں رہے گا۔ انہوں نے بتایا۔ ''شاہد نے مجھے یقین دلایا ہے کہ حامد جذباتی ہے، اسے یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ جیسے بھی حالات ہوں، میں پاکستان ہی میں مقیم رہوں گا، میں والدین سے ہرگز دور نہ ہوں گا''۔

لیکن اس بات کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز پروفیسر سلطان محمود صاحب نے مجھے انتہائی

WWW.AOURDUBOOKS.NET

دل گرفتگی کے ساتھ بتایا کہ ڈاکٹر صاحب! بہت کام خراب ہوا ہے، اب شاہد نے بھی حامد کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ کہتا ہے میں بھی کینیڈا جاؤں گا۔ یہاں نہ کوئی نوکری ملتی ہے، نہ کاروبار کے امکانات ہیں، پھر یہاں میں رہ کر کیا کروں۔ میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دونوں باپ بیٹا مل کر اپنے اسکول کی توسیع کرتے ہیں۔ اللہ فضل فرمائے گا اور ہم مسائل سے دوچار نہیں ہوں گے لیکن وہ بھی میری کوئی دلیل یا اپیل ماننے پر تیار نہیں۔ اس نے تو روانگی کی تاریخ بھی طے کرلی ہے، ٹکٹ بھی خرید لیا ہے۔

ظاہر ہے اس صورتِ حال میں شاہد محمود سے کوئی بات کرنے کا فائدہ نہ تھا، تاہم میں نے ایک روز دونوں باپ بیٹوں کو اپنے گھر کھانے پر بلا لیا تاکہ شاہد سے الوداعی ملاقات بھی ہو جائے اور ضروری گفتگو بھی۔ اور پھر میں نے شاہد سے بے تکلفی کے ساتھ دوٹوک انداز میں بات کی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اور آپ دونوں بھائی باپ کو اکیلا چھوڑ کر کینیڈا جا رہے ہیں، یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کی سنت کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ ہے۔

میں نے شاہد سے کہا: آپ کے والد نے اپنے ماں باپ کی خدمت سے منہ موڑا اور انہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا اور اب اس کے دونوں بیٹے اسے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں...... یہ بالکل وہی بات ہے جو کسی فارسی شاعر نے کہی ہے کہ

ہر چہ خدمت کرد، او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید اُو محروم شد

یعنی جو خدمت کرتا ہے، اس کی خدمت کی جاتی ہے اور جو شخص اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھتا ہے اور دوسروں سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ خدمت سے محروم رہتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا

- زبان کی حفاظت دولت کی حفاظت سے زیادہ مشکل ہے۔
- کسی کے منہ پر اس کی بے عزتی کرنا اسے قتل کر دینے کے مترادف ہے۔
- غریب لوگوں پر احسان کرو کیونکہ غریب ہونے میں وقت نہیں لگتا۔
- اگر عبادت نہیں کر سکتے ہو تو گناہ بھی نہ کرو۔
- دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم پہلے کیا تھے بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ تم اب کیا ہو۔
- جہاں اپنی بات کی قدر نہ ہو وہاں چپ رہنا ہی بہتر ہے۔
- یقین کی پختگی اور اخلاقی حسن جس بندے میں ہو جائے وہ ایک ہی وقت میں خالق اور مخلوق کا محبوب بن جاتا ہے۔

مرسلہ: نسیم سکینہ صدف

میں نے اُسے کسی لگی لپٹی رکھے بغیر بتایا کہ آپ کے باپ نے اپنے ماں باپ کی خدمت نہیں کی تھی اور آج وہ خود بھی خدمت کے مواقع سے محروم ہو رہا ہے لیکن شاہد بیٹے! میں نے اسے دردمندی سے کہا۔ خدارا! اس سلسلے کو روک دیجیے، ورنہ یاد رکھیے کہ آج آپ دونوں بھائی جس طرح اپنے والد کو اکیلا چھوڑ کر بیرون ملک جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح آپ کے بڑھاپے میں آپ کے بیٹے بھی آپ سے جدائی اختیار کر جائیں گے اور آپ ان کی یاد میں آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے لیکن لگتا ہے کہ شاہد پر میری باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

(مصنف کی کتاب "مکافاتِ عمل" سے ماخوذ)

سلسلہ وار ناول

ایک دل ہزار داستان

☆ ایس ایم علی

قسط: 2

0300-5563881

سیتا نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی تھی اپنی جان چھڑانے اور عصمت بچانے کی مگر وہ بیچاری اکیلی اور ادھر وہ تین ہٹے کٹے مرد۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سیتا کا چہرہ دیکھتے ہی دوسے کی چیخ نکل گئی۔ اس نے دل میں سوچا کہ یہ میری بیٹی کی ہم عمر معصوم لڑکی ہے۔

"ارے تو کس بدنصیب ماں باپ کی اولاد ہے اور تو ان درندوں کے چنگل میں کیسے پھنس گئی ہے...... یہ بہت ظالم ہیں، بہت ظالم!" دوسا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

دوسے کی باتیں سن کر سیتا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ایک نہ رکنے والا آنسوؤں کا سمندر اس کی آنکھوں سے امڈ پڑا۔ دوسے نے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا۔ سیتا مسلسل دوسے سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ دوسا اسے دلاسہ دے رہا تھا، بار بار اس کے سر پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔

"چپ کر جا میری بدنصیب بیٹی، کاش! میں تیرے لئے کچھ کر سکتا"۔

سیتا کافی دیر تک دوسے کے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لیتی رہی۔ دوسے نے اپنا کمبل سیتا کے گرد لپیٹ دیا کیونکہ بارش میں بھیگ جانے سے اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ دوسے کا سہارا سیتا کے لئے دریا میں تنکے کی مانند تھا۔ دوسے نے سیتا کو دلاسا دیا اور روٹی کے برتن کھولنے لگا۔ تنور کی دو خشک روٹیاں اور چنے کی پتلی شوربے والی دال ساتھ تھی۔ دوسے نے سیتا سے کہا۔

"بیٹی! کھا لے تیرا یہ غریب چاچا اس سے بڑھ کر تجھے کھانا پیش کرنے سے قاصر ہے"۔

سیتا ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی، گزشتہ رات ہی کی بات تھی جب رادھا نے ولیسی مرغ دیسی گھی میں تیار کیا تھا۔ ساتھ میں پلاؤ بھی تیار کیا تھا۔ رنگین مخملی دسترخوان پر بیٹھ کر سیتا نے بابو جی، ماتا جی اور گوپی کے ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے تو کتنی بار گوپی نے سیتا کو تنگ کیا تھا۔ کبھی سیتا کی پلیٹ سے اچھی سی بوٹی اٹھالی تو کبھی روٹی کا ٹکڑا چھین لی۔

"دیکھو نا بابو جی! میں ماروں گی اس گوپی کے بچے کو۔ یہ دیکھو میرے پلاؤ میں ہاتھ ڈال لیا ہے اس نے"۔ سیتا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں کھاتی کھانا"۔

"شرارت نہ کرو گوپی، کیوں بہن کو تنگ کرتے ہو"۔ لالہ جی نے گوپی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ویسے ہی ناک چڑھا رہی ہے، میں نے کیا کیا ہے؟" گوپی نے اسے منہ چڑاتے ہوئے کہا۔

"کبھی آرام سے بھی کھا لیا کرو"۔ رادھا نے اپنی پلیٹ سے پلاؤ سیتا کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہر وقت تم دونوں کی شرارت چلتی رہتی ہے...... دیکھو بیٹا! یہ سیتا پرایا دھن ہے، کل کو بیاہ کر چلی جائے گی تو روؤ گے۔ اسے تنگ نہ کیا کرو"۔ رادھا نے کہا۔

سیتا مارے شرم کے لال پیلی ہوگئی اس نے سر جھکا لیا اور خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا۔ آج زمین پر پا بہ زنجیر بدبودار کمبل لپیٹے بیٹھی ہوئی تھی، بال اس کے بکھرے ہوئے تھے، بدن بری طرح دکھ رہا تھا، پاؤں زخموں سے چور تھے اور سامنے کپڑے میں لپٹی دو سوکھی روٹیاں اور دال پیالے میں پڑی تھی۔ تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

دوسے نے مٹی کے پیالے میں صراحی سے پانی بھر کر سامنے رکھ دیا۔ "لے بیٹی کچھ کھا پی لے۔ بھوک لگی ہوگی تم کو"۔

سیتا نے پیالہ اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک سانس میں پی لیا۔ دوسے نے جھٹ صراحی سے اور پیالے میں ڈال لیا۔

"بیٹی! کھانا کھا لے کچھ پیٹ کی آگ بجھا لے"۔ دوسے نے روٹی کا ایک لقمہ توڑا اور دال میں ڈبو کر منہ میں ڈال کر چبانا شروع کر دیا۔

گویا یہ بھی ایک طرح کی خاموش دعوت تھی۔ سیتا کا ہاتھ نہ چاہتے ہوئے بھی روٹی کی طرف اٹھ گیا۔ اس نے بھی روٹی کا ایک لقمہ توڑا اور دال میں بھگونے کے بعد منہ میں ڈال لیا۔ اب سیتا دوسے کے ہمراہ بیٹھی پیٹ کی آگ بجھا رہی تھی۔ سچ ہی تو ہے کہ نیند کسی خاص بستر اور بھوک کسی خاص کھانے کی محتاج نہیں ہے بلکہ بھوک تو حرام کھانے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔ ایسے لگ رہا تھا کہ سیتا اپنے بابو جی کے ہمراہ کھانا کھا رہی تھی۔ سیتا کافی حد تک اپنے اردگرد کے ماحول اور دوسے سے مانوس ہو چکی تھی۔ جو کچھ آگے ہونے والا تھا وہ تو ہونا ہی ہے اور جو کچھ بیت چکا تھا اس میں بھی اس کا تو کوئی دوش نہ تھا۔ بھگوان کو شاید یہی منظور تھا۔ سیتا نے دل ہی دل میں سوچا۔

الغرض سیتا نے خشک روٹی کو دال میں بھگو بھگو کر کھایا۔ اب سیتا کی بھوک مٹ چکی تھی۔ وہ ابھی تک کمبل لپیٹے بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسے نے کھانے کے برتن رومال میں باندھنے کے بعد بھرے میں ٹھونکی لکڑی سے لٹکا دیئے پھر وہ ایک پیالہ لے کر باہر نکلا۔ دوسرے بھرے میں بکریاں اور گائے بندھی ہوئی تھیں۔ گائے تو گابھن ہے۔ اس کا دودھ نہیں ہے۔ چلو بکریوں کا دودھ ہی دوہ لیتا ہوں۔ دوسے نے سوچا۔ تھوڑی دیر میں دوسا بکریوں کو دوہ کر دودھ لے کر اندر آیا۔ اس نے چند گھاس پھونس کے تنکے جمع کر کے ان کو آگ لگا کر دودھ دیگچی میں ڈال کر آگ پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں دودھ ابل گیا۔ تقریباً آدھ کلو دودھ ہوگا۔ دوسے نے پیالے میں ڈال کر سیتا کے سامنے لا رکھا۔ لے بیٹی پی لے تجھے بہت ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ سیتا نے سر اٹھا کر دوسے کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے پیالے کو اٹھا کر دودھ کی چسکیاں لینے لگی۔ بکری کا دودھ عجیب سی مہک والا تھا۔ سیتا نے بمشکل آدھا پیالہ پیا۔

"پی لے بیٹی! اور پی لے"۔ سیتا نے سر کے اشارے سے اور نہ پینے کا اظہار کیا اور پیالہ زمین پر رکھ دیا۔ دوسے نے پیالہ اٹھایا اور بقیہ دودھ خود پی لیا۔

دوسے نے اب اپنی بیچ میں سے جھولا بنی ہوئی چارپائی اٹھا کر سیتا کے پاس لا رکھی۔

"لے بیٹی اٹھ اور ادھر بیٹھ جا۔ موسم خراب ہے کوئی زہریلا کیڑا مکوڑا تجھے نقصان نہ پہنچا دے"۔

دوسا شفقت پدری کا اظہار کر رہا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وہ دنیا کی سب سے زہریلی مخلوق انسان کا شکار ہو چکی تھی۔ اس کا پورا خاندان لٹ چکا تھا۔ ماتا، پتا، بھائی چھن چکے تھے اس سے۔ اب صرف عزت اور دھرم باقی تھا۔ سیتا ہولے سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ پاؤں اس کے زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے مگر زنجیر کافی لمبی تھی۔ چارپائی اسے پلنگ اور بستر سے زیادہ نرم محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ بان کی انتہائی کھردری چارپائی تھی مگر تھکاوٹ اور نقاہت نے اس کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ دوسا چارپائی کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔

"کون ہے بیٹا تو اور ان لوگوں کے ہاتھ کیسے لگی ہے؟" دوسے نے ہمدردانہ لہجے میں سیتا سے پوچھا اور کہا۔ "مجھے تو تم کسی امیر گھر کی لگتی ہو۔ کہاں سے یہ لوگ تجھے لے آئے ہیں؟"

"میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں کون بدنصیب ہوں"۔ سیتا نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اگر بتا دیا تو آپ بھی رہی سہی کسر نکال دیں گے"۔

"نہ...... نہ بیٹی، ایسا مت سوچ!" دوسے نے کہا۔ "تو تو میری بیٹی کی طرح ہے"۔

"میں ایک ہندو لڑکی ہوں"۔ سیتا نے دوسے کی ہمدردی پا کر کہا۔ "میرا باپ ہری پور کا بہت بڑا سنار ہے۔ ان لوگوں نے رات کو ہمارے گھر میں ڈاکہ ڈالا

ہے۔ سب کچھ لوٹ لینے کے بعد یہ مجھے بھی لوٹ کا مال سمجھ کر اٹھا لائے ہیں"۔

"تُو ہندو ہے تو کیا ہے، ہے تو میری بیٹیوں جیسی"۔ دوسے نے کہا۔ "بیٹی! یہ ملک جابر بہت ظالم انسان ہے، یہ پہلے بھی یہاں کئی خاندانوں کی عزتوں کو تار تار کر چکا ہے۔ اب بیٹا! شاید تُو یہاں سے صحیح سلامت باہر نہ جا سکے...... میں ان کا مزارعہ ہوں، میری کوئی حیثیت نہیں ہے، میں مجبور ہوں...... بہت مجبور ورنہ میں تیرا ضرور ساتھ دیتا۔ میں تیرے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ دیکھ نا، اگر میں تجھے یہاں سے بھگانے میں مدد دوں تو وہ جابر کمینہ میری بیٹی کو برباد کر دے گا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ میرے خاندان کو ختم کر دے گا۔ دیکھ بیٹا! مجھے اپنی زندگی زیادہ عزیز نہیں ہے۔ میں نے دنیا میں جو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ پر وہ میری بیٹی...... اب نئی نئی جوان ہوئی ہے اور میرا بیٹا بھی تو ابھی بچہ ہے۔ یہ ظالم کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا"۔ دوسے نے سر جھکا لیا اور ٹپ ٹپ آنسو اس کے دامن کو بھگونے لگے۔

❁

عشاء کی نماز سے لوگ فارغ ہو چکے تھے۔ محسن پور کے لوگ اکثر رات کو چوپال میں بیٹھنے کے عادی تھے۔ وہ دن بھر کی تھکن کو دور کرنے کے لئے رات گئے تک چوپال میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتے اور اردگرد کے حالات کی خبر کا بھی چوپال واحد ذریعہ تھی۔ فسادات کے دن تھے، نیا نیا ملک قائم ہوا تھا۔ سادہ لوح لوگ ملک نواب کی چوپال میں آ کر زیادہ بیٹھتے تھے کیونکہ ملک نواب واحد آدمی تھا جس نے لوئر مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ لکھ پڑھ سکتا تھا اور انگریز سرکار کے ساتھ بھی اس کے خاصے اچھے مراسم تھے۔ لوگ اپنا خط لکھوانے اور پڑھانے کے لئے ملک نواب ہی کے مرہونِ منت تھے۔

قرب و جوار کی خبریں ملک نواب کی چوپال کی زاینت بنی ہوئی تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جانے کی خبریں اور مسلمان مہاجرین کی آمد اور وہاں ان پر ہونے والے مظالم کے تذکرے آج کل گفتگو کا موضوع بنے۔

اس دن طوفانی بارش ہوئی تھی۔ لوگوں کی تعداد معمول سے بہت کم تھی مگر پھر بھی چند لوگ ملک نواب کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ملک نواب خود گاؤ تکیے لگا کر پلنگ پر بیٹھتا تھا۔ اس کے بیٹے یا مہمان وغیرہ پاس رکھے ہوئے لکڑی کے موہڑوں پر بیٹھا کرتے تھے۔

ملک نواب کے دونوں بیٹے بھی ہری پور سے آئے ہوئے تھے، وہ بھی دن بھر کے حالات و واقعات سنا رہے تھے اور غریب دہقان بڑی دلچسپی اور انہماک سے سن رہے تھے۔ ملک نواب کے بڑے بیٹے نے کہا۔

"بابو جی کل رات بڑا عجیب حادثہ ہوا ہے۔ ہماری دُکان کے سامنے والا ہندو لالہ جی سنار ہے نا، اس کو کسی نے لوٹ لیا ہے۔ شہر میں ہندوؤں نے بہت احتجاج کیا ہے۔ آپ کو تو علم ہے کہ ہری پور میں ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور وہ سب کے سب اچھے کاروباری ہیں۔ سنا ہے کہ لوٹنے والے تین لوگ تھے۔ گھر سے تمام مال و دولت لے اڑے ہیں۔ لالہ جی، اس کی پتنی اور بیٹے کو رسیوں سے باندھ کر منہ بند کر کے پھینک گئے ہیں اور اس کی جوان سالہ بیٹی سیتا کو بھی جاتے وقت اٹھا کر ساتھ لے گئے ہیں۔ بابو جی! ہندو بہت خائف ہیں اور رہے لالہ جی تو اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ بہت زیادہ سہما ہوا لگ رہا تھا۔ مقامی پولیس والے بھی ان کو لالہ جی کے گھر لے گئے تھے۔ ضابطے کی کارروائی کر لی ہے انہوں نے بھی۔ بابو جی! ہندو اب یہ علاقہ چھوڑ جائیں گے۔ وہ بھی خوفزدہ لگ رہے تھے"۔

"ہاں بیٹا یہ تو بہت بُرا ہوا ہے"۔ ملک نواب نے

ساری بات سن کر کہا۔ "لالہ جی تو بہت اچھا تھا، پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہاں (بھارت میں) بھی تو یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ سکھ جتھوں کے جتھے ہندوؤں سے مل کر دن دیہاڑے لوٹ مار کر رہے ہیں۔ جائیدادیں چھین رہے ہیں۔ عورتوں کی عزتوں کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں...... اور ہاں، ذرا خیال رکھنا، اب جب یہ لوگ جانے کی تیاری کر رہے ہیں تو اپنی جائیدادیں اور مکان تھوڑا ساتھ لے کر جائیں گے، اونے پونے بیچ کر جائیں گے۔ تم دھیان رکھنا اور کوئی مناسب دُکان و مکان لے لینا کسی بنیے سے"۔ ملک نواب بڑا دور اندیش تھا، اس نے حالات کا قبل از وقت اندازہ لگا لیا تھا۔

ملک جابر اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ چوپال کے دروازے سے لگا تمام گفتگو سنتا رہا۔ دراصل وہ عام لوگوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ بڑے ملک صاحب کو مال پیش کیا جائے۔ چاندی کے سکوں کو ملک جابر نے پہلے ہی تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ہر ایک نے اپنے اپنے حصے کو اپنے کھیسے (جیب) میں ڈال لیا تھا۔ معاملہ اب صرف ان سونے کی پانچ اینٹوں کا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ لوگ ایک ایک کر کے بڑے ملک جی، منشی بابا سے اجازت لے کر گھروں کو پلٹنے لگے۔ تھوڑی دیر میں چوپال میں صرف ملک نواب اس کے بیٹے اور وفادار ملازم رہ گیا تھا۔ ملک جابر منہ کو چھپائے نظروں کو جھکائے اندر داخل ہوا۔ کریما اور غفورہ بھی ملک جابر کی معیت میں ہاتھ باندھے اندر داخل ہوئے۔

"سلام بابو جی!" ملک جابر نے بڑے ملک کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

"اوئے کدھر مر گیا تھا تُو دو دنوں سے؟" ملک نواب نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کبھی گھر میں بھی ٹک جایا کر۔ تیری ماں نے کل سے رولا ڈالا ہوا ہے تیرے لئے، کبھی کوئی سیدھا کام بھی کیا ہے تُو نے...... اور اس وقت کہاں سے آ رہے ہو اور ان دونوں لفنگوں کے لئے کہاں گھومتے رہتے ہو؟ حالات خراب ہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تم کو کاٹ کر پھینک دے اور ہمیں خبر تک نہ ہو"۔

"وہ ملک جی! ہم ہری پور سے آ رہے تھے تو راستے میں یہ گٹھڑی مل گئی ہے"۔ ملک جابر نے گٹھڑی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں لوٹ تو نہیں لیا تم نے کسی بدنصیب کو؟" ملک نواب نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔ "دکھاؤ کیا ہے، جاہل کہیں کے، پتا نہیں کیا اٹھا لائے ہیں"۔

"ملک جی! سونا لگتا ہے"۔ کریمے نے کہا۔

غفورے نے گٹھڑی ملک نواب کے سامنے رکھ دی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں بھی سونے کی اینٹیں چمک رہی تھیں۔ ملک نواب گھاگ آدمی تھا۔ فوراً تاڑ گیا کہ خالص سونا ہے۔ اتنا سونا دیکھ کر تو اس کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔

"اوئے حرامیو! تم یہ کیا اٹھا لائے ہو؟" اس نے مکاری سے کہا۔ "جاہل کہیں کے، بہت پاگل ہو۔ معلوم نہیں کہاں سے یہ وزن اٹھائے پھر رہے ہو۔ یہ بالکل نقلی ہیں۔ پیتل کی بنی ہوئی ہیں اور تم نے ان کو اصل سمجھ لیا تھا۔ اصل ہوتی تو تم جیسے احمقوں کو کون دیتا...... اچھا کسی کو بتایا تو نہیں تم نے؟"

"نہیں ملک جی! نہیں...... اللہ کی قسم ہے ہم نے یہ کسی کو بھی نہیں دکھائی ہیں۔ سیدھے آپ کے پاس آئے ہیں"۔ غفورے نے تیز تیز جواب دیا۔

"ان کو اٹھا کر مکان کی چھت پر پھینک دو"۔ ملک نواب نے غصے سے کہا۔ "یہ کسی کام کی نہیں ہیں، بالکل نقلی ہیں۔ اچھا کیا جو کسی اور کو نہیں بتایا تم نے اور ہاں، ذرا ادھر اُدھر دھیان سے جایا کرو، ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے...... یہ ابھی تیرا بھائی بتا رہا تھا کہ کل

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

رات ان کی دُکان کے سامنے والے لالہ جی ہندو کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ ڈاکو ہر چیز لے گئے ہیں اور ان کی جواں سالہ بیٹی کو بھی اٹھا لیا ہے انہوں نے۔ اچھا کیا تم نے جو کسی سے ذکر نہیں کیا اور ہاں، کریمے اور غفورے! دیکھو یہ کسی سے مذاق میں بھی نہ کہنا کہ ہمیں کچھ ملا ہے ورنہ خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ پولیس والے بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، پکڑ کر لے جائیں گے تم کو"۔

"نہیں نہیں ملک جی!" غفورہ اور کریما بیک زبان بولے۔ "توبہ کریں، ہم کسی سے بھول کر بھی ذکر نہیں کریں گے"۔

ملک جابر نے اپنے ملازم سے کہا صبح سویرے سویرے اینٹوں کو چھت سے اتار کر دریا کے پانی میں ڈال دینا۔ ہمارے سر کوئی نئی مصیبت نہ آن پڑے۔

"ٹھیک ہے ملک بابا!" ملازم نے ادب سے کہا۔

"اٹھو جا جبرو! جا کر اپنی ماں کو شکل دکھا، وہ کل سے تمہارا پوچھ رہی ہے اور تم بھی اپنے اپنے گھر کی راہ لو اور ہاں گھر میں بھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا"۔

وہ تینوں اٹھ کر اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ غفورہ تو چند سکوں پر بے حد خوش تھا مگر کریما جو ذرا عقلمند تھا، اس کے دل میں وسوسے اٹھ رہے تھے، وہ قدرے رنجیدہ تھا۔ اگلے روز صبح دس بجے کے قریب کریما اور غفورہ ملک جابر کی چوپال میں موجود تھے۔

"اٹھو یارو! اس چڑیا کی بھی خبر لیں"۔ ملک جابر نے ان کو دیکھ کر کہا۔ ایک بار پھر یہ تینوں ملک جابر کے ہمراہ بھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ ملک جابر نے بڑے ملک صاحب کو بتایا کہ ہم بھروں پر جا رہے ہیں"۔

"ذرا دوسے کی بھی خبر رکھنا"۔ ملک نواب نے کہا۔ "اب ٹھیک طرح کام نہیں کرتا، ہڈ حرامی کرنے لگا ہے"۔

ملک جابر اپنے دوستوں کے ہمراہ بھروں پر جا پہنچا جہاں وہ رات کو سیتا کو دوسے کے حوالے کر گئے تھے۔

"او دوسیا...... او دوسیا!" ملک جابر نے دور سے کھیتوں میں کام میں مصروف دوسے کو آواز دی۔

"جی سرکار! آیا جی"۔ دوسا پگڑی سیدھی کرتا ہوا تیز تیز قدموں سے چلتا ملک جابر کی طرف آیا اور ہاتھ باندھ کر سر کو جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ "جی سرکار! کیا حکم ہے؟"

"کیا حال ہے ہمارے رات والے مہمان کا، کچھ کھانے کو دیا ہے تُو نے یا......" ملک جابر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"جی سرکار! رات کو اسے بخار ہو گیا تھا"۔ دوسے نے کہا۔ "تھوڑی سی روٹی اس نے کھائی ہے اور تھوڑا سا دودھ میں نے زبردستی اسے پلا دیا"۔

"شاباش! اچھا کیا تُو نے، بہت سمجھ دار ہے تُو"۔ ملک جابر نے معنی خیز لہجے میں دوسے سے کہا۔ "آج اس کی بیمار پُرسی کے لئے ہی تو میں آیا ہوں۔ اس کے بخار کا علاج کریں گے ہم"۔

ملک جابر کی آنکھوں سے جھانکتی ہوس اور لہجے کا کمینہ پن بھانپ کر دوسے کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ وہ نظریں جھکائے بوجھل دل سے واپس کھیت کی طرف پلٹا۔

"یہ ظالم آج اس معصوم پر بہت ظلم کرے گا، اس کو برباد کر دے گا"۔ دوسا زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ "اللہ غارت کرے ملک جابر تجھے اور تیرے خاندان کو، کسی کی عزت تم سے محفوظ نہیں رہی ہے۔ ربا! تُو کب ان کی دراز رسی کو کھینچے گا؟"

سیتا تاحال کمبل میں لپٹی چارپائی پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ رات کو کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی، دن کس وقت چڑھا تھا اسے کوئی خبر نہ تھی۔ آج کا سورج

اس کے لئے کیا لے کر طلوع ہوا تھا، وہ اس سے بے خبر تھی۔ ملک جابر غفورے اور کریمے کے ہمراہ بھڑے کے اندر داخل ہوا تو اس نے سیتا کو کنڈلی مارے چارپائی پر کمبل میں لپٹا دیکھا۔ کمبل کے اندر اس کے پاؤں زنجیروں میں قید تھے۔ وہ مکمل طور پر بے بس اور اس کی دسترس میں تھی۔

"کھول دو اس کے تالے کو"۔ ملک جابر نے غرور سے کہا۔ "اب اس کے پاؤں ہماری جاگیر سے باہر نہیں جائیں گے"۔

غفورے نے جھٹ موٹی چابی نکالی اور اسے تالے میں لگا کر گھمانے لگا۔ چند چکر گھمانے کے بعد چابی نے تالے کا منہ کھول دیا۔ یہ پرانے دور کا کالے رنگ کا مضبوط تالا تھا۔ تالا کھولنے کے بعد غفورے نے زنجیر سے سیتا کے پاؤں کو آزاد کر دیا۔ سیتا کی نازک سی پنڈلیاں سوج گئی تھیں اور اس کی نازک جلد پر زنجیر سے نیلے رنگ کے دھبے بن گئے تھے۔ اس دوران بھی سیتا کو دنیا و مافیہا کو کوئی خبر نہ تھی۔

"اتار دے اس کا کمبل غفورے!" ملک جابر نے غفورے کو حکم دیا۔

غفورے نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سیتا پر پڑا کمبل اتار لیا۔ اب سیتا کا سارا وجود سامنے نظر آ رہا تھا مگر وہ تاحال بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اب ملک جابر کی درندگی نے ہولے ہولے کروٹیں لینا شروع کر دیں۔ اس نے جھٹ سے سیتا کے سنہری گرد آلود بالوں میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی جھٹکے سے معصوم بدن کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ سیتا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی تین مکروہ صورتیں کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ وہ سہم کر سر کو اپنے گھٹنوں کے اندر دبا کر بیٹھ گئی۔

"اب تک ناراض ہے رانی! ہم سے؟" ملک جابر نے مخمور سے لہجے میں کہا۔ "ابھی اسے راضی کرتے ہیں"۔ تینوں نے فاتحانہ قہقہہ لگایا۔

سیتا اب ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار تھی۔ اس کو اندازہ تھا کہ اب اس پر کیا گزرنے والی ہے۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ انتہائی مایوس و مجبور تھی وہ۔ وہ ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی کہ......

برسات میں شراب پینے کا بھی ایک خاص لطف ہوتا ہے اور وہ بھی اگر دیسی کشید کی ہوئی شراب ہو تو نشہ بازوں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

"اوئے کریمے نکال لا ذرا وہ گیلن بھی تاکہ نشہ دو آتشہ ہو جائے"۔

کریمے نے شراب کا گیلن نکال کر سامنے رکھ لیا اور تینوں نے شراب نوشی کی محفل جما لی۔ خوب جی بھر کر جام پیئے تھے ان تینوں نے۔

"ابے او غفورے! ذرا رانی کو بھی امرت دھارا چکھا دے، بہت غمگین ہے۔ بھول جائے گی غم سارے"۔ غفورہ جام لے کر سیتا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"لے رانی پی لے یہ تیرے غموں کو ختم کر دے گا"۔ سیتا نے سر اٹھا کر دیکھا اور دھکا دے کر جام غفورے کے ہاتھوں سے نیچے گرا دیا۔

"بہت مغرور ہے"۔ ملک جابر نے کہا۔ "ابھی تک اس کا غرور ختم نہیں ہوا۔ اٹھا لاؤ ذرا نیچے اسے، اس کی اکڑ توڑتا ہوں"۔

غفورے نے حکم ملتے ہی سیتا کو بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ غفورہ دیو ہیکل تھا اور وہ نازک پری۔ غفورے نے جھٹ سیتا کو دبوچ کر ملک جابر کے سامنے ڈال دیا۔ ملک جابر نے سیتا کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔ سیتا نے اپنے بچاؤ کے لئے بھرپور کوشش کی مگر وہ دھان پان سی لڑکی تین آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ غفورہ اور کریما سیتا کو دونوں بازوؤں سے تھامے ہوئے تھے اور ملک جابر برابر سیتا کے جسم کو نوچ رہا تھا۔ سیتا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

...تے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

غفورہ اور کریما تمام دن ملک جابر کے ساتھ بھرے میں رہے۔ ملک جابر نے سیتا کو اپنی مفتوح سلطنت سمجھ کر بری طرح تاراج کیا تھا۔ وہ لوٹ کا مال تھی اور مکمل طور پر لٹیرے کے پنجۂ ستم میں گرفتار تھی۔ سو اس نے جی بھر کے اسے لوٹا۔ شام کو وہ درندہ صفت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تباہ حال سیتا کو انتہائی خستہ حالت میں چھوڑ کر باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ دوسے کی بیوی ریشماں بھی کھیت میں دوسے کے ساتھ کام میں مگن تھی۔ ملک جابر نے دوسے کو اپنے پاس بلایا اور اسے سیتا کے بارے میں سمجھانے لگا کہ وہ اپنی بیوی سے کہے کہ سیتا کا خیال رکھے۔

''جی ملک جی! بلاکل فکر نہ کریں آپ''۔ دوسے نے فدویانہ انداز میں کہا۔

''اور ہاں، وہ کچھ کھانے کی چیزیں پڑی ہیں اس کو کھلا بھی دینا۔ کہیں بھوکی نہ مر جائے''۔ ملک جابر نے کہا۔ شام تک وہ تینوں واپس لوٹ گئے تھے۔

''دیکھ کاکے کی ماں! آج پھر غضب ہو گیا ہے، کمینہ ہے نا جابر......'' ملک جابر کے جاتے ہی دوسے نے ریشماں سے کہا۔

''آہستہ بول کاکی کے ابو! کوئی سن نہ لے۔ ہم ان لوگوں سے ٹکر نہیں لے سکتے''۔ ریشماں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ لوگ ایک معصوم لڑکی کو اٹھا کر رات کو یہاں لائے تھے''۔ دوسے نے غم و غصے سے بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب پورا دن انہوں نے بھرے میں گزارا ہے، اس بیچاری معصوم کا کیا حال کر دیا ہوگا انہوں نے...... جا کاکی کی ماں! جا، جلدی ذرا بھرے میں جا کر اس بدنصیب کی خبر لے''۔

ریشماں ہاتھ ملتے ہوئے بھرے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ اندر مدھم سی روشنی میں اسے سیتا کا ہیولا سا نظر آیا۔ ریشماں سیتا کے سرہانے کھڑی اسے غمزدہ نظروں سے دیکھنے لگی اور سیتا تباہ حال زمین پر بکھری پڑی تھی۔ سیتا کے چہرے اور بدن پر بے تحاشا خراشوں کے نشانات اس کی بے بسی کا ثبوت دے رہے تھے۔ جسم پر لگا خون اس پر بیتنے والی روداد سنا رہا تھا۔

''ہائے ربا! کتنا ظلم کیا ہے کمینوں نے تجھ پر''۔ ریشماں نے سیتا کی حالت دیکھ کر کہا اور پھر آگے بڑھ کر اس نے سیتا کو لباس پہنایا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور ریشماں مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ ریشماں نے باہر کھڑے دوسے کو آواز دی۔ کاکی کے ابو ذرا اندر آنا۔ دیکھو، کتنا ظلم کیا ہے ظالموں نے۔ ذرا میری مدد کرنا اسے اٹھانے میں۔ دوسے نے چارپائی پر کمبل بچھایا اور ریشماں کی مدد سے سیتا کو اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔

سیتا غم و اندوہ کی ماری کراہ رہی تھی۔ ادھر ریشماں اور دوسا اس کے سرہانے کھڑے ملک جابر کو کوس رہے تھے۔

''آج رات کاکی کی ماں تُو یہیں رک جا، تیری اسے ضرورت ہو گی''۔ دوسے نے ریشماں سے کہا۔ رات کو ریشماں نے سرسوں کا تیل گرم کر کے سیتا کے سارے بدن کی مالش کی کیونکہ عورت کے درد کو صرف عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔

دوسے نے اپنے کتے ''شیرو'' کو بھرے کے سامنے لا کر باندھ دیا اور خود بھرے کے اوپر چارپائی ڈال کر سو گیا۔ ریشماں نے بمشکل چند نوالے سیتا کو کھانے کے لئے رضامند کیا۔ دن یونہی گزرتے گئے ملک جابر سیتا کی روح کو گھائل کرتا رہا۔ اب تو وہ غفورے اور کریے کی بھی دسترس میں تھی۔ آخر جابر کے بچے کھچے کھانے کے حقدار وہی تو تھے۔ دونوں نے بھی بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔

❁

ادھر ملک نواب نے راتوں رات وہ سونے کی اینٹیں اپنے قبضے میں لے لیں اور اب یہ بات زبان زد عام ہو چکی تھی کہ ہری پور کے بہت بڑے سنار کو لوٹ لیا گیا ہے اور اس کی پانچ سونے کی اینٹیں بھی ڈاکو اڑا لے گئے ہیں۔ کریے کو پہلے ہی شک تھا کہ بڑے ملک نے ان کے ساتھ دھوکہ کی ہے۔ مگر وہ کسی کو یہ بات بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کیا یہ حرکت اس کے لئے اور اس کے خاندان کے لئے بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔

کریما تھا تو خاندان برادری والا مگر ملک نواب کی ٹکر کا نہیں تھا۔ کریے کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں، یہ منجھلا تھا۔ والد بھی اس کا زندہ تھا۔ گھر میں دولت کی فراوانی تھی کیونکہ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ ریشم کی تجارت کیا کرتے تھے۔ باقی بھائی کریے کے شریف تھے اور اپنے کام میں والد کا ہاتھ بٹاتے تھے مگر یہ بدمعاش تھا اور برے راستوں پر گامزن تھا۔ باپ اکثر اس منع کرتا تھا مگر وہ کسی کی بھی سننے کو تیار نہ تھا۔ کریے کے بھائی اور والد ریشم کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ سونے کی اینٹیں کریے کے لئے سوہان روح بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ ہر وقت انہی خیالات میں گم رہتا تھا مگر اب کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

اس بات کو تقریباً ایک ماہ گزر چکا تھا۔ کریے کی صحت اب خراب رہنے لگی۔ دراصل اس نے اس بات کو دل پر لے لیا تھا۔ اس روز شام سے کریے کی طبیعت سخت خراب تھی اسے مقامی حکیم سے دارو دوا دلوائی گئی مگر رات گزرنے کے ساتھ ساتھ کریے کی حالت مزید بگڑتی گئی۔ تمام بہن بھائی کریے کی چارپائی کے گرد جمع ہو چکے تھے اور کریما مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

''ہائے وہ سونا، ہائے میرے حصے میں تو کم از کم

داستان مردانِ حُر کی

اُندلس کی ناگن

عنایت اللہ کے قلم سے

● شراب کے اُس جام کی کہانی جس میں ہسپانیہ کو غرق کرنے کی سازشیں کی گئیں

● اُن مردانِ حُر کی داستانیں جن کے خون کے قطرے سرزمینِ اُندلس پر موتیوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔

● اُن حسین ناگنوں کے قصے جن کا زہر بالآخر اُبلتے لہو کو مسموم کر گیا۔

کتاب چھپ کر تیار ہے اپنے آرڈر سے مطلع فرمائیں۔

مکتبۂ داستان

26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

فون: 042-37356541

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ڈیڑھ کلو آتا تھا۔ میں نے کیا کیا خواب سجا رکھے تھے۔ ہائے ملک نواب...... ہائے ملک جابر میرا حصہ، میرا سونا......"

کریمے نے ایک زوردار قے کی جو مکمل خون پر مشتمل تھی بلکہ خون کے جمے ہوئے لوتھڑے بھی شامل تھے قے کے ساتھ۔ کریما سونا سونا پکارتے ہوئے راہی عدم ہو گیا۔ کریمے کے گھر والوں نے آہ و فغاں کرنا شروع کر دی۔ کریمے کی موت کی خبر تھوڑی ہی دیر میں پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ عورتیں، مرد کریمے کے گھر آ رہے تھے۔ ملک جابر اور غفورہ بھی خبر سنتے ہی بھاگے ہوئے اس کے گھر پہنچے۔ صبح دس بجے کریمے کی نماز جنازہ ادا ہوئی اور اسے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ کئی دن تک ملک جابر اور غفورہ بلاناغہ کریمے کے گھر میں جاتے اور اس کی قبر پر حاضری دیتے رہے۔ کریمے کی موت کا ان کو بے حد دکھ تھا۔ آخر وہ ان کا بہت ہی قریبی ساتھی تھا۔ ان کے سیاہ و سفید کارناموں میں بلاتامل شریک ہونے والا تھا۔

کریمے کو مرے چالیس دن بیت چکے تھے۔ ان کے گھر چالیسویں کا ختم تھا۔ ملک نواب نے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ تمام گاؤں کو کھانڈ چاول اور دیسی گھی کی دعوت کھلائی گئی۔ الغرض ملک نواب نے کریمے کے خاندان کے ساتھ انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ تو صرف مال ہضم کرنے کے لئے کیا گیا تھا تاکہ اس کے خاندان والے شک نہ کریں۔

کریمے کی موت کے تین روز تک ملک جابر سوگ میں رہا، وہ بالکل بھرڑوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ ہاں البتہ گاہے گاہے دوسے سے مکمل حالات کی خبر لیتا رہتا تھا۔ مہینے دنوں کی طرح بیت رہے تھے۔ وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔

❁

دوسری طرف سیتا کے والدین کا برا حال تھا۔ رادھا اور لالہ شرما دن رات اپنی بچی کے غم میں گھل رہے تھے۔ چند دنوں میں رادھا چارپائی کے ساتھ جا لگی اور لالہ شرما جی بھی غم کے بوجھ سے جھک گئے تھے۔ گویا تو جیسے گونگا ہو گیا تھا۔ وہ بالکل بول چال سے عاری ہو چکا تھا۔ بس غم کی ایک مجسم تصویر تھی لالہ کا گھر۔ لالہ جی نے بہت جتن کئے تلاش بسیار کی اپنی سیتا کے لئے مگر تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ہندو اور سکھ قافلوں کے قافلے بھارت روانہ ہو رہے تھے۔ عجیب کشمکش کا دور دورہ تھا۔ آئے روز ریلوے سٹیشن سے سینکڑوں لوگ روانہ ہو رہے تھے۔ لالہ جی اب بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں سیتا کو تلاش کرنے کے لئے کر لی تھیں۔

ملک نواب کے دونوں بڑے بیٹے۔ ملک بابر اور ملک ناصر لالہ جی کے پاس اکثر شام کو آتے اور اس سے روزانہ اظہار ہمدردی کرتے تھے اور ساتھ بیٹھ کر آنسو بھی بہاتے مگر یہ ان کے مگرمچھ کے آنسو تھے۔

"دکھ ملک! ہم نے بے ساتھ گزارے ہیں"۔ لالہ جی نے دکھی لہجے میں کہا۔ "کبھی کسی مسلمان کو تنگ نہیں کیا تھا۔ میں تو ہر ایک کی مدد بھی کرتا تھا۔ میں تم لوگوں کے دکھ درد کا برابر ساجھی تھا۔ پر آج دیکھ لو میرے ساتھ کتنا ظلم ہوا ہے۔ میرا کچھ بھی تو نہیں بچا۔ ہائے میری سیتا"۔

"جی لالہ جی! ہمیں آپ کے دکھ کا احساس ہے"۔ ملک بابر نے کہا۔ "ایک بار پتہ لگ جائے کہ کس حرام کے جنے نے یہ کام کیا ہے تو میں اس کا خون پی جاؤں"۔

"بس اب میں یہ دیش چھوڑ کر چلا جاؤں گا"۔ لالہ جی نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ "میری سیتا کی خبر لیتے رہنا۔ اگر کچھ پتا چل گیا تو اسے اپنے پاس رکھ لینا۔ اس کا دھیان رکھنا۔ تم تو اچھے لوگ ہو، خاندانی ہو۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے"۔

"جی لالہ جی! ہم تابعدار ہیں۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں"۔ ملک بابر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

❁

ہری پور کے مضافات سے تمام ہندو اور سکھ روانہ ہو چکے تھے۔ ہری پور شہر میں صرف چند گنے چنے ہندو رہ گئے تھے اور اگلی صبح کی ریل گاڑی سے وہ بھی جا رہے تھے۔ اسی لئے وہ اپنی جائیدادیں اونے پونے داموں بیچ رہے تھے۔ لالہ شرما نے بھی اپنی اس جنم بھومی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اس کا بچا ہی کیا تھا جو یہاں رہتا۔ ملک بابر اور ناصر شام کو لالہ جی کے گھر آ گئے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے۔ سنا ہے کہ کل آخری قافلہ بھارت کے لئے روانہ ہونا ہے اور آپ کا کیا پروگرام ہے؟

"ملک جی! اب میرا یہاں کیا بچا ہے جو یہاں رہوں گا"۔ لالہ جی نے کہا۔ "بس یہ کٹیا اور وہ دو دکانیں ہیں۔ بس ان کا کچھ ہو جاتا تو میں بھی......" لالہ جی کے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"نہ لالہ جی! اپنا دل چھوٹا نہ کریں"۔ ملک ناصر نے کہا۔ "ہم کس لئے ہیں، آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ آپ نے اگر جانے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو آپ ہمیں بتائیں جو ضرورت ہوگی ہم پورا کریں گے"۔

"ہمیں تم لوگوں ہی کا آسرا ہے"۔ رادھا رانی نے کرب ناک انداز میں کہا۔ "اب ہمارے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔ کرایہ کہاں سے لائیں۔ یہ دکانیں اور مکان بیچنا چاہتے ہیں مگر کوئی لینے کو تیار نہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں آخر ہم نے جانا تو ہے، یہ قبضہ کر لیں گے"۔

"نہ رانی جی! نہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم کس لئے ہیں۔ صبح آپ کا تمام انتظام کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں"۔ ملک بابر نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہم کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے...... اچھا اب ہم اجازت چاہتے ہیں"۔ ملک بابر اور ملک ناصر لالہ جی کے گھر سے باہر نکل آئے۔

"بھائی صاحب! لوہا گرم ہے چوٹ مار دینی چاہیے تھی"۔ ملک ناصر نے کہا۔

"تیرا دماغ خراب ہے"۔ ملک بابر نے کہا۔ "صبح کو کچھ لکھت پڑھت بھی تو کرانی ہے۔ اسٹامپ لکھوا لوں گا سالے سے۔ پیسے تو اب بھی میرے پاس تھے پر وہ کام اس وقت نہیں ہو سکتا تھا"۔

"بہت دور اندیش ہو بھائی صاحب!" ملک ناصر نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "میں تو ویسے دکانوں اور مکان پر قبضے کا سوچ رہا تھا۔ اب میرے دماغ میں آپ کی حکمت عملی آ گئی ہے"۔

اگلے روز گیارہ بجے ہری پور سٹیشن سے ہندوؤں کا آخری قافلہ روانہ ہونا تھا۔ ملک ناصر اور ملک بابر صبح سویرے لالہ جی کے سلام کے لئے حاضر ہو گئے۔

"نمستے لالہ جی! نمستے رانی جی!" دونوں نے بیک آواز کہا۔

"نمستے ملک صاحب! اتنی صبح صبح کیوں آپ نے تکلیف کی ہے؟" لالہ جی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"لالہ جی! بڑے ملک صاحب کو جب سے آپ کے جانے کا پتا چلا ہے تب سے بے چین ہیں"۔ ملک بابر نے کہا۔ "ہمیں نہار منہ روانہ کر دیا تھا انہوں نے کہ لالہ جی کو کچھ چیزیں پہنچا دو"۔ یہ کہہ کر ملک بابر نے جیب سے پانچ سو سو کے نوٹ نکال کر لالہ جی کے سامنے رکھ دیئے۔ "یہ بڑے ملک صاحب نے بھجوائے ہیں اور بھی دیتے پر آج کل ہمارے اپنے حالات لالہ جی کچھ پتلے ہیں ورنہ......" شرما جی اپنے سامنے پڑے پیسوں کو دیکھ رہے تھے۔

"اور ہاں!" ملک ناصر نے کچھ برتن سامنے رکھتے

ہوئے کہا۔ ’’رادھا رانی! یہ والدہ نے آپ کے لئے خصوصی طور پر کھانا تیار کروا کر بھجوایا ہے‘‘۔

’’بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے‘‘۔ رادھا رانی نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ’’کتنا پیار ہے ان لوگوں کو ہم سے، پر ہم......‘‘

ملک برادران نے لالہ جی کے خاندان کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ لالہ جی نے تمام تیاری رات کو کر رکھی تھی۔ سامانِ ضرورت باندھ لیا تھا۔ اب زادِ راہ بھی مل گیا تھا۔

’’ملک صاحب آپ کے پریوار نے ہمارا کتنا خیال رکھا ہے‘‘۔ رادھا رانی نے پُرنم آنکھوں سے کہا۔ ’’یہ ہم زندگی بھر نہیں بھول پائیں گے۔ بھگوان سے دعا ہے کہ وہ تم لوگوں کی رکھشا کرے اور اگلے جنم میں ہمیں پھر آپ لوگوں کا ساتھ نصیب کرے...... ملک جی میری سیتا کا ضرور کھوج لگاتے رہنا اگر مل گئی تو اپنی بیٹیوں کی طرح رکھنا اسے۔ ہم آپ کے احسان مند رہیں گے‘‘۔

’’نہ رانی! نہ ہمارا تم لوگوں پر کوئی احسان نہیں۔ آپ کو روانہ کرنے کو ہمارا جی تو نہیں چاہتا پر اب آپ کی مجبوری ہے۔ جہاں آپ خوش رہیں ہم خوش‘‘۔ ملک بابر نے کہا۔

’’ملک صاحب اب ہمارے بعد اس حویلی کے اور دُکانوں کے آپ ہی مالک ہیں۔ ان کو سنبھال لینا‘‘۔ لالہ جی نے لرزتی آواز میں کہا۔

’’نہ نہ لالہ جی! ہم ن یہ سب اس لالچ میں تو آکر نہیں کیا‘‘۔ ملک بابر نے روہانسی صورت بناتے ہوئے کہا۔ ’’ہمارا کچھ واسطہ نہیں ہے، آپ کی جائیداد سے۔ بیشک آپ کسی اور کو دے جائیں‘‘۔

’’آپ کے علاوہ ہمارا اور ہے ہی کون بھائی جی!‘‘ رادھا رانی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ’’بس یوں سمجھیں یہ اب سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ ہم نہ جانے بھارت پہنچ بھی پائیں گے یا راستے میں ہی......‘‘ رادھا رانی کی آواز بھر گئی اور وہ آنسو پونچھنے لگی۔

’’خدا تمہاری حفاظت کرے گا‘‘۔ ملک بابر نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ’’پر یہ بوجھ ہم اٹھانے کے قابل نہیں ہیں‘‘۔

’’بس ملک صاحب اب ہمارا دل نہ توڑنا‘‘۔ لالہ جی نے کہا۔ ’’ہمارے لئے آپ سے بڑھ کون ہے؟‘‘

’’بھائی صاحب! یہ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں‘‘۔ ملک ناصر نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’ان کے نکلتے ہی دُکانوں اور مکان پر لوگ قبضہ کر لیں گے تو پھر کیوں نہ ہم ہی دیکھ بھال کر لیں اس کی‘‘۔

’’تم سے اچھا اور کون ہے ملک جی!‘‘ رادھا رانی نے کہا۔ ’’یہ تم ہی سنبھالو، یہ سمجھ لو یہ ہماری خواہش ہے‘‘۔

’’اب آپ لوگوں کا اصرار ہے تو ایسے ہی سہی‘‘۔ ملک بابر نے جیسے بادل نخواستہ کہا۔ ’’دل تو نہیں مانتا پر آپ کو جاتے جاتے ناراض نہیں کر سکتا۔ بڑے ملک صاحب نے سخت منع کیا ہوا ہے۔ پھر خیر...... اگر آپ سب لوگوں کی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ پر وہ......‘‘ ملک بابر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

’’کیا کوئی دقت ہے ملک جی؟‘‘ لالہ جی نے استفسار کیا۔

’’بس وہ ذرا کچھ لکھت پڑھت ہو جاتی تو‘‘۔ ملک بابر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’تاکہ بعد میں کوئی قانونی پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں۔ آپ تو سمجھتے ہیں نا لالہ جی! بعد میں بہت مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہر کوئی لوٹ کا مال سمجھ کر دعوے دار بن جائے گا‘‘۔

’’ملک جی! آپ جس طرح چاہیں کر لیں‘‘۔ لالہ جی نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ’’ہم ہر طرح سے تیار

ہیں۔ آپ مجھ سے اسٹامپ لکھوا لیں‘‘۔

’’جیسے آپ کی مرضی ہے لالہ جی!‘‘

ملک بابر نے ناصر کو بھیجا کہ وہ جا کر ذرا منشی کو بلوا لائے تاکہ یہ کام ادھر گھر میں ہی ہو جائے۔ ناصر اسی وقت منشی کو لینے کے لئے چلا گیا۔ اس نے اسی وقت منشی کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور اس کا بستہ اٹھا لیا۔ وہ منشی کو لے کر تھوڑی دیر بعد لالہ جی کے گھر پہنچ گیا۔ منشی نے وہاں ملک بابر کو بیٹھے دیکھا تو ’’سلام ملک جی‘‘ بلند آواز میں کہا۔

’’آؤ جی منشی جی! آؤ‘‘۔ ملک بابر نے خوش دلی سے کہا۔ ’’تم سے کچھ کام ہے‘‘۔

’’کیا حکم ہے ملک جی؟‘‘

’’یہ لالہ جی کی خواہش تھی۔ تمہیں اس لئے تکلیف دی ہے‘‘۔ ملک بابر نے کہا۔ ’’لالہ جی تم سے کچھ لکھت پڑھت کروانا چاہتے ہیں‘‘۔ پھر ملک بابر نے لالہ جی کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’لالہ جی! منشی کو جو لکھوانا ہے لکھوا دیں‘‘۔

’’ملک جی! جو بہتر سمجھتے ہیں، منشی سے لکوا لیں۔ میں انگوٹھا لگا دوں گا‘‘۔ لالہ جی نے فراخ دلی سے کہا۔

ملک بابر نے منشی سے اپنی من مانی تحریر لکھوائی جس میں لالہ جی کی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے وارث صرف ملک نواب آف محسن پور کو بنا دیا۔ تمام قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ملک بابر نے لالہ جی سے کہا۔

’’لالہ جی! لیں آپ کی آخری خواہش بھی ہم نے پوری کر دی ہے۔ آپ یہاں اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگا دیں‘‘۔

لالہ جی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسٹامپ کو پکڑ کر مقررہ جگہ انگوٹھا لگا دیا۔ گواہان میں ملک نواب کے دونوں بیٹے ملک بابر اور ملک ناصر ڈالے گئے تھے۔ ملک بابر اپنی فتح پر بہت خوش تھا۔ یہ کام دن تقریباً دس بجے تک انجام پا گیا تھا۔

’’جا ناصر ذرا باہر سے ایک تانگے والا پکڑ کر لے آ‘‘۔ ملک بابر نے مصنوعی فکرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’لالہ جی کو سٹیشن تک پہنچا دیں۔ گاڑی کا وقت ہونے والا ہے‘‘۔

لالہ جی نے اپنا تمام سامان باہر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ملک ناصر ایک تانگہ لے آیا۔ تمام سامان تانگے میں رکھوا دیا گیا۔ دن تقریباً ڈھائی گھنٹے دس بجے ملک بابر لالہ جی کے پریوار کو لے کر ریلوے سٹیشن پہنچا۔ وہاں پر پہلے سے ہجوم جمع تھا۔ ملک جابر نے تین ٹکٹ لاہور کے لے لئے کیونکہ لاہور سے پھر آگے واہگہ بارڈر کے راستے ان لوگوں نے جانا تھا۔

ریلوے سٹیشن پر عجیب آپا دھاپی تھی۔ رونے اور چیخنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ اپنی جنم بھومی کو ایسے چھوڑ دینا کب آسان ہوتا ہے۔ دل میں ہزاروں دکھ چھپائے اور لاکھوں امیدیں سجائے لالہ جی کا پریوار دوسرے ہندوؤں کے ہمراہ ریل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جاتے جاتے رادھا رانی یہی کہہ رہی تھی ہائے میری سیتا، ہائے میری بچی تو نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ ریل کی سیٹی کی آواز بلند ہوئی اور ریل دھیرے دھیرے سٹیشن کو چھوڑنے لگی۔ دروازوں میں لٹکے لوگ اپنی دھرتی ماں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ’’اب ہم لوٹ کر دوبارہ نہیں آئیں گے۔ نہیں آئیں گے‘‘۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریل گاڑی سٹیشن کو چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

ملک بابر نے ملک ناصر کو حویلی کی حفاظت کے لئے پیچھے چھوڑ دیا تھا تاکہ کوئی غیر موجودگی میں قبضہ نہ کر لے۔ ملک برادران نے بازار میں موجود دونوں دُکانوں کو کھولا اور سارا دن وہیں بیٹھے رہے۔ ہر آنے جانے والے کو اسٹامپ دکھا رہے تھے اور بتلا رہے تھے کہ لالہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جی سے ہم نے یہ خرید لی ہیں۔ ملک بابر اور ملک ناصر نے وہ رات لالہ جی کی حویلی میں گزاری تا کہ ہر ایرے غیرے کو معلوم ہو جائے کہ یہ حویلی اب ملک برادران کی ملکیت ہے۔

اگلے روز پوری حویلی کی صفائی کرائی گئی۔ شہر میں حکومتی کارندے ان جگہوں کی نشاندہی کر رہے تھے جو ہندو چھوڑ کر گئے تھے تا کہ ریکارڈ مرتب ہو سکے۔ ملک بابر نے حکومتی کارندوں کو وہ اسٹامپ دکھا کر اپنا کام پکا کر لیا اور ملک ناصر کو حویلی میں چھوڑ کر گاؤں روانہ ہو گیا۔ شام سے پہلے وہ گھر پہنچ چکا تھا، وہ بہت خوش تھا۔ اس نے چوپال میں جا کر بڑے ملک صاحب کو سلام کیا۔

"پتر! کل سارا دن کہاں رہ گئے تھے؟ حالات ٹھیک نہیں ہیں، جلدی گھر لوٹ آیا کرو"۔ بڑے ملک نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"بابو جی! دراصل وہ کل لالہ جی بھارت روانہ ہو گئے تھے"۔ ملک بابر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں ان کے انتظام کرتا رہا ہوں تا کہ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ انہی چکروں میں دیر ہو گئی"۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، تُو تھکا ہوا ہو گا گھر جا کر کھانا کھا، باقی باتیں آرام سے کریں گے"۔ ملک نواب نے اسے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔

ملک نواب کی ایک مخصوص رگ پھڑک رہی تھی کہ میرے بیٹے نے یقیناً میدان مارا ہو گا۔ وہ سب کچھ جاننے کے لئے بہت بیتاب تھا اس لئے اس نے چوپال میں بیٹھے لوگوں سے سر درد کا بہانہ بنایا اور اپنی حویلی آ گیا۔

ملک نواب ملک بابر کی کارگزاری سننے کے لئے بے چین تھا۔ رات کا کھانا لگ چکا تھا۔ ملک نواب، ملک بابر اور ملک جابر کے ہمراہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے دوران باتیں بھی ہونے لگیں۔

"ہاں سناؤ کیا بنا اس ہندو بنیے کا؟" اس نے بیٹے سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں میں نے اس بنیے کو کیسے پھنسایا ہے"۔ بابر نے جیب سے اسٹامپ پیپر نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھیں سب کچھ آپ کے نام چڑھا دیا ہے"۔

اس نے اسٹامپ نواب کو دے دیا۔ ملک نواب اسٹامپ کو پڑھ رہا تھا اور مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی۔

"شاباش میرے شیر جوانو!" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ اب ہم ہری پور شہر میں بھی حویلی اور دُکانوں کے مالک ہیں۔ اب ادھر گاؤں میں ہماری ٹکر کا کوئی نہیں ہے"۔

ملک جابر سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے رویے میں لاتعلقی سی تھی۔

"اوئے جابر! دیکھ تیرے ویروں نے کیسا کارنامہ سرانجام دیا ہے"۔ نواب نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"بابو جی! میں نے بھی تو......" جابر نے کہنا چاہا۔

"ہاں میرے شہزادے! تُو نے بھی تو کمال کیا ہے"۔ نواب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ پورے پانچ کلو سونا ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ کریما مر گیا ہے۔ دفع ہو گئی ہے ورنہ اس کے تیور مجھے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ اب وہ غفورے کا بچہ......"

"بابو جی! آپ اس کی فکر نہ کریں"۔ جابر نے اطمینان سے کہا۔ "وہ ہے ہی اکیلا نہ کوئی آگے نہ پیچھے اور پھر وہ ہماری ہی پناہ میں ہے"۔

"اچھا ٹھیک ہے پتر!" نواب نے کہا۔ "پر ذرا ہوشیاری سے رہنا"۔

"بابو جی! وہ بنیے کی بیٹی بھی تو ابھی تک لاپتہ ہے"۔ بابر نے باپ کی توجہ سیتا کی گمشدگی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا بھی تو پتا کریں"۔

"کہاں ہے وہ سندر رانی؟" نواب نے جابر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مار تو نہیں دیا تم لوگوں نے اسے؟"

"وہ سیتا...... وہ زندہ ہے بابو جی!" جابر نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں چھپا رکھا ہے اسے تم نے؟" نواب نے گھور کر پوچھا۔

"بابو جی! وہ اپنے بھروں میں ہے"۔ جابر نے مجبوراً اقرار کرتے ہوئے کہا۔

"اب تک تو جی بھر چکا ہو گا تمہارا؟" نواب نے بے شرمی سے بیٹے کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "کتنے دنوں سے اس سے کھیل رہے ہو، اب صبح اس کو حویلی لے آؤ"۔

✸

سیتا کو ماں باپ سے بچھڑے عرصہ بیت چکا تھا۔ اب تو وہ دوسے اور اس کی بیوی سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔ سارا دن دوسے کے ساتھ زمینوں میں کام کاج کراتی اور اپنے من کا بوجھ ان لوگوں سے ہلکا کرتی رہتی۔ آئے دن وہ ملک جابر کی ہوس کا نشانہ بنتی۔ اب یہ بھی کوئی نیا کام اس کے لئے نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بے حس پتھر بنا لیا تھا جسے ٹھوکروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ دن تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا مگر رات وہ کرب میں گزارتی تھی۔ اپنے ماتا پتا کی یاد اسے بہت ستاتی تھی۔ اسے دوسے کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ ہری پور سے تمام ہندو ہجرت کر کے جا چکے ہیں۔ اسی لئے تو اب اسے اپنوں سے ملنے کی تمام تر امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب دوسا اور اس کی بیوی ہی اس کے لئے ماتا پتا تھے۔ جن کے ساتھ وہ دن بھر رہتی تھی اور اپنی مرضی سے کام کاج میں ہاتھ بٹاتی تھی۔

ہر چیز تو اس کی لٹ چکی تھی۔ نہ گھر رہا نہ گھر والے۔ نہ دولت نہ عزت۔ وہ انتہائی لاغر ہو چکی تھی۔ پچکے گال اڑا ہوا رنگ وقت نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ لاکھوں ارمان اس کے دل میں ہی دب کر رہ گئے تھے۔ اب تو وہ صرف موت کا انتظار کرتی تھی تا کہ اس سنسار سے اس کی جان چھوٹ جائے اور ممکن ہے کہ اگلے جنم میں اس کے ان تمام دکھوں کا مداوا ہو جائے۔ وہ یہی سوچتی تھی۔ وہ تو کب کی خودکشی کر چکی ہوتی مگر دوسے اور اس کے گھر والوں کی چاہت نے اسے اس قدم سے باز رکھا ہوا تھا۔ اب وہ جیسے دوسے کے گھر کی ایک فرد بن چکی تھی۔

اس روز شام سے پہلے ہی ملک جابر بھروں پر جا پہنچا۔ اس کا اس وقت جانا خلاف معمول تھا اس لئے ہی دوسے کو خدشہ محسوس ہوا۔

"خدا خیر کرے کاکے کی ماں!" دوسے نے دور سے جابر کو آتے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔

"کیا ہو گیا ہے کاکے کے ابو؟" دوسے کی بیوی نے دہل کر پوچھا۔ "تم تو ہر وقت جان نکال دینے والی باتیں کرتے ہو، اب کیا ہے؟"

"ہولے بول ہولے بول!" دوسے نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کمینہ آ رہا ہے، سن نہ لے"۔

"کون کمینہ؟"

"وہی سانپ کی اولاد ملک جابر"۔ دوسے نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اللہ خیر، یہ اس وقت کیوں یہاں آیا ہے؟ اللہ خیر کرے! ہائے سیتا بیچاری......"

"اوئے دوسیا...... اوئے دوسیا!" ملک جابر دور سے ہی پکارنے لگا۔ "ذرا ادھر آ میری بات سن"۔

"جی ملک جی! آیا"۔ دوسا جابر کی طرف دوڑتا ہوا گیا اور ہانپتا ہوا پوچھنے لگا۔ "جی ملک جی! کیا حکم

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہے؟ خیر تو ہے آپ اس وقت؟"

"ہاں خیر ہی ہے۔ اس بلبل کو شام کو اپنی بیوی کے ساتھ حویلی بھجوا دینا۔ وہ بڑے ملک صاحب کو پتا چل گیا ہے۔ وہ اب اُدھر ہی رہے گی"۔

"ٹھیک ہے سرکار! جو حکم آپ کا۔ وہ کاکی کی ماں کے ساتھ آ جائے گی"۔ جابر مطمئن ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔

"کیوں آیا تھا یہ پاپی؟" دوسے کی بیوی نے جابر کے جانے کے بعد پوچھا۔

"حکم سنانے آیا تھا"۔ دوسے نے کہا۔ "تم شام کو اس (سیتا) کو اپنے ساتھ لے جانا۔ بڑے ملک نے اس کو حویلی طلب کیا ہے"۔

"کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟"

"ہم تو حکم کے غلام ہیں بھلی لوک!" دوسے نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "ہم حکم عدولی نہیں کر سکتے"۔

شام کا وقت قریب آیا تو دوسے نے سیتا کو بتایا اسے حویلی میں بڑے ملک نواب نے طلب کیا ہے۔ تم اپنی چاچی کے ساتھ حویلی چلی جانا...... پتا نہیں تیری قسمت میں اور کیا کیا لکھا ہے؟"

"ٹھیک ہے چاچا! اب آپ کا ساتھ بھی چھوٹ جائے گا"۔ سیتا نے بے چارگی سے کہا۔

نہ بیٹا! نہ تُو دل چھوٹا نہ کر میں کاکی کی ماں کو ہر روز تیری خبر گیری کے لئے بھیج دیا کروں گا"۔ دوسے نے اس تسلی دیتے ہوئے کہا۔

شام ڈھلنے سے ذرا سا پہلے دوسے کی بیوی اور سیتا محسن پور کے ملک نواب کی حویلی میں پہنچ گئی تھیں۔ ملکہ نور جہاں (ملک نواب کی بیوی) المعروف بڑی مالکن صحن میں بچھے پلنگ پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ حویلی کے تمام نظام کو مانیٹر کر رہی ہو۔ بڑی مالکن کی تین بہوئیں تھیں۔ ملک بابر، ملک ناصر اور ملک جابر کی بیویاں۔ کسی کی کیا مجال کہ بڑی مالکن کے سامنے دم مارے۔ حویلی میں بچے بھی بڑی مالکن کے ڈر سے آہستہ بولتے تھے۔ ورنہ ان کا غصہ...... خدا کی پناہ۔

ٹھیک اسی وقت دوسے کی گھر والی سیتا کو ساتھ لے کر حویلی میں داخل ہوئی وہ سیدھی بڑی مالکن کے سامنے پیش ہوئی اور سر جھکا کر سلام کہا۔

"سناؤ آج کیسے حویلی کا رخ کیا ہے؟" بڑی مالکن نے نخوت بھرے انداز میں کہا۔ "کوئی ضرورت ہو گی تب ہی آئی ہو اور ساتھ تیرے یہ کون ہے؟" بڑی مالکن نے سر سے پاؤں تک سیتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ وہ مالکن......" دوسے کی بیوی گھبرا گئی کہ سیتا کے بارے میں کیا کہے۔ عین اسی وقت ملک جابر حویلی میں داخل ہوا۔

"ماں جی! یہ وہ ہندو لڑکی ہے جو والدین سے بچھڑ گئی تھی۔ بابا نے اسے بلوایا ہے"۔ بڑی مالکن فوراً ساری بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے، اسے چھوڑ جاؤ۔ بڑے ملک صاحب آئیں گے تو بات ہو گی۔ جا لڑکی تُو ذرا رات کا کھانا تیار کرنے میں باورچی خانے میں مدد کرو"۔

سیتا نے بغیر جواب دیئے سر ہلا دیا۔

حویلی میں تمام لوگ اجنبی تھے۔ سیتا کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ تو جیسے بالکل انوکھی مخلوق ہو۔ ایسے حویلی کے ملازم اس کو گھور رہے تھے۔ ملک نواب رات کے کھانے پر بیٹھا تو بڑی مالکن نے اس کو سیتا کے بارے میں بتایا ملک بابر، ملک ناصر اور ملک جابر بھی موجود تھے کھانے پر۔ ملک نواب نے سیتا کو بلوا بھیجا۔ سیتا پلو میں منہ چھپائے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"سنا ہے لڑکی تمہارے والدین یہ دھرتی چھوڑ کر چلے گئے ہیں"۔ ملک نواب نے جان بوجھ کر انجان بنتے

ہوئے سیتا سے کہا۔ "اور بھاگ دوڑ میں تُو ان سے بچھڑ گئی ہے...... خیر کوئی بات نہیں، ہم بھی تیرے اپنے ہی ہیں۔ اب تُو یہاں ہماری حویلی میں رہے گی۔ تجھے کسی چیز کی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ میں تیرے والدین کی کھوج لگانے کی کوشش کروں گا۔ اگر پتا چل گیا تو میں تمہیں ان تک پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔ اب اگر اکیلے تمہیں بھارت روانہ کر دوں تو تُو جوان ہے اکیلی ہے، کہاں کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ اپنے والدین کو اور کیا خبر حالات خراب تھے وہ زندہ بچے بھی ہیں یا راستے میں ہی مارے گئے ہیں"۔ سیتا کے دل کو جیسے کسی نے ہاتھ میں دبا لیا ہو۔ وہ خاموش سنتی رہی۔

"آپ اس کو حویلی کے کام کاج سمجھا دینا"۔ ملک نواب نے بڑی مالکن سے کہا۔ "اور اس کا دھیان رکھنا"۔

"ٹھیک ہے جی!" بڑی مالکن نے کہا اور سیتا سے مخاطب ہوئی۔ "اب تُو جا لڑکی!"

سیتا کے لئے یہ تمام چہرے مانوس تھے۔ ملک بابر اور ملک ناصر کو وہ اکثر اپنے گھر میں دیکھتی رہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ یہ سلوک کریں گے۔ اس کا دماغ جھلا گیا تھا۔ تو یہ سارا کیا دھرا ان لوگوں کا ہے۔ بڑے کمینے ہیں یہ لوگ، بڑے نمک حرام ہیں۔ سیتا نے دل ہی دل میں سوچا۔

وقت کی گاڑی کا پہیہ رواں رہا۔ پورے محسن پور میں سیتا کے تذکرے ہو رہے تھے اور لوگ ملک نواب کی دریا دلی کے ترانے گا رہے تھے۔ زبان زد عام تھا کہ ملک نواب نے بہت دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہے کہ ایک ہندو لڑکی کو پناہ دی ہے۔ ملک نواب بہت نیک دل انسان ہے۔ ورنہ کون پرائے دھن کو سہارا دیتا ہے اور ایسے لاوارث کو تو کوئی بھی سہارا نہیں دیتا۔

لیکن لوگوں کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس بیچاری کو اس حالت میں پہنچانے میں ملک نواب کے خاندان کا کتنا گھناؤنا کردار ہے۔ عام لوگ ان تمام حالات سے بے خبر تھے۔

وقت گزرتا رہا، سیتا بھی حویلی کے باشندوں سے مانوس ہو چکی تھی۔ اسے والدین سے بچھڑے تین برس بیت چکے تھے۔ وہ گھنٹوں بڑی مالکن کی ٹانگیں دباتی تھی۔ بڑی مالکن بھی اس سے بہت پیار کرتی تھی۔

ایک رات سیتا بڑی مالکن کی ٹانگیں دبانے لگی تو اس نے سیتا سے کہا۔ ذرا میرے سر کی مالش کر دے، آج ذرا سر درد کر رہا ہے۔ سیتا خالص سرسوں کے تیل سے بڑی مالکن کے سر کو تر کر کے ہلکے ہاتھوں سے مالش کرنے لگی۔

"دیکھ سیتا! تُو کب تک اپنے پریوار کا انتظار کرے گی"۔ بڑی مالکن نے سیتا سے کہا۔ "وہ تو چلے گئے، وہ اب واپس آنے والے نہیں اور نہ ہی تُو اب وہاں جا سکتی ہے۔ دیکھ اب تم نے باقی زندگی یہاں ہی گزارنی ہے۔ اکیلے زندگی تو نہیں گزر سکتی نا۔ میں عورت ہوں سمجھتی ہوں عورت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مرد کے بغیر عورت ادھوری ہوتی ہے"۔

"بڑی مالکن میں تو...... میں تو ہندو ہوں، میرے ساتھ کون شادی کرے گا"۔

"ارے پگلی! اب تیرا نہ کوئی آگے ہے، نہ پیچھے اب تُو دھرم ورم کو چھوڑ اور سیدھی طرح مسلمان ہو جا تاکہ تیری شادی کرا دی جائے"۔

"نہ مالکن! نہ میں جان دے سکتی ہوں پر دھرم نہیں چھوڑ سکتی"۔ سیتا نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بڑی مالکن اب ایک یہ دھرم ہی تو میرے پاس بچا ہے۔ میں مر جاؤں گی، دھرم نہیں چھوڑوں گی"۔

(جاری ہے)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں بھول نہیں سکتا

ضمیر کا مجرم

بیدل شاہ معصوم تھا اور اس کو موت کی سزا دینا میرے ضمیر پر ایک بوجھ تھا اور وہ بوجھ میں اپنی جان دے کر اتار رہا ہوں۔

☆ محمد رضوان قیوم
ایم اے سیاسیات، ایم اے تاریخ

پاکستان کمیونٹی سنٹر ڈنمارک کی طرف سے رضوان قیوم صاحب کو بھیجا گیا تعریفی خط

Appreciation Letter

AWARDED TO

Mr.Rizwan Qayum S/O M Qayum

In recognition of notable contribution to Pakistani community by writing the following books inspired by real stories

1-Karbe Mazee		
2-Sidra		

Please accept our thanks and congratulations on the success of your recent books named *'Karbe Mazee'* and *'Sidra'* among the Pakistani community in Denmark. We think both stories were great motivator for the civil society living abroad. While much has been written on this topic, your books (novels) based on real stories that expresses both the positive and negative aspects of this important topic, without taking an emotional stance on either side of the issue. Your books help us realize that our problems are typical, and we can solve them in constructive ways. It's honor to have your both books as part of our library under *'Danish Cultural Library'* of Denmark.

Thank you and keep these good works coming.

All the best from Partners group,
Pakistan Community Center Denmark
Danish Cultural Library (DCL) Denmark
University of Southern Denmark
1000 København C (Copenhagen City)
Denmark.
Ph: +45 05 04 37 11

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قبرستان کا تصور ذہن میں آتے ہی دل خوف میں جکڑا جاتا ہے اور تصور میں ایک ایسی جگہ آ جاتی ہے جہاں ہر طرف ویرانی کا راج ہوتا ہے، جہاں بھوت پریت بسیرا کرتے ہیں۔ رات تو رات دن میں لوگ جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ وہاں اپنی مرضی سے کوئی بھی جانا نہیں چاہتا لیکن جو مر جاتا ہے اس کی مرضی نہیں پوچھی جاتی، بس نہلا دھلا کر کفن دے کر اسے وہاں چھوڑ آتے ہیں۔ آگے مرنے والا جانے اور اس کے اعمال...... یہی دین کا حکم ہے۔ مگر ایک شخص ایسا ہے جو خوشی خوشی قبرستان میں رہتا ہے۔ نہ اسے مُردوں سے ڈر لگتا ہے نہ قبرستان میں بسنے والی چڑیلوں سے۔ اللہ نے اس کا رزق قبرستان سے وابستہ کر دیا ہے۔ کسی انسان کی موت اس کے لئے روزی کمانے کا باعث بن جاتی ہے...... ہر بندہ اللہ سے رزق میں اضافے کے لئے دعا مانگتا ہے...... پتا نہیں گورکن بھی یہ دعا کرتا ہوگا یا نہیں کہ یااللہ زیادہ مُردے بھیج، میں نے فلاں کام کرنا ہے یا بیٹی کی شادی کرنی ہے۔

یہی بات میں نے گورکن اصغر حیدر سے پوچھی تو ان پچاسی سالہ بزرگ نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کانوں کی لوؤں کو چھوا۔

"یہ دنیا اور اس کا نظام اللہ کے حکم سے چل رہا ہے"۔ انہوں نے کہا۔ "سب کا روزی رساں وہی ہے، وہ ہمیں بھی دیتا ہے، ہمیں کبھی ایسی دعا مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ ہم سے بے خبر نہیں ہے"۔

"آپ کو یہاں خوف نہیں آتا؟" میں نے پوچھا۔ "لوگ کہتے ہیں قبرستان میں چڑیلیں ہوتی ہیں جو انسان کا کلیجہ منہ کے راستے نکال لیتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کوئی چڑیل دیکھی یا کسی بھوت سے واسطہ پڑا؟"

"یہ سب لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں"۔ انہوں نے کہا۔ "میری اتنی عمر ہو گئی ہے، میں نے آج تک کوئی ایسی مخلوق نہیں دیکھی...... ہمارے بچے سارا دن قبروں میں کھیلتے ہیں اور بعض اوقات پرانی قبروں سے نکلنے والی ہڈیاں بھی اٹھا لاتے ہیں جو کسی جانور نے نکالی ہوتی ہیں۔ ہم ان ہڈیوں کو احترام سے دفن کر دیتے ہیں...... سچ پوچھو تو مجھے ان مُردوں سے انسیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے"۔

"آپ کی ساری عمر اسی کام میں گزر گئی"۔ میں نے کہا۔ "آپ نے اپنی اتنی لمبی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ دیکھا ہو جو ناقابل فراموش ہو؟"

"واقعات تو بہت سے ہیں"۔ انہوں نے کہا۔ "لیکن ایک واقعہ بڑا عجیب تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ میں جب شعور کی منزلیں طے کرتا بچپن سے آگے بڑھا تو میرے باپ نورو خان نے مجھے اپنے کام کی تربیت دینی شروع کر دی۔ قبر کی کھدائی، لپائی میں میں اپنے باپ کی مدد کرنے لگا تھا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ ہم ان دنوں موجودہ بھارت کے شہر پونہ میں رہتے تھے۔ وہاں بڑے قبرستان میں ہمارا ٹھکانہ تھا۔

ایک دن میں اپنے باپ کے ساتھ مل کر ایک قبر کھود رہا تھا۔ ایک عورت کے لواحقین ہمیں قبر تیار کرنے کے لئے کہہ گئے تھے۔ ابا قبر کے اندر کھڑا ہو کر مٹی کھود کھود کر باہر پھینک رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بڑی شاندار کار قبرستان میں بنی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی آئی اور رک گئی۔ اس میں سے پہلے پچھلے دروازے سے دو ہندوستانی بابو اترے۔ ایک نے بڑھ کر اگلا دروازہ کھولا تو اس میں سے ایک گورا برآمد ہوا۔ وہ لوگ سیدھے ہمارے پاس آئے۔ ابا ان کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس نے اندر سے بیلچہ بھر کے مٹی باہر پھینکی کچھ مٹی گورے صاحب کے چمکتے جوتوں پر جا پڑی۔

"او بابا! دھیان سے کام کرو"۔ ایک ہندوستانی نے ڈپٹ کر ابا سے کہا۔ "دیکھتے نہیں صاحب آئے ہیں"۔

ابا نے سر اٹھا کر باہر دیکھا تو ایک گورے کو دیکھ کر گھبرا گیا اور فوراً گینتی بیلچہ وہیں پھینک کر قبر سے باہر آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"معافی چاہتا ہوں صاحب!" ابا نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے آپ کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی"۔

"کوئی بات نہیں مسٹر انڈر ٹیکر!" گورے نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مسٹر کیسل ہیں"۔ ہندوستانی بابو نے کہا۔ "ریٹائرڈ جسٹس دہلی ہائی کورٹ اور یہ ان کے ساتھ بھیم کمار جی ہیں سینئر ریکارڈ کیپر پولیس جیل خانہ جات اور میں کمل سنگھ رجسٹرار سپریم کورٹ ہوں"۔

ابا نے ان لوگوں کے بھاری بھرکم عہدے سنے تو لرزنے لگے اور تقریباً رکوع کی حالت میں چلے گئے۔

"حضور مائی باپ حکم فرمائیں!"

"کمل سنگھ تم اس سے بات کرو"۔ مسٹر کیسل نے کمل سنگھ کو حکم دیا۔

"میں ایک معمولی سا گورکن ہوں کمل صاحب!" ابا نے کمل سنگھ سے کہا۔ "میرا کمزور دل ڈوبنے لگا ہے۔ کیا مجھ سے انجانے میں کوئی خطا ہو گئی ہے؟"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں"۔ کمل سنگھ نے ابا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا ایک طرف آ کر میری بات سنو۔ ایک مسئلہ ہے جو تمہیں حل کرنا ہے"۔ پھر وہ ابا کو ذرا پرے لے گیا اور کہنے لگا۔ "یہ گورا بڑی سنکی قسم کا بندہ ہے لیکن اسے برداشت کرنا پڑتا ہے کہ یہ ہمارا آقا ہے اور ہم ہندوستانی غلام"۔

"آپ حکم کرو، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔ ابا نے کہا۔

"بابا جی! ہمیں ایک قبر کی تلاش ہے"۔ کمل سنگھ نے ابا سے کہا۔

"یہاں تو ہر طرف قبریں ہی قبریں ہیں صاب!" ابا نے کہا۔ "کیا آپ کو کسی خاص قبر کی تلاش ہے؟"

"ہاں، ہمیں ایک خاص قبر کی تلاش ہے"۔ کمل سنگھ نے کہا۔ "پچھلے سال جسٹس کیسل صاحب نے ایک شخص کو موت کی سزا سنائی تھی اور ہماری معلومات کے مطابق اسے پھانسی کے بعد اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا"۔

"یہ گورا اس قبر کا کیا کرے گا؟" ابا نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ اس قبر والے سے معافی مانگنے آیا ہے"۔ کمل سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس شخص کے مرنے کے خاصے عرصے بعد مسٹر کیسل کے علم میں یہ بات آئی کہ اس شخص کو غلطی سے موت کی سزا سنا دی گئی تھی۔ مسٹر کیسل اپنے اس غلط فیصلے پر بے حد شرمندہ ہیں اور ان کا ضمیر ہر وقت ان کی لعنت ملامت کرتا رہتا ہے"۔

"مجھے اس شخص کا کوئی اتا پتا بتائیں"۔ ابا نے کہا۔ "کوئی سرا میرے ہاتھ میں ہوگا تو میں اس کی قبر تلاش کر سکوں گا"۔

کمل سنگھ نے بھیم کمار کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اس بے گناہ ملزم کے بارے میں تفصیل معلوم کرنے لگا۔ دونوں کچھ دیر آپس میں بات کرتے رہے پھر کمل سنگھ نے ابا کو بتایا کہ اس بندے کا نام بیدل شاہ تھا۔ باپ کا نام رجب علی قوم راجپوت اور گاؤں کا نام کھیڑا تھا۔ وہ فلاں فلاں تاریخ کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس قبرستان میں دفن کیا گیا۔

"اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے؟" ابا نے سوال کیا۔ "جو اس کی لاش کے ساتھ قبرستان آیا ہو۔ یا ایسا کوئی آدمی جس نے لاش وصول کی ہو"۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قبرستان کا تصور ذہن میں آتے ہی دل خوف میں جکڑا جاتا ہے اور تصور میں ایک ایسی جگہ آ جاتی ہے جہاں ہر طرف ویرانی کا راج ہوتا ہے، جہاں بھوت پریت بسیرا کرتے ہیں۔ رات تو رات دن میں لوگ جاتے ہوئے خوف کھاتے ہیں۔ وہاں اپنی مرضی سے کوئی بھی جانا نہیں چاہتا لیکن جو مر جاتا ہے اس کی مرضی نہیں پوچھی جاتی، بس نہلا دھلا کر کفن دے کر اسے وہاں چھوڑ آتے ہیں۔ آگے مرنے والا جانے اور اس کے اعمال...... یہی دین کا حکم ہے۔ مگر ایک شخص ایسا ہے جو خوشی خوشی قبرستان میں رہتا ہے۔ نہ اسے مُردوں سے ڈر لگتا ہے نہ قبرستان میں بسنے والی چڑیلوں سے۔ اللہ نے اس کا رزق قبرستان سے وابستہ کر دیا ہے۔ کسی انسان کی موت اس کے لئے روزی کمانے کا باعث بن جاتی ہے...... ہر بندہ اللہ سے رزق میں اضافے کے لئے دعا مانگتا ہے...... پتا نہیں گورکن بھی یہ دعا کرتا ہوگا یا نہیں کہ یا اللہ زیادہ مُردے بھیج، میں نے فلاں کام کرنا ہے یا بیٹی کی شادی کرنی ہے۔

یہی بات میں نے گورکن اصغر حیدر سے پوچھی تو ان پچاسی سالہ بزرگ نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کانوں کی لوؤں کو چھوا۔

''یہ دنیا اور اس کا نظام اللہ کے حکم سے چل رہا ہے''۔ انہوں نے کہا۔ ''سب کا روزی رساں وہی ہے، وہ ہمیں بھی دیتا ہے، ہمیں کبھی ایسی دعا مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ ہم سے بے خبر نہیں ہے''۔

''آپ کو یہاں خوف نہیں آتا؟'' میں نے پوچھا۔ ''لوگ کہتے ہیں قبرستان میں چڑیلیں ہوتی ہیں جو انسان کا کلیجہ منہ کے راستے نکال لیتی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کوئی چڑیل دیکھی یا کسی بھوت سے واسطہ پڑا؟''

''یہ سب لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں''۔ انہوں نے کہا۔ ''میری اتنی عمر ہو گئی ہے، میں نے آج تک کوئی ایسی مخلوق نہیں دیکھی...... ہمارے بچے سارا دن قبروں میں کھیلتے ہیں اور بعض اوقات پرانی قبروں سے نکلنے والی ہڈیاں بھی اٹھا لاتے ہیں جو کسی جانور نے نکالی ہوتی ہیں۔ ہم ان ہڈیوں کو احترام سے دفن کر دیتے ہیں...... سچ پوچھو تو مجھے ان مُردوں سے انسیت محسوس ہوتی ہے۔ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتے''۔

''آپ کی ساری عمر اسی کام میں گزر گئی''۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنی اتنی لمبی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ دیکھا ہو جو ناقابل فراموش ہو؟''

''واقعات تو بہت سے ہیں''۔ انہوں نے کہا۔

''لیکن ایک واقعہ بڑا عجیب تھا جو مجھے آج تک یاد ہے۔ میں جب شعور کی منزلیں طے کرتا بچپن سے آگے بڑھا تو میرے باپ نوروز خان نے مجھے اپنے کام کی تربیت دینی شروع کر دی۔ قبر کی کھدائی، لپائی میں مَیں اپنے باپ کی مدد کرنے لگا تھا۔ یہ 1946ء کی بات ہے۔ ہم ان دنوں موجودہ بھارت کے شہر پونہ میں رہتے تھے۔ وہاں بڑے قبرستان میں ہمارا ٹھکانہ تھا۔

ایک دن میں اپنے باپ کے ساتھ مل کر ایک قبر کھود رہا تھا۔ ایک عورت کے لواحقین ہمیں قبر تیار کرنے کے لئے کہہ گئے تھے۔ ابا قبر کے اندر کھڑا ہو کر مٹی کھود کھود کر باہر پھینک رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بڑی شاندار کار قبرستان میں بنی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی آئی اور رک گئی۔ اس میں سے پہلے پچھلے دروازے سے دو ہندوستانی بابو اترے۔ ایک نے بڑھ کر اگلا دروازہ کھولا تو اس میں سے ایک گورا برآمد ہوا۔ وہ لوگ سیدھے ہمارے پاس آئے۔ ابا ان کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ اس نے اندر سے بیلچہ بھر کے مٹی باہر پھینکی کچھ مٹی گورے صاحب کے چمکتے جوتوں پر جا پڑی۔

''او بابا! دھیان سے کام کرو''۔ ایک ہندوستانی نے ڈپٹ کر ابا سے کہا۔ ''دیکھتے نہیں صاحب آئے ہیں''۔

ابا نے سر اٹھا کر باہر دیکھا تو ایک گورے کو دیکھ کر گھبرا گیا اور فوراً گینتی بیلچہ وہیں پھینک کر قبر سے باہر آ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

''معافی چاہتا ہوں صاحب!'' ابا نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے آپ کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی''۔

''کوئی بات نہیں مسٹر انڈر ٹیکر!'' گورے نے کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ مسٹر کیسل ہیں''۔ ہندوستانی بابو نے کہا۔ ''ریٹائرڈ جسٹس دہلی ہائی کورٹ اور یہ ان کے ساتھ بھیم کمار جی ہیں سینئر ریکارڈ کیپر پولیس جیل خانہ جات اور میں کمل سنگھ رجسٹرار سپریم کورٹ ہوں''۔

ابا نے ان لوگوں کے بھاری بھرکم عہدے سنے تو لرزنے لگے اور تقریباً رکوع کی حالت میں چلے گئے۔

''حضور مائی باپ حکم فرمائیں!''

''کمل سنگھ تم اس اسے بات کرو''۔ مسٹر کیسل نے کمل سنگھ کو حکم دیا۔

''میں ایک معمولی سا گورکن ہوں کمل صاحب!'' ابا نے کمل سنگھ سے کہا۔ ''میرا کمزور دل ڈوبنے لگا ہے۔ کیا مجھ سے انجانے میں کوئی خطا ہو گئی ہے؟''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں''۔ کمل سنگھ نے ابا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ذرا ایک طرف آ کر میری بات سنو۔ ایک مسئلہ ہے جو تمہیں حل کرنا ہے''۔ پھر وہ ابا کو ذرا پرے لے گیا اور کہنے لگا۔ ''یہ گورا بڑی سنکی قسم کا بندہ ہے لیکن اسے برداشت کرنا پڑتا ہے کہ یہ ہمارا آقا ہے اور ہم ہندوستانی غلام''۔

''آپ حکم کرو، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔ ابا نے کہا۔

''بابا جی! ہمیں ایک قبر کی تلاش ہے''۔ کمل سنگھ نے ابا سے کہا۔

''یہاں تو ہر طرف قبریں ہی قبریں ہیں صاب!'' ابا نے کہا۔ ''کیا آپ کو کسی خاص قبر کی تلاش ہے؟''

''ہاں، ہمیں ایک خاص قبر کی تلاش ہے''۔ کمل سنگھ نے کہا۔ ''پچھلے سال جسٹس کیسل صاحب نے ایک شخص کو موت کی سزا سنائی تھی اور ہماری معلومات کے مطابق اسے پھانسی کے بعد اسی قبرستان میں دفن کیا گیا تھا''۔

''یہ گورا اس قبر کا کیا کرے گا؟'' ابا نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ اس قبر والے سے معافی مانگنے آیا ہے''۔ کمل سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس شخص کے مرنے کے خاصے عرصے بعد مسٹر کیسل کے علم میں یہ بات آئی کہ اس شخص کو غلطی سے موت کی سزا سنا دی گئی تھی۔ مسٹر کیسل اپنے اس غلط فیصلے پر بے حد شرمندہ ہیں اور ان کا ضمیر ہر وقت ان کی لعنت ملامت کرتا رہتا ہے''۔

''مجھے اس شخص کا کوئی اتا پتا بتائیں''۔ ابا نے کہا۔ ''کوئی سرا میرے ہاتھ میں ہوگا تو میں اس کی قبر تلاش کر سکوں گا''۔

کمل سنگھ نے بھیم کمار کو بھی اپنے پاس بلا لیا اور اس بے گناہ ملزم کے بارے میں تفصیل معلوم کرنے لگا۔ دونوں کچھ دیر آپس میں بات کرتے رہے پھر کمل سنگھ نے ابا کو بتایا کہ اس بندے کا نام بیدل شاہ تھا۔ باپ کا نام رجب علی قوم راجپوت اور گاؤں کا نام کھیڑا تھا۔ وہ فلاں فلاں تاریخ کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس قبرستان میں دفن کیا گیا۔

''اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں ہے؟'' ابا نے سوال کیا۔ ''جو اس کی لاش کے ساتھ قبرستان آیا ہو۔ یا ایسا کوئی آدمی جس نے لاش وصول کی ہو''۔

WWW.AOURDUBOOKS.NET

''یہی تو مصیبت ہے بابا جی!'' بھیم کمار نے کہا۔ ''اسے لاوارثوں کی طرح دفنا دیا گیا تھا''۔

''میرے پاس اس قبرستان کے مُردوں کا ریکارڈ نہیں ہوتا''۔ ابا نے بتایا۔ ''مجھے ٹھیکیدار سے مردہ پرچی ملتی ہے تو میں قبر کھود کر مردہ دفنا دیتا ہوں''۔

''یہ مردہ پرچی سے کیا مراد ہے؟'' کمل سنگھ نے تجسس سے پوچھا۔

''یہ پرچی قبرستان کمیٹی کا ٹھیکیدار جاری کرتا ہے صاحب!'' ابا نے بتایا۔ ''وہ مرنے والے کے لواحقین سے مقررہ فیس لے کر ان کو ایک پرچی یا رسید دیتا ہے اور قبر کے لئے جگہ کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ وہ یہ پرچی مجھے دکھاتے ہیں تو میں قبر تیار کر دیتا ہوں۔ اس قبرستان کا ٹھیکیدار حاجی عبدالستار ہے''۔

اس دوران گورا جسٹس کچھ بے چین ہونے لگا تھا اور اس نے کمل سنگھ سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟

''سر! اس گورکن بابا کو کچھ معلوم نہیں ہے''۔ کمل سنگھ نے اس گورے سے کہا۔ ''اس قبرستان کا سارا ریکارڈ ٹھیکیدار کے پاس ہے وہی قبر کے لئے جگہ الاٹ کرتا ہے اور ایک مخصوص نمبر لکھ لیتا ہے''۔

''اس ٹھیکیدار کو فوراً حاضر کرو''۔ مسٹر کیسل نے کہا۔ ''وہ معہ ریکارڈ یہاں آئے''۔

''او کے سر!'' کمل سنگھ نے ذرا سا جھک کر کہا۔ پھر اس نے ابا سے کہا کہ چلو میرے ساتھ حاجی عبدالستار کو لے کر آئیں۔

''لیکن اس قبر کا کیا ہوگا صاحب!'' ابا نے کہا۔ ''دو گھنٹے بعد یہاں میت آنے والی ہے''۔

''تمہارا بیٹا خاصا سمجھدار لگتا ہے بابا!'' کمل سنگھ نے کہا۔ ''یہ سارا کام کرلے گا...... یہ گورا بڑا سخت بندہ ہے اگر اس کو ہماری کسی بات پر غصہ آ گیا تو پھر خیر نہیں''۔

''لیکن یہ تو ریٹائر ہو چکا ہے صاحب!'' ابا نے کہا۔ ''جیسے چلا ہوا کارتوس''۔

''تو جاہل گورکن ہے تجھے کیا معلوم''۔ کمل سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ تو وہ ہاتھی ہے جو زندہ لاکھ کا تو مرا ہوا سوا لاکھ کا...... وزارت قانون سے حکم آیا ہے کہ مسٹر کیسل کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے''۔

ابا مجھے قبر کے بارے میں سمجھا کر کمل سنگھ کے ساتھ چلا گیا تو بھیم کمار نے مجھے کہا کہ گورا صاحب کے لئے کوئی کرسی یا چارپائی لے آؤں۔ ہمارے پاس کرسی کہاں ہوتی تھی، میں نے ایک چارپائی لا کر سائے میں بچھا دی۔ گورا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے بھیم کمار کو بھی چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔ دونوں بیٹھ گئے تو گورا صاحب نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ مجھے سمجھ نہ آیا۔

''صاحب نے پوچھا ہے تم سکول جاتے ہو؟'' بھیم کمار نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلا کر اشارہ دیا کہ نہیں جاتا۔

''Very sad.... very sad.'' مسٹر کیسل نے افسوس سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ سیڈ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے بھیم کمار سے پوچھا۔

''یہ تیرے سکول نہ جانے پر افسوس کر رہا ہے''۔ بھیم کمار نے کہا۔

مسٹر کیسل کچھ دیر چارپائی پر بیٹھا رہا پھر اکتا کر وقت گزاری کے لئے قبروں کے کتبے دیکھنے لگا۔ میں نے بھیم کمار سے پوچھا کہ اگر اس گورے کو مطلوبہ قبر مل گئی تو یہ کیا کرے گا۔

''یہ قبر والے سے معافی مانگے گا''۔ بھیم کمار نے کہا۔ ''دراصل بیدل شاہ کے پھانسی پا جانے کے بعد ایک دن جسٹس صاحب کو قانون کی کتابیں دیکھتے

ہوئے ایک ایسا پرانا کیس ملا جو اس کیس سے ملتا جلتا تھا اور اس میں جج نے ملزم کو بری کر دیا تھا۔ اس پرانے کیس تحت بیدل شاہ اس کیس میں موت کی سزا سے بچ سکتا تھا بلکہ بری بھی ہو سکتا تھا۔ تب سے مسٹر کیسل احساس جرم کا شکار ہے اور اپنے ضمیر کی تسلی کے لئے یہ معافی مانگنا چاہتا ہے''۔

''بیدل شاہ نے کیا جرم کیا تھا جس کے عوض اسے موت کی سزا دی گئی؟'' میں نے یونہی بھیم کمار سے پوچھ لیا۔

''بیدل شاہ دراصل کھیڑا گاؤں کے ایک امیر آدمی چوہدری اقبال کے مویشیوں کا رکھوالا تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ یہ چوہدری اقبال کو لاوارث ملا تھا۔ چوہدری نے اسے اپنے نوکروں کے حوالے کر دیا اور اس کی پرورش انہی کے درمیان ہوئی۔ اس لئے وہ دل و جان سے چوہدری اقبال کی خدمات انجام دینے لگا۔ بیدل اچھا تنومند اور خوبصورت جوان نکلا۔ چوہدری اقبال کا ایک کاما ہے جس کا نام روشن دین تھا۔ اس کی جوان بیٹی تھی جس کا نام گوری تھا۔ گوری صرف نام کی گوری نہ تھی بلکہ واقعی بڑی حسین و جمیل اور اجلی رنگت کی مالک تھی۔

چوہدری اقبال کی نظر گوری پر تھی اور وہ اسے خراب کرنے کی فکر میں تھا۔ روشن دین نے مالک کی نظروں میں چھپی ہوس کو بھانپ لیا اور بُرا وقت آنے سے پہلے ہی گوری کی شادی بیدل شاہ سے کر دی۔ جب چوہدری اقبال کو اس شادی کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوا کہ اسے بتائے بغیر یہ شادی کیوں کی گئی ہے مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

چوہدری اقبال تازہ مال کھانے کا عادی تھا مگر گوری کے معاملے میں وہ اپنے نوکر بیدل شاہ کا جھوٹا کھانے کو تیار ہو گیا۔ اس نے گوری کو حاصل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور بیدل شاہ کو کچھ مویشی دے کر کہا کہ وہ انہیں فلاں بیوپاری کو پہنچا کر آئے۔ بیدل شاہ چلا گیا تو چوہدری اقبال کے آدمیوں نے گوری کو اغوا کر کے چوہدری کے ایک دوست جامی شاہ کے ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ چوہدری اقبال، جامی شاہ اور ایک اور دوست نے مل کر گوری کو زبردستی اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا اور بعد میں رسوائی کے خوف سے گوری کا گلا گھونٹ کے مار ڈالا اور لاش زمین میں دبا دی۔

ادھر اگلے دن جب بیدل شاہ واپس آیا تو گوری کو نہ پا کر پریشان ہو گیا اور اسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ وہ زمین کے اوپر ہوتی تو نظر آتی۔ روشن دین کو گوری کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ بھی اسے تلاش کرنے لگا۔

ادھر چوہدری اقبال کے منصوبے کے مطابق اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ اس نے گوری کو ایک نوجوان کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ چوہدری اقبال نے یہ مشہور کرا دیا کہ گوری ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی اور بیدل شاہ کی غیر موجودگی میں موقع پا کر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔

روشن دین بیدل شاہ کو ساتھ لے کر تھانے چلا گیا اور گوری کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی لیکن پولیس نے رسمی سی کارروائی کے سوا کچھ بھی نہ کیا۔ چوہدری کے کارندوں نے ہر طرف یہ بات پھیلا دی تھی کہ گوری اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پولیس نے بھی اسی بات پر یقین کر کے کیس پر توجہ نہیں دی۔

اس واقعے کے دس بارہ دن بعد رات کے اندھیرے میں ایک آدمی بیدل شاہ کے پاس آیا۔ اس نے بڑی سی چادر کی بکل ماری ہوئی تھی جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔

''کون ہو تم؟'' بیدل شاہ نے اس سے پوچھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"یہ نہیں بتاؤں گا"۔ اس آدمی نے کہا۔ "جو بتانے آیا ہوں وہ غور سے سن لو اور کسی سے میرے بارے میں ذکر نہ کرنا ورنہ میری جان جائے گی"۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" بیدل شاہ نے پوچھا۔

"تمہاری بیوی بھاگی نہیں بلکہ اسے اغوا کیا گیا ہے"۔ اس آدمی نے کہا۔ "میں نے رات کے اندھیرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ چوہدری کے آدمی اسے منہ باندھ کر جامی شاہ کے ڈیرے پر لے جا رہے تھے۔ آگے تم خود سمجھدار ہو...... میں چلتا ہوں۔ کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو مارا جاؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ پُراسرار بندہ رات کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

بیدل شاہ اسی وقت گوری کے باپ روشن دین کے پاس چلا گیا اور اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ روشن دین چوہدری اقبال کا پرانا کارندہ تھا اور اس کی حرکتوں سے واقف تھا۔ اسے پہلے ہی چوہدری پر شک تھا لیکن کسی ثبوت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ روشن دین صبح سویرے بیدل شاہ کو ساتھ لے کر چوہدری اقبال کے پاس چلا گیا اور گوری کے متعلق بات کرتے ہوئے بتایا کہ اسے جامی شاہ کے ڈیرے پر لے جایا گیا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر چوہدری کا نام نہ لیا۔ یہ بات سنتے ہی چوہدری اقبال پہلے تو حیران ہوا پھر ایک دم بھڑک اٹھا۔

"بکواس کرتے ہو تم کمینے!" اس نے روشن دین سے کہا۔ "میرے دوست پر الزام لگاتے شرم نہ آئی۔ خود تمہاری بیٹی گندی تھی جانے کس کس کے ساتھ یارانے لگا رکھے تھے، اب کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو تم عزت دار لوگوں کے سر میں خاک ڈالنے آ گئے ہو"۔

"ہماری اطلاع پکی ہے چوہدری صاحب!" بیدل شاہ نے جرأت مندانہ لہجے میں کہا۔ "آپ ہماری مدد کریں۔ آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے"۔

"تمہیں بھی بولنا آ گیا ہے بیدو!" چوہدری اقبال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تُو لاوارث، بھوکا ننگا پھرتا تھا۔ میں نے ترس کھا کر تجھے پالا پوسا اور تُو میرے احسانوں کا بدلہ یہ دے رہا ہے...... نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں جوتے لگواؤں گا"۔

روشن دین تو صبر کے تلخ گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن بیدل شاہ کے پاؤں سے لگی تو سر پر جا کر رکی۔ اس آگ سے اس کا دماغ کھولنے لگا۔ اسے پختہ یقین ہو گیا کہ چوہدری اقبال نے ہی اس کی گوری کو غائب کیا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ شہر جا کر ڈی ایس پی کے سامنے پیش ہو کر چوہدری اقبال کے خلاف درخواست دے گا۔

اس بات کی بھنک چوہدری اقبال کو پڑ گئی۔ اس علاقے کا تھانیدار سروانی چوہدری اقبال کا دم بھرتا تھا اور چوہدری اسے ہر طرح خوش رکھتا تھا۔ اس مشکل وقت میں چوہدری اقبال نے سروانی سے ملاقات کی اور سارا معاملہ اسے بتا کر مشورہ طلب کیا۔

"پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں چوہدری صاحب!" سروانی نے چوہدری کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میرے پاس ایک بندے کے قتل کی رپورٹ درج ہوئی ہے۔ ابھی تفتیش جاری ہے اور کسی کو مشتبہ نہیں بٹھایا، کل ہی تمہارے بیدل شاہ صاحب کو اٹھا لاتا ہوں اور "تفتیش" شروع کر دیتا ہوں۔ یہ قتل بیدو کے گلے ڈال دیتا ہوں۔ موقعے کے جھوٹے گواہ فراہم کرنا تمہارا کام ہے۔ تم اپنے بندے دے دو۔ باقی جو مال پانی تم نے اپنی خوشی سے دینا ہے وہ میں قبول کر لوں گا۔ تمہاری جان چھوٹ جائے گی"۔

چوہدری اقبال یہ سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے سروانی کا منہ نوٹوں سے بھر دیا اور اپنے دو بندے بھی اس کو دے دیئے جن کو گواہی دینے کے لئے تیار کرنا تھا۔ یہ دونوں چوہدری کے حکم پر ہر قسم کا غیر قانونی کام کرتے تھے اور کئی بار پکڑے بھی گئے تھے۔ تھانیدار نے ان کو طوطے کی طرح سبق یاد کراتا تھا۔

"اب میں چلتا ہوں چوہدری!" سروانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آئندہ ایسا کوئی رنگین پروگرام ہو تو مجھے بھی یاد کر لینا، اکیلے ہی اکیلے میٹھا کھاؤ گے تو شوگر ہو جائے گی"۔

اسی رات سروانی نے کانسٹیبل بھیج کر بیدل شاہ کو تھانے طلب کر لیا اور اس پر قتل کا الزام لگا کر باقاعدہ گرفتاری ڈال دی۔ بیدل شاہ بڑا تڑپا اور رویا چلایا مگر سروانی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کے سسر روشن دین نے اس کی مدد کرنی چاہی تو سروانی اور چوہدری اقبال نے اس کو دھمکایا کہ وہ اس معاملے میں دخل نہ دے ورنہ اس کے جوان بیٹے کو غائب کر دیا جائے گا۔ بے چارہ روشن دین سہم کر رہ گیا۔

تھانیدار سروانی نے بیدل شاہ کے خلاف بڑی مہارت سے کیس تیار کیا۔ جھوٹے گواہ تیار کئے اور کیس عدالت میں پیش کر دیا۔ بیدل شاہ کی جانب سے جو وکیل کھڑا ہوا تھا، اسے بھی چوہدری اقبال نے نذرانہ دے کر خرید لیا تھا۔ اس نے بڑے کمزور انداز میں اس کیس کی پیروی کی۔ ہر چیز بیدل شاہ کے خلاف تھی۔ قانون تو اندھا ہوتا ہے اور واقعاتی شہادتوں، موقعے کے گواہوں اور دلائل کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے۔

جھوٹ اور فریب کا تانا بانا اس مہارت سے بنا گیا تھا کہ سچائی پر کسی کی نظر ہی نہیں جا سکتی تھی۔ بیدل شاہ روتا گڑگڑاتا رہا کہ وہ بے قصور ہے اور اس کی بیوی کو چوہدری اقبال نے اغوا کر لیا ہے اور کہیں غائب کر دیا ہے لیکن اس کی آہ و بکا بیکار گئی اور اسے سزائے موت سنا دی گئی۔

ابھی اس کے پاس اپیل کا حق تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک نیا وکیل مقرر کیا جس نے ہائی کورٹ میں اس سزائے موت کے خلاف اپیل دائر کر دی۔

یہ وکیل کوئی بڑے نام والا نہیں تھا لیکن محنتی اور ایماندار تھا۔ اس کے علاوہ قانونی داؤ پیچ سمجھتا تھا۔ اس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ جن دونوں آدمیوں نے اس کے مؤکل کے خلاف گواہی دی ہے وہ خود جرائم پیشہ لوگ ہیں اور تھانے کے ریکارڈ پر ہیں۔ چوری چکاری اور لڑائی مار کٹائی کے علاوہ نشے کے عادی بھی ہیں لہٰذا ایسے بندوں کی گواہی معتبر نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ یہ دونوں گواہ چوہدری اقبال کے کارندے ہیں جس کے خلاف بیدل شاہ نے اپنی بیوی کے اغوا کا کیس درج کرا رکھا ہے۔

یہ اپیل مسٹر کیسل کی عدالت میں دائر کی گئی تھی۔ بیدل شاہ کی بدقسمتی کہ جسٹس کیسل نے وکیل کے دلائل پر توجہ نہیں دی اور اپیل خارج کرتے ہوئے لوئر کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا۔ اس فیصلے سے بیدل شاہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ اس نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل نہ کی۔ ویسے بھی اس کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ وکیل اور عدالتوں کا خرچہ برداشت کر سکتا وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔

کچھ عرصے بعد بیدل شاہ کو پھانسی دے دی گئی۔

جسٹس کیسل ریٹائر ہو گیا۔ وہ ایک دن اپنے بنگلے میں بیٹھا قانون کی کتابیں پڑھ رہا تھا۔ ایک کیس اس کی نظر سے گزرا جس میں قتل کے ایک ملزم کو اس بناء پر بری کر دیا گیا تھا کہ اس کے خلاف جو گواہ پیش ہوا تھا وہ خود سزا یافتہ اور نشے کا عادی تھا۔ جج نے اپنے فیصلے میں لکھا تھا کہ ایک سزا یافتہ اور عادی نشہ باز شخص

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی گواہی ناقابلِ قبول ہے۔

یہ کیس پڑھتے پڑھتے اچانک اس کے ذہن میں بیدل شاہ کا کیس آ گیا جو بالکل اسی طرح کا تھا اور اس کے وکیل نے اپیل میں یہی مؤقف اختیار کیا تھا جسے مسٹر کیسل نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور سزائے موت بحال رکھی حالانکہ گواہوں کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر بیدل شاہ کو شک کا فائدہ دے کر بری کیا جا سکتا تھا۔

تب جسٹس کیسل کو احساس ہوا کہ اس کی لاپروائی سے ایک بے گناہ انسان موت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ بیدل شاہ کے لواحقین کو تلاش کر کے ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگے۔ پھر اس نے ہائر اتھارٹیز کو ایک اعتراف نامہ لکھ کر پیش کیا کہ مجھ سے غیر ارادی طور پر ایک بھیانک غلطی ہو گئی اور میری لاپروائی کی وجہ سے ایک معصوم شخص کی جان چلی گئی لہٰذا میرے خلاف قانونی کارروائی کی جائے اور مجھے اس کی سزا دی جائے۔

متعلقہ اتھارٹی سے جواب آیا کہ بعض اوقات ایسی غلطی ہو جاتی ہے اور آپ نے یہ غلطی ارادتاً نہیں کی لہٰذا یہ درگزر کے قابل ہے۔

اس کے بعد مسٹر کیسل بیدل شاہ کے معاملے میں پوری طرح دلچسپی لینے لگا اور اس کے سامنے ساری صورتِ حال آ گئی جو اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے بیدل شاہ کی بیوی گوری کے اغوا اور ممکنہ قتل کا کیس ری اوپن کرا دیا تاکہ اس کے ذمہ دار کو سزا دی جا سکے۔

بھیم کمار ابھی مجھے یہ کہانی سنا رہا تھا کہ کمل سنگھ، ابا اور قبرستان کا ٹھیکیدار عبدالستار وہاں آ گئے۔ عبدالستار مسٹر کیسل کو دیکھ کر بڑا پریشان ہو گیا اور کانپنے لگا۔ یہ دیکھ کر مسٹر کیسل نے اسے تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہو اور اپنے ریکارڈ کو دیکھ کر بیدل شاہ کی قبر کی نشاندہی کر دے۔

عبدالستار کی جان میں جان آئی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے رجسٹر کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کی مغز ماری کے بعد اس نے لاوارثوں کے حصے میں سے بیدل شاہ کی قبر کا نمبر اور مقام تلاش کر لیا۔ سب اس کی رہنمائی میں بیدل شاہ کی قبر کی طرف چل پڑے۔

''ہری اپ...... ہری اپ!'' مسٹر کیسل نے ہسٹریائی انداز میں چلاتے ہوئے کہا۔

سب لوگ تیز تیز چلنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر عبدالستار ایک خستہ حال قبر کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد تصدیق کر دی کہ بیدل شاہ اسی قبر میں دفن ہے۔ چونکہ یہ لاوارث قبر تھی اس لئے کافی حد تک زمین میں دھنس چکی تھی۔ مسٹر کیسل پر قبر کو دیکھ کر ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس کا گورا رنگ جذبات کی شدت سے انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

پھر وہ قبر کے کنارے بیٹھ گیا اور مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑاتا بھی جا رہا تھا۔ غالباً وہ بیدل شاہ سے معافی مانگ رہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا اور کبھی قبر کی طرف۔

ہم سب بت بنے اس کی حرکتیں دیکھ رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہے اور وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ بھیم کمار نے بتایا کہ جسٹس صاحب بہت ایماندار اور انصاف پرور آدمی ہے اور اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ یہ عام گوروں کی طرح ہندوستانیوں سے نفرت نہیں کرتا بلکہ ہر ممکن یہاں کے لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ بہت ہی حساس اور

نرم دل بندہ ہے اسی لئے اس نے اپنی غلطی کو جان کا روگ بنا لیا ہے۔ اس کا ضمیر اسے سکون نہیں لینے دیتا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ بیدل شاہ کی قبر پر جا کر معافی مانگ لے تو شاید اس کو سکون آ جائے۔

مگر ہم سب دیکھ رہے تھے کہ بیدل شاہ کی قبر پر آ کر وہ اور بے سکون و بے قرار ہو گیا تھا۔ خاصی دیر بعد مسٹر کیسل قبر کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک الوداعی نظر قبر پر ڈالی اور واپسی کے لئے چل پڑا۔ ہم سب اس جگہ تک آئے جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا پھر اس نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں جھجکتے ہوئے اس کے پاس چلا گیا۔

''Go school my child.''۔ اس نے میرے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میرے باپ کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اس بچے کے ہاتھ سے گینتی پھاوڑا رکھوا دو اور کتاب پکڑاؤ...... اسے سکول بھیجو''۔

''آپ کی بات ٹھیک ہے صاحب!'' میرے باپ نے کہا۔ ''ہمارے پاس کھانے کو روٹی پوری نہیں ہوتی تو سکول کا خرچہ کہاں سے دیں۔ ہم مجبور ہیں صاحب!''

''اس کا خرچہ ہم دے گا''۔ مسٹر کیسل نے کہا پھر اس نے بھیم کمار کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اس بچے کو اچھے سکول میں ایڈمٹ کروا دو، جتنا پے منٹ ہو گا وہ ہم سے لے لینا''۔

''او کے سر!'' بھیم کمار نے سر جھکا کر کہا۔

اس کے بعد مسٹر کیسل بھیم کمار اور کمل سنگھ کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ چلنے سے پہلے بھیم کمار نے میرے باپ سے کہا کہ وہ بچے کو لے کر کل اس سے دفتر میں آ کر ملے۔ وہ بچے کو سکول داخل کرا دے گا۔

اگلے دن صبح نو دس بجے کے لگ بھگ پولیس کا

نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے کیوں ہوتا ہے؟

پچھلے ماہ کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان نیو ایئر کا پُرجوش استقبال کر رہے تھے اور پھر یکم جنوری سے ہم 2015ء کو رخصت کر کے 2016ء کا آغاز کر دیا۔ تقریباً تمام دنیا میں یہی رواج ہے کہ نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے کیا جاتا ہے لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سال کا آغاز اس دن سے ہی کیوں کیا جاتا ہے۔

رومی سلطنت میں 153 قبل مسیح سے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ یکم جنوری کو قونصل (شہروں کے انتظام کے لئے مقرر کئے جانے والے حکومتی افسران) مقرر کئے جاتے تھے اور یہ تقرری حکومتی انتظام و انصرام کا اہم ترین جزو سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت کی رومی سلطنت میں لوگ سالوں کی پہچان بھی ان میں مقرر کئے گئے قونصلوں کے حوالے سے کرتے تھے۔ تقرریوں کے لئے اس دن کا انتخاب ہی کیوں کیا جاتا تھا؟ اس کے متعلق تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ لفظ جنوری کا تعلق رومن لفظ 'جینس' سے ہے جو رومیوں کے ہاں تبدیلی اور آغاز کا دیوتا کہلاتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جنوری کے مہینے کے پہلے دن کو سال کے آغاز کے لئے چنا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کیلنڈر میں تبدیلیاں آئیں لیکن آج تک سالِ نو کا آغاز یکم جنوری سے ہی کیا جاتا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے میری درخواست ہے کہ وہ روزانہ بیدل شاہ کی قبر پر جایا کرے اور قبر کی دیکھ بھال کے علاوہ وہاں اپنی مقدس کتاب قرآن پڑھا کرے۔ میں ایک بڑی رقم اس کام کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں کہ اس سے بیدل شاہ کی قبر پکی کروا دینا اور قبرستان کے قریب ہی ایک مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا جس کا نام مسجد بیدل شاہ ہو گا اور نورو خان! تم اپنے معصوم بیٹے کو سکول ضرور بھیجو۔ میں نے تمہارے بیٹے کی تعلیم کے لئے رقم رکھ دی ہے اور بھیم کمار اپنی سفارش سے اچھے سکول میں داخل کرا دے گا۔

بھیم کمار نے مسٹر کیسل کی وصیت کے مطابق ابا کو ایک بڑی رقم مسجد کے لئے دی اور میری تعلیم کے لئے الگ رقم دی۔ ابا نے مسٹر کیسل کی وصیت کے مطابق قبرستان سے ملحقہ آبادی میں ایک شاندار مسجد تعمیر کی جس میں بچوں کے لئے مدرسہ بھی تھا۔ جب لوگوں نے سنا کہ یہ مسجد ایک گورے کی وصیت پر بنائی جا رہی ہے تو انہوں نے بھی اس کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مجھے بھیم کمار نے اپنی سفارش پر رائل سکول میں داخل کرا دیا جہاں امیر لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔

میرے باپ نورو خان کو 1948ء میں ہندوؤں نے ایک فساد میں شہید کر دیا۔ میں پاکستان آ گیا اور اپنی تعلیم جاری رکھی اور آخرکار ایک ادارے میں آفیسر لگ گیا۔ جب میں ریٹائر ہوا تو میں گریڈ 20 کا آفیسر تھا۔ اب زندگی کا سورج ڈھل چکا ہے اور کسی بھی وقت ڈوب جائے گا۔ میں مرتے دم تک مسٹر کیسل کی مہربانی کو یاد رکھوں گا اور اس کے لئے دعا کرتا رہوں گا کہ اللہ اس کے ساتھ اچھا سلوک فرمائے۔ آمین!

ایک سپاہی آ گیا۔ اس نے ابا کو بتایا کہ اسے فوری طور پر بھیم کمار صاحب نے بلایا ہے۔ ابا نے کون سی تیاری کرنی تھی۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور اس سپاہی کے ساتھ بھیم کمار کے دفتر جا پہنچے۔ بھیم کمار نے ہم دونوں کو بیٹھنے کو کہا۔ وہ کچھ پریشان نظر آ رہا تھا اور یہ پریشانی اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہی تھی۔

"سب خیریت ہے نا صاحب؟" ابا سے رہا نہ گیا اور اس نے پوچھ ہی لیا۔

"خیریت نہیں ہے نورو!" بھیم کمار نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "کل رات مسٹر کیسل نے آتما ہتیا کر لی"۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں صاحب!" ابا نے حیران ہو کر کہا۔ "کل تو وہ اچھے بھلے گئے تھے"۔

"وہ اچھے بھلے کہاں تھے نورو!" بھیم کمار نے کہا۔ "وہ اپنے ضمیر کے مجرم تھے اور ان کا ضمیر اندر سے ان کو کوڑے مارتا تھا۔ وہ یہ عذاب برداشت نہیں کر سکے اور اپنے پستول سے اپنی کنپٹی پر گولی مار لی...... انہوں نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت بھی لکھی ہے اور اعتراف بھی کیا ہے کہ بیدل شاہ معصوم تھا اور اس کو موت کی سزا دینا میرے ضمیر پر ایک بوجھ تھا اور وہ بوجھ میں اپنی جان دے کر اتار رہا ہوں۔ کاش! بیدل شاہ کی روح بھی مجھے معاف کر دے"۔

"اللہ اسے معاف کرے"۔ ابا نے بھیگی آواز میں کہا۔ "ایسے دردِ دل رکھنے والے لوگ کہاں ہوتے ہیں"۔

"مسٹر کیسل نے اپنی وصیت میں تمہارا اور تمہارے بیٹے کا ذکر بھی کیا ہے نورو!" بھیم کمار نے کہا۔ پھر اس نے وصیت کے متعلق جو کچھ بتایا وہ مختصراً بیان کر دیتا ہوں۔ اس نے لکھا تھا:

قبرستان والا نورو خان اچھا آدمی لگتا ہے۔

لمحۂ فکریہ

وہ اپنے ملک سے بھی روٹھ گئی

یہ روٹھے ہوئے لوگ بہت کم داموں میں بک جاتے ہیں۔

☆ابدال بیلا

ایک شیطان دانشور اپنے ایک پیروکار سے پوچھنے لگا۔ بولو، اگر کسی سے تمہاری شدید دشمنی ہو اور تم تہیہ کر لو، اسے نقصان پہنچانے کا تو کیا کرو گے؟ چیلا اپنے گرو کی طاقت جانتا تھا، اسے معلوم تھا کہ اس کا گرو مکاری کا تاجور ہے مگر ہے قلم والا، اس کے سوال میں یقیناً بات لکھنے لکھانے کی ہی ہو گی۔

بولا۔ سرکار اپنے دشمن کے خلاف زہریلی باتیں لکھوں گا۔

اس کی شہرت خراب کروں گا۔

اس کی ساکھ تہہ و بالا کر دوں گا۔

اس سے ایسی ایسی باتیں منسوب کر دوں گا جو اس نے کبھی کی نہ ہوں۔

اس کے ایسے برے کاموں کی نقاب کشائی کروں گا جو اس نے سوچے بھی نہ ہوں۔

جس چیز کو وہ اپنی طاقت سمجھتا ہو، اسی کو اس کی کمزوری بنا کے دکھاؤں گا۔

اگر اسے ایمانداری کا گھمنڈ ہو گا تو اسے اپنی تحریر سے بے ایمان ثابت کر دوں گا۔ اتنی باتیں کہہ کے چیلے کے چہرے پر زمانے بھر کے شیطانوں سے لی ہوئی مکروہ شرارت ہویدا ہو گئی اور وہ اپنے گرو کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اسے شاباش ملے گی۔

گرو کچھ دیر بنا تاثر دیئے، اپنے اس چیلے کو مایوسی سے دیکھتا رہا پھر ماتھے پر ہاتھ مار کے بولا:

تم نے میری شاگردی میں رہ کے یہی اناپ شناپ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سیکھا ہے؟!

چیلا تذبذب میں ہاتھ جوڑ کے بولا۔ سرکار کوئی غلط بات کہی؟

گرو نے اسے اشارے سے قریب بلایا اور اس کا کان مروڑتے ہوئے بولا۔

احمق بالکے! باتیں ساری تم نے صحیح کہیں۔

ارادے بھی برے نہیں بتائے۔

دشمن سے دشمنی میں کرنا یہی ہوتا ہے۔

مگر بے وقوف، یہ ساری باتیں تم خود کیوں کرو گے؟

یہ سارا کیچڑ ہے۔

تم خود کیوں کیچڑ میں ہاتھ ڈالتے ہو۔

کیوں خود کو میلا کرتے ہو۔

میلے رہو مگر دِکھو دھلے دھلائے کلف لگے کڑکڑ کرتے ہوئے۔

پھر جاننے والوں کو جب پتہ چلے گا کہ جس کے بارے میں تم بری باتیں لکھ رہے ہو، وہ تمہارا دشمن ہے۔ تو تمہاری بات میں اثر کیا ہوگا؟ تمہاری ساری دلیلیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ الٹا خواہ مخواہ دشمنی بڑھے گی۔ بلکہ تم اس کے ردعمل کی زد میں آ جاؤ گے۔ تمہاری اور تمہارے دشمن کی دشمنی جاننے والے تمہاری کہی باتوں کو تمہاری کم ظرفی کہیں گے۔ پڑھنے لکھنے والوں کی دنیا میں بے توقیر تو تم خود ہو گے۔ دشمن سے کہیں زیادہ نقصان خود تمہاری اپنی شہرت کو ہوگا۔ یہ سبق سیکھا ہے تم نے مجھ سے؟

بالکا شرمندگی سے گرو کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ہاتھ جوڑ کے بولا، سرکار میں اپنی کہی باتوں کی بے توقیری سمجھ گیا۔ مگر میرے ہاتھ سرا نہیں آ رہا۔ بات ذہن میں الجھ گئی ہے۔ آپ عقل و خرد کے بادشاہ ہیں، حل بتائیے، بالکا بے بس ہے۔

گرو نے بالکے کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر رکھے ہاتھ پر زور دے کر اس کا کندھا زور سے دباتے ہوئے مکارانہ رازداری سے بولا۔

بالک سنو۔

جسے بے توقیر کرنا ہو، جسے برا ثابت کرنا ہو، جسے گالی دینی ہو اسے خود گالی نہ دو، اس کے باپ سے گالی دلواؤ۔

اگر وہ خود باپ ہے تو اس کے بیٹے کو اس کے خلاف بھڑکاؤ۔

اس کا کوئی گہرا دوست ہو تو ان کی دوستی میں دراڑ ڈالو،

پھر اس روٹھے ہوئے دوست کے منہ میں اپنے ذہن کا زہر رکھ کے لفظوں کی پٹاری کھولو۔

ہاں اگر کسی کی بیٹی مل جائے تو اسے گمراہ کر کے، اپنے رنگ میں رنگوانے کے لئے جان توڑ کوشش کرلو۔

یہ مان لو کہ بیٹوں کی نسبت بیٹی کی دی ہوئی گالی ماں اور باپ دونوں کے کلیجے کو زیادہ کاٹتی ہے۔ اب سمجھ میں آئی بات؟

بالکا شانت ہو گیا، گرو کے چرن چھو کے بولا۔ عالی مرتبت، آپ نے دنیا بھر کے شیطانوں کے بڑے تخت پہ ہونے والی سب سے بڑی سازباز اس بالک کو سمجھا دی۔ اب یہ بالک کبھی نہیں چوکے گا۔

کہنے والے کہتے ہیں مغرب کی شیطانی خرد کے شہنشاہ "میکاولی" سے صدیوں پہلے ہندوستان میں "چانکیہ" نے ایسے راز کھول دیئے تھے۔ دونوں طرف کے شریر دانشور آج بھی یہ سبق نہیں بھولے۔ وہ جس کسی کو گالی دینا چاہتے ہیں خود اسے گالی نہیں دیتے۔ اس کی کسی عزیز ہستی کو اپنے دام میں پھنسا کے اس سے گالی دلواتے ہیں۔ یہ فائدہ، یہ کلیہ وہ صرف اپنے دشمن افراد کے لئے ہی نہیں، اپنی دشمن قوموں اور دشمن سلطنتوں کے لئے بھی

یہی طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

یہ لوگ، جس ملک، جس قوم کو اپنا دشمن مان لیتے ہیں اسے دکھاوے کے لئے سرعام گلے لگاتے ہیں۔

اس کے ہاتھ، اس کا ماتھا چومتے ہیں۔

مگر اس قوم کے کچھ ایسے روٹھے ہوئے لوگوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جن سے وہ انہی کی مٹی، انہی کی قوم کو گالی دلوائیں۔

انہیں ایسا کرنے میں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔

ہر شہر، ہر بستی ایسی ہوتی ہے، جہاں کسی مرد، کسی عورت نے یہ گمان پالا ہوتا ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے، اس سے زیادتی کی ہوئی ہے۔ یہ چالاک دشمن جانتے ہیں کہ کوئی شخص، مرد یا عورت، جب اپنے شہر یا اپنے ملک سے روٹھتا ہے تو اسے کیسے اپنی میز پہ پڑے ہوئے اپنی مرضی کے گلاس میں اتارنا ہیں یہ اتار لیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں انہیں جو بھی قیمت دینا پڑے، یہ دے دیتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ قیمت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔

یہ روٹھے ہوئے لوگ بہت کم داموں میں بک جاتے ہیں۔

کسی کو دور افتادہ، کم روشن، گرم، صحرائی شہر سے اٹھا کے مغرب کے کسی چکاچوند چمکتے خوشگوار موسم سے بھرے شہر میں ایک سیر سپاٹا کروا دیا۔ کچھ ہفتوں کی اس مرد یا عورت کی اپنی رائج الوقت عالمگیر زبان میں کوئی تربیت دے دی۔ اسے کسی غیر سرکاری تنظیم (این جی او) کی آڑ میں بڑی بھاری تنخواہ پر رکھ لیا۔ اس کی کہی باتوں پہ اپنے پنڈال میں تالیاں بجوا دیں۔ اس کی لکھی کسی تحریر کی پذیرائی میں لمبے لمبے مضامین لکھوا دیئے، چھپوا دیئے۔ جب دیکھا، یہ مرد، یہ عورت اب پوری طرح ہمارے پنجرے کی بلبل بن گئی ہے، تو اس مینا کے منہ میں اسی کے شہر، اسی کے ملک کے خلاف گالیاں رکھوا دیں۔ جس مٹی سے وہ عورت کسی پودے کی کونپل کی طرح نکل کے ایک پیڑ بن کے جواں ہوئی تھی، اسی کے ہاتھوں سے اسی کی جڑوں پہ کلہاڑی چلوا دی۔ جس شہر، جس ملک نے اس شخصیت کو پال پوس کے بڑا کیا تھا، اسی شہر، اسی ملک کے خلاف اس سے لکھوا دیا۔

ایسا بہت بار ہوا۔

بار بار ہو رہا ہے۔

بار بار ہوگا۔

ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والے، خود کو مٹا کر دوسروں کو بنانے والے اولیاء، کی میٹھی سرزمین ملتان اور بہاولپور سے پہلے ایک روٹھی ہوئی عورت چنی گئی، محترمہ عائشہ صدیقہ۔ اس نے عین چوپال میں کھڑے ہو کے اپنے شہر کو گالی دی۔ بہاولپور میں جنم لے کر وہ جوانی تک پہنچی تھی۔ اسی شہر کے لئے بولی۔ یہاں کی عورتیں دوسرے مردوں کے بستر گرم کرتی ہیں اور یہاں کے مرد مذہبی جنونی ہیں۔

ظاہر ہے اس کی دی ہوئی گالی سے اس کے سرپرستوں نے اس کے رینک میں ترقی کر دی ہوگی۔ اس کا مشن بھی بڑھا دیا ہوگا۔ اپنے شہر سے روٹھی یہ عورت پڑوس کے ایک دشمن ملک کی راجدھانی میں مہمان بلائی گئی۔ وہاں اس نے چار کانفرنسوں کا نمک کیا چکھ لیا، اس نے عین دشمن ملک میں بیٹھ کے اپنے ہی ملک کو گالی دے دی۔ حیرت ہے وہ خود اپنے انگریزی کالم میں لکھتی ہیں کہ ہندوستان میں اونچ نیچ بہت ہے۔ ذات پات میں سارا ملک بٹا ہوا ہیں کلکتہ، دہلی، موممبائی اور چینائی کی شاہراہوں کی فٹ پاتھوں پہ لاکھوں بے گھر لوگوں کی بستیاں بسی ہوئی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ وہ وہاں ایک خاص اونچی ذات کا طبقہ سال ہا سال سے ملک کی تمام تر دولت پر قابض ہے۔ مگر وہ اپنی ساری گفتگو کے بعد یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ ہندوستان باوجود تمام تر برائیوں کے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ایک کامیاب ملک ہے اور پاکستان ایک ناکام ریاست۔ وجہ اس کی وہ یہ بتاتی ہے کہ پاکستان میں مسلک کی بنیاد پر تشدد ہے۔ لوگ بٹے ہوئے ہیں اور جمہوری روایات غیر مستحکم ہیں۔

کوئی محترمہ سے پوچھے، اصلاح کی گنجائش کہاں نہیں مگر اس سے ایسے نتیجے نکالنا کہاں کی حب الوطنی ہے۔ پھر مسلک کی بنیاد پر تقسیم کرنے والے تو چند ایک ہیں۔ ان کا اپنا ایجنڈا ہے مگر پاکستان کے لوگ تو صدیوں سے ان تمام مسلکوں کے باوجود پیار و یگانگت سے رہتے آ رہے ہیں۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے سے یہ مسلک موجود ہیں۔

مگر کبھی کوئی فساد ان کی وجہ سے نہیں ہوا۔

فساد جب بھی ہوا، ان مسلکوں کے ٹھیکیداروں نے اپنے مفاد میں کرایا۔ صوبے بھی مدتوں سے موجود ہیں۔ انہی صوبوں کے لوگوں نے یکجا ہو کر 1947ء میں ایک نعرے، ایک مقصد کے حصول کے لئے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ لوگوں کے اندر تو کوئی تقسیم نہیں۔

تقسیم کروانے والے کچھ مفاد پرست ہیں۔

یہ مفاد پرست ہر اہم دن ملک کی اجتماعی ہیئت دکھاتے سے ملک کے لوگوں کو چار مختلف ٹوپیاں یا پگڑیاں پہنوا کے الگ الگ ٹولے بنا کے دکھا دیتے ہیں تا کہ لوگ بھول نہ جائے کہ وہ ایک نہیں، چار ہیں۔ یہ ملک تو ستانوے فیصد مسلمان ملک ہے۔ وہ یا مسلمان ہوتا ہے یا نہیں ہوتا مگر حیرت ہے وہ ملک کے لوگوں میں الگ الگ تقسیم کی بناء پر جہاں اس ملک کو ایک ناکام ریاست کا نام دیتی ہے، وہیں وہ ہندوستان کو کامیاب کہتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایک ارب بیس کروڑ کے ہندوستان میں پینسٹھ کروڑ لوگ ایسے بستے ہیں جنہیں اس ملک کی بااختیار اقلیت انسان سے بھی کم درجے پہ رکھتی ہے جنہیں ہریجن کہا جاتا ہے۔ وہ بدنصیب اونچی ذات کے کسی ہندو کے کسی برتن کو ہاتھ بھی لگا دیں تو اس برتن کے نصیب میں پاور ہونے کے لئے صرف آگ رہ جاتی ہے۔ اسی ملک کے بیس کروڑ مسلمان غربت کی انتہائی لکیر سے نیچے رہتے ہیں۔ صرف ان چند گنتی کے مسلمانوں کو ان کے ذرائع ابلاغ دکھاتے ہیں جو غیر مسلموں کے ساتھ سر عام رشتہ داری جوڑیں اور چوک میں کھڑے ہو کے اسلام کو برا کہیں اور ہندو دیوتا وشنو کے اوتاروں سے اپنی محبت ثابت کرنے کے لئے ماتھے پہ تلک لگائیں۔ اوپر سے نیچے تک سیدھی لکیریں کھینچیں یا شیو مہاراج کے ماننے والوں کی طرح اپنے ماتھوں پر سیدھی افقی لکیریں بنائیں۔

ہندوستان اس معزز بہاولپوری خاتون کی نظر میں کامیاب ملک ہے جہاں دکھاوے کے لئے بنائے ہوئے سکھ وزیر اعظم کو اتنا اختیار بھی نہیں کہ وہ اپنی ذاتی حفاظت کے حصار میں تعینات لوگوں میں اپنی سکھ برادری کا ایک بھی سکھ سپاہی بھرتی کر لے۔

یہ اس ملک کو کامیاب ملک کہتی ہے جہاں کے مسلمان صدر کے صدارتی محل میں ایک بھی دکھاوے کے قابل مسلمان پہرے دار نہیں۔ حیرت ہے جو ملک پاؤں سے لے کر گردن تک پورے کا پورا ایک ناقابل اصلاح دیمک کے ہاتھوں ختم ہو رہا ہو۔ جس کے پاس سوائے دکھاوے کے سرخی پوڈر سے لتھا ہوا ایک مصنوعی چہرہ ہے جو اپنے تمام تر ہمسایہ ملکوں کے خلاف دشمنی اور عناد رکھتا ہو، اسے کامیاب کہہ رہی ہیں اور اپنے ملک کو ناکام۔

شاید ہمارے ملک کی ناکامی صرف ایک شعبے میں ہے اور وہ شعبہ کوئی اور نہیں صرف یہ ہے کہ اس ملک کے اپنے بیٹے، اس ملک کی اپنی بیٹیاں غیروں کے ہاتھوں بک جاتی ہیں اور وہ بھی بہت ارزاں۔

▼۞▼

رشوت اور سفارش کا ناسور وطنِ عزیز کے ہر شعبے میں اس حد تک اپنے زہریلے پنجے گاڑ چکا ہے کہ اب اس سے نجات ناممکن نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی اس شرمناک صورتِ حال کی عکاس ہے کہ کس طرح رشوت اور سفارش حق دار کا حق کھا جاتی ہیں اور غریب کے خواب اس کے لئے عذاب بن جاتے ہیں۔

خواب سے عذاب تک

کہانی طویل ہونے کی وجہ سے تین اقساط میں پیش کی جا رہی ہے۔

☆ تسنیم سکینہ صدف

ناولٹ

قسط: 1

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

''لالہ! مجھے بچا لیجئے کسی طرح''۔ وہ خوف سے لرزتی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''میں عدالت میں جا کر حلف نامہ دینے کو تیار ہوں کہ میں شفاعت خان نہیں ہوں...... میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا...... کوئی ہوگا شفاعت خان...... بس مجھے کسی طرح بچا لیجئے''۔

یہ سب شفاعت خان خود کہہ رہا تھا، اپنے ہونے کا انکار کر رہا تھا، اپنی شناخت کو جھٹلا رہا تھا۔ آخر کیوں؟

سچ سننا چاہتے ہیں۔

سچ بہت ڈراؤنا ہوتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں شفاعت خان اور اس کے خاندان کو کئی پیڑھیوں سے جانتی ہوں۔ آیئے! میں آپ کو سچ کی پُرخار راہ پر لے چلتی ہوں۔ ایک کڑوی سچائی سے رُوشناس کراتی ہوں۔ وہ دیکھیں کون ہے؟ وہ شفاعت خان ہے، چلو اس کے تعاقب میں چلتے ہیں۔

شفاعت خان دن بھر کے کام سے تھک کر گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں بچوں کے لئے ٹافیاں اور بیوی کے لئے کھانسی کی گولیاں تھیں۔ ایک موڑ کے بعد وہ انتہا پسندوں کے بیچ سنسان گلی میں اچانک پھنس گیا تھا۔ انتہا پسندوں کے ڈر اور خوف سے شفاعت خاں کے چہرے کا رنگ ایک راکھ جیسا ہوگیا تھا جس کے اندر آگ ابھی پوری طرح مری نہ ہو۔ یا پھر کوئی ایسا رنگ جس کے پیچھے سے اچانک کوئی سناٹا جھانکنے لگتا ہے اور اس کی دراڑ میں سے ایک فاصلہ پر کوئی سسکی اٹکی ہوئی نظر آتی ہے۔ شفاعت خان کا کچھ کچھ ویسا ہی رنگ ہو گیا تھا۔

''لالہ! مجھے بچا لیجئے کسی طرح''۔ شفاعت خان سامنے کھڑا تھا اور اپنی کپکپاتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ بال بچے ہیں میرے ادھر باپ مر رہا ہے۔ ٹی بی ہے، کہیں تو میں آپ کے ساتھ چل کر عدالت میں حلف نامہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ میں شفاعت خان نہیں ہوں۔ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا، کوئی اور ہوگا شفاعت خان بس مجھے کسی طرح بچا لیجئے''۔

شفاعت خان کو کوئی دیکھتا تو اس کو اس پر ترس آتا تھا لیکن بعد میں وہ ڈر جاتا تھا کیونکہ وہ سچ بہت ڈراؤنا تھا۔ میں شفاعت خان اور اس کے خاندان کو کئی پیڑھیوں سے جانتی ہوں۔ گاؤں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ اس ضلع کے اسلامیہ ڈگری کالج سے باقاعدہ فرسٹ ڈویژن کے ساتھ گریجویٹ ہے اور یونیورسٹی کی ٹاپ پرسن لسٹ میں آج سے دس سال پہلے اس کا نام دوسرے نمبر پر موجود ہے۔ اس کا حلیہ اس کے ماضی کی قطعی کوئی اطلاع نہیں دیتا۔ ایک پھٹی ہوئی بے رنگ ہو چکی کسی زمانے کی نیلی ڈریس پینٹ، دائیں کندھے کے پاس سے ادھڑی ہوئی شرٹ جس پر کسی زمانے میں چوخانے بنے تھے۔ جس کی وہ لکیریں دھندلی دھندلی ہو کر مٹ رہی تھیں۔ جن کے رنگ بھی ہلکے رہے ہوں گے اور ربڑ کا سستا برساتی جوتا جسے مٹی، دھول، پانی، وقت اور دھوپ نے اتنا چاٹ ڈالا تھا کہ وہ اب کبھی ربڑ کا بنا نظر نہیں آتا تھا۔

شفاعت خان کی عمر اس وقت تیس پینتیس کے آس پاس ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ چالیس پچاس یا اس سے بھی کچھ بڑا ہی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک طرح کی بدحواسی اور بھاگم بھاگ کا شکار دیکھا تھا۔ گاؤں میں اسے کہیں باہر بیٹھ کر بات چیت کرتے، تاش کھیلتے، ہنسی مذاق کرتے یا ٹی وی دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔ کوئی لاچار اور خوفزدہ جلد بازی تھی جو اسے کہیں

مستقل نہیں رہنے دیتی تھی۔

شفاعت خان کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مزدوری پکڑ کر رکھتا تھا کیونکہ اسے پانی پینے کے لئے ہر روز کنواں کھودنا پڑتا ہے اور روٹی کی نئی فصل پیدا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے خاندان میں روٹی پانی کے لئے اس کی بات جوہنے والا بھی ایک نہیں پانچ تھے۔ شفاعت خان کا باپ شرافت خان جسے پچھلے آٹھ سال سے ٹی بی تھی۔ اس کی ماں ساجدہ بیگم جس کی آنکھیں کسی فری آئی کیمپ میں موتیا بند کا آپریشن کروانے کے بعد اندھی ہو چکی تھیں اور اب اسے ہر طرف سے اندھیرا نظر آتا تھا۔ اس کی بیوی دردانہ جو اپنے شوہر کی پرچھائیں تھی۔ دردانہ شفاعت خان کے کام میں ہاتھ بٹائی تھی اور گھر کا چولہا چوکا سنبھالتی تھی۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ آج تک دونوں کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ لگتا تھا وہ دراصل مصائب اور آفات ہی ہوتی ہیں جو میاں بیوی کے تعلقات کی بنیاد کو مضبوط یا کمزور بنایا کرتی ہیں۔

محبت خان اور شاہانہ شفاعت خاں اور دردانہ کی دو اولادیں تھیں۔ محبت خان آٹھ سال اور شاہانہ چھ سال کی تھی۔ محبت خان گاؤں ہی کے پرائمری سکول میں پڑھتا تھا اور سکول کے بعد گاؤں کے پاس سے گزرنے والی سڑک پر رنگیلا آٹو ورکس میں گاڑیوں میں ہوا بھرنے، پنکچر لگانے اور سکوٹر موٹر سائیکلوں کی مرمت کے سلسلے میں ہیلپر کا کام کرتا تھا۔ اس کام کے اسے مہینے میں ایک ہزار روپے ملتے تھے۔ شفاعت خان کا بیٹا محبت خان اپنی پڑھائی کے دوران اپنی دال روٹی کا انتظام خود اپنی محنت سے کر رہا تھا۔

سکول کے اساتذہ کا کہنا تھا کہ چوتھی کلاس میں محبت خان پڑھائی میں سب سے تیز ہے لیکن جب یہ بات اس کے باپ شفاعت خاں کو بتائی جاتی تھی تو اس کی آنکھیں کہیں خلا میں معلق ہو جاتی تھیں۔ شاید اسے دور آسمان پر کچھ نظر آنے لگتا تھا۔ اس کے چہرے کی لکیریں کانپتی تھیں۔ آنکھوں کی چمک بجھنے لگتی تھی۔ پھر جیسے کسی گہرے کنویں میں سے بھرائی ہوئی اس کی آواز باہر نکلتی تھی۔

''میں بھی تو بی اے فرسٹ کلاس ہوں...... کیا ہوا؟'' اس کے بعد شفاعت خان کی آنکھوں میں چمک آ جاتی تھی اور وہ پپڑی جمے ہونٹوں سے مسکراتا ہوا کہتا تھا۔ ''آج کل میں کمپیوٹر سیکھ رہا ہوں''۔

بس سٹینڈ پر جو سٹار کمپیوٹر سینٹر تھا۔ وہیں جاتا تھا۔ عمارتی سامان اور ہارڈ ویئر دکان چلانے والے آصف محمود کا بیٹا عقیل ارسلان اس کمپیوٹر سینٹر کا مالک تھا اور کہتا تھا چاچا اگر ٹائپنگ اور پرنٹ نکالنے کا کام سیکھ لیا تو ماہانہ ایک ہزار سے اوپر دوں گا۔

شفاعت خاں کہتا تھا ٹائپنگ میں اس مہینے میں نے تیس کی سپیڈ نکالی تھی۔ اسے تھوڑا بہت کام مل جاتا تھا لیکن ابھی بہت سی غلطیاں ہو جاتی تھیں اور بہت سا ٹائم انہیں سدھارنے میں نکل جاتا تھا لیکن ساری باتیں تو بہت پہلے کی تھیں۔

شفاعت خان ان دنوں بہت بڑی مصیبت میں تھا اور بار بار کہتا تھا میرا نام شفاعت خان نہیں ہے۔ میں حلف نامہ دینے کو تیار ہوں۔ جسے بننا ہے، بن جائے شفاعت خان، آپ لوگ مجھے کسی طرح بچا لیجئے۔ میں آپ سب کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

شفاعت خان کی چھ سال کی بیٹی شاہانہ گاؤں کے سرکاری پرائمری سکول میں درجہ دوم کی طالب علم تھی اور وہ سکول کے بعد ڈھائی کلومیٹر دور دو تالابوں کے پار بسے گاؤں دھیدووالی چلی دیتی تھی۔ جہاں سے وہ رات نو بجے تک گھر لوٹتی تھی۔ وہ دھیدووالی کے سمیع اللہ کے ایک سال کے بیٹے کو سنبھالنے اور ان کے امور

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خانہ داری میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ اس کے عوض اسے رات کا کھانا اور پانچ سو روپے ماہانہ ملتا تھا۔ وحید ووالی کے بڑے کسان اور لائف انشورنس کارپوریشن میں منیجر ارباب مغل گلکٹر سے لے کر منسٹر تک پہنچ اور رسوخ رکھتا تھا۔ دو بار ممبر یونین کونسل اور ایک بار چیئرمین رہ چکے تھے۔ سمیع اللہ جس کے ایک سال کے بیٹے کو شاہانہ سنبھالتی تھی۔ ان ہی ارباب مغل کے پانچ بیٹوں میں ایک بیٹا تھا۔ حالانکہ اس کا نام سیماب مغل تھا لیکن گاؤں کے لوگ اسے بس مغل ہی کہتے تھے اور پیٹھ پیچھے کہتے تھے کہ سمیع اللہ کے پاس ایمان نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کبھی کبھی شراب پی کر گندی اور غلیظ گالیاں بک رہا ہوتا تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا بھی خاص طور پر ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جن کے بارے میں کوئی بھلی بات نہیں سنی گئی۔

سمیع اللہ اونچی ذات کا تھا جبکہ شفاعت خاں نیچی ذات کا جولاہا تھا۔ اس کی برادری کے بہت سے لوگ بھی چٹائی، دری کمبل بنتے تھے۔ شفاعت خاں ہمارے گاؤں ہی نہیں آس پاس کے کئی دیہاتوں میں اپنی برادری کا پہلا لڑکا تھا جس نے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ بی اے پاس کیا۔ شفاعت خان نے جب بی-اے پاس کیا۔ شفاعت خان کے باپ شرافت خاں اور ماں ساجدہ بیگم کو پوری امید تھی کہ اب بہت جلد اسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی۔ شفاعت خان کی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہی جنگ پور کے صولت کی خوبصورت بیٹی دردانہ کے ساتھ ہو گئی تھی۔ دردانہ محنتی تھی۔ سسرال آتے ہی اس نے گھر کا سارا کام ہی نہیں سنبھالا بلکہ آس پاس چھوٹی موٹی مزدوری کر کے کچھ روپے بھی کمانے شروع کیے جس سے شفاعت کی پڑھائی کا خرچ نکل سکے۔

سب کی آنکھیں شفاعت خان پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ بی اے فرسٹ ڈویژن پاس کرنے والا وہ اپنی ذات برادری کا پہلا لڑکا تھا۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو سب اخبارات میں اس کی فوٹو بھی چھپیں اکیڈمی چلانے والی کمپنیوں نے اس کے فوٹو چھپوائے۔ شفاعت خان نے دفتر روزگار میں اپنا رجسٹریشن کرایا اور روزگار اخبار میں چھپنے والے روزگار اشتہارات کو دیکھ کر جگہ جگہ عرضیاں بھیجنے لگا۔ دفتر روزگار سے اس کے پاس کبھی کبھی کارڈ بھی آتے رہے۔ اس نے اتنی محنت کی جتنی پڑھائی کے دوران بھی نہیں کی تھی۔ شفاعت خان ہر جگہ جاتا۔ تحریری امتحان میں سب سے اوپر رہتا لیکن جب انٹرویو ہوتا تب اسے ناکام کر دیا جاتا۔ وہ دیکھتا کہ اس کی جگہ آٹھویں دسویں یا تھرڈ سیکنڈ ڈویژن بی-اے کرنے والے لڑکے نوکریوں میں لے لئے جاتے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس کوئی کسی نہ کوئی سفارش ہوتی تھی اور وہ نہ کسی افسر یا بڑے آدمیوں کا داماد، بیٹا، بھتیجا، بھانجا یا چاپلوس یا ملازم وغیرہ ہوتا تھا۔ شفاعت خاں ہر بار ناکام لوٹتا لیکن اس نے امید کا دامن تب بھی نہیں چھوڑا تھا۔

وہ جانتا تھا پاکستان میں رشوت اور سفارش بہت ہے لیکن تب بھی دس فیصد لوگ میرٹ اور صلاحیت کے دم پر نوکری حاصل کر لیتے ہیں۔ دھیرے دھیرے شفاعت خاں کو یہ بھی پتہ چلا کہ کئی نوکریوں کی تو باقاعدہ بولی لگتی ہے۔ اگر اس کے باپ شرافت خان کے پاس لاکھ پچاس ہزار ہوتے تو دو تین ایسی نوکریاں اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹتیں۔ جن میں رشوت دے کر اس کا تقرر ہو گیا ہوتا۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا۔ اس کی عمر سرکاری ملازمت والی عمر کی حد پار کرنے لگی گھر والے بھی مایوس ہونے لگے۔ دردانہ تب بھی ڈھارس بندھاتی۔

"کوئی بات نہیں سرکاری نوکری نہیں ملے گی تو

پرائیوٹ میں دیکھ لیں گے ورنہ کوئی دھندا کر لیں گے۔ آج کل پڑھے لکھے بے روزگاروں کے لئے سرکار کی کئی سکیمیں ہیں۔ مرغی پالن کر لیں گے۔ سرکار بینکوں سے لون دلاتی ہے"۔

ایک بار معلم کا عارضی کام اسے مل سکتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ کام جس افسر کی نگرانی میں تھا وہ اپنی ذات یا ایک دو سیاسی پارٹیوں کے لوگوں کو ہی اس میں بھرتی کر رہا تھا۔ شفاعت نیچ ذات کا تھا اور کسی بھی پارٹی کا چمچہ نہیں تھا۔

شفاعت خان بہت سیدھا سادہ مہذب اور خوددار تھا۔ ان کاموں کے لئے جتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی جتنے افسران کے ہاتھ پیر جوڑنے پڑتے یہاں وہاں جو کھلانا پلانا پڑتا۔ وہ اس کے بس میں نہ تھا۔ اوپر سے نوکری کی طرح یہاں بھی آپسی مسابقت اور مار کاٹ بہت تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ شفاعت خاں مسابقت سے ڈرتا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ بی اے کے امتحان میں میرٹ میں کیسے آتا؟ لیکن اس نے جلد ہی جان لیا کہ سکول کالج سے باہر کی دنیا اور حقیقی زندگی دراصل کھیل کا ایسا میدان ہے جہاں وہی گول کرتا ہے جس کے پاس دوسرے کو لنگڑی مارنے کی طاقت ہوتی ہے اور یہ طاقت سفارش، جوڑ توڑ، رشوت، رابطے جعل سازی وغیرہ تمام ایسی ناجائز اور غیر اخلاقی طاقتوں سے بنتی ہیں جس میں سے ایک بھی شفاعت خان کی پہنچ کے اندر نہ تھی۔

شفاعت خان ہی نہیں اس کی بیوی دردانہ، باپ شرافت خاں اور ماں ساجدہ بیگم سب ہی کے اندر اس کے سرکاری افسر بننے کی امیدیں بجھ گئی تھیں۔ اب تو لے دے کر یہ لگتا تھا کہ کچھ بھی ایسا مل جائے جس سے بے روزگاری اور خالی پن سے شفاعت کو نجات ملے اور کسی طرح گھر کی دال روٹی چلنے لگے۔

اس بیچ شرافت خان کو ٹی بی ہو گئی وہ کھانسنے لگا اور بلغم کے ساتھ خون کے قطرے اگلنے لگا۔ ٹھیک اس کے ایک ماہ بعد فری آئی کیمپ میں ساجدہ بیگم کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ دردانہ پر گھر کے کام کاج اور باہر کی مزدوری کے علاوہ ساس سسر کی دیکھ بھال اور خدمت کی ذمہ داری بھی آ پڑی وہ بھی ایسے وقت میں جب اسے خود آرام کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خود امید سے تھی۔ کوکھ میں محبت خان آ گیا تھا۔

شفاعت خان کو دیکھ کر لگتا جیسے وہ طویل عرصے سے بیمار تھا۔ گاؤں میں وہ کم ہی لوگوں سے ملتا تھا۔ وہ برداری کے لوگوں کا سامنا کرنے سے بھی کتراتا۔ سب ہی کے پاس ایک ہی سوال ہوتا تھا۔ "کیا کر رہے ہو؟ دال روٹی کا کچھ بنا؟" گاؤں کے پاس دریا راوی بہتا تھا۔ شفاعت خاں نے گرمیوں میں گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح راوی کی ریت میں کھیرا، تربوز، خربوزہ لگانے کا کام کیا۔ بیوی دردانہ ہی نہیں اس کے ماں باپ شرافت خان اور ساجدہ بیگم بھی وہاں آ جاتے اور کیاریاں بنا کر وہ دریا کے پانی سے پودوں کو سینچ کر کھیتی کرتے۔ دوپہر اور رات میں باری باری چوکیداری کرتے۔ سال بھر میں اس طرح آٹھ دس ہزار کی رقم بن جاتی لیکن کئی بار بے وقت برسات سے دریا کا پانی بڑھ جاتا اور گاؤں کے لوگوں کی تیار فصلوں کو بہا کر لے جاتا۔ شفاعت خاں کے ساتھ دو بار ایسا ہوا تھا۔

دھیرے دھیرے ایک گہری افسردگی اور مایوسی نے اس کے اندر ڈیرہ ڈالنا شروع کر دیا۔ جس دن دردانہ نے محبت خان کو جنم دیا۔ اس رات شفاعت خاں اپنے گھر نہیں لوٹا تھا۔ دریا راوی کی ریت میں بے سدھ پڑا آسمان کی وسعتوں کو تک رہا تھا۔ اتفاقاً وہ رات بھی اماوس کی ہی رات تھی۔ جس رات محبت خان پیدا ہوا۔ زچگی کے دوران ایک بار تو ایسا بھی ہو گیا کہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دردانہ کا مرنا جینا لگ گیا۔ زچگی کرانے آئی دائی صابراں نے گھبرا کر درد میں بے ہوش دردانہ کی موت کا اعلان کر دیا۔ اندھی ہو چکی ماں ساجدہ بیگم اور ٹی بی سے کھانستا باپ شرافت خاں دونوں اپنے بیٹے شفاعت خان کو پکارتے کھوجتے رہے لیکن وہ کہاں ملتا؟

وہ تو رات دریا راوی کی ریت میں اماوس کے آکاش کو مُردے کی طرح گھورتا ہوا خود اپنے اندر زندگی کا کوئی نشان ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں نیند نہیں، وہ ڈراؤنے سپنے منڈلا رہے تھے جو کسی کرپٹ اور پستی مائل نظام کی کوکھ میں ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔

شفاعت خاں اس رات راوی کنارے شاید بے ہوش ہی تھا۔ تب ہی تو اُسے اپنے باپ شرافت خان اور ماں ساجدہ بیگم کی آواز سنائی دی نہ دردانہ کی چیخیں اور نہ علی الصبح چار بجے کے آس پاس اپنے نومولود بیٹے محبت خان کے رونے دھونے سے شفاعت خان کی بے ہوشی یا نیند ٹوٹ سکی تھی۔ شفاعت خان بہت دیر تک ہر پل گرم تر ہوتی ہوئی ریت پر یونہی پڑا رہا۔ اس کا جسم نڈھال تھا اور یادیں گڈمڈ تھیں۔ اسے یہ سمجھنے میں تھوڑا وقت لگا کہ وہ اپنے گھر کے دالان میں نہیں، دریا راوی کی ریت پر پڑا ہوا ہے۔ جہاں ابھی کچھ ہی دنوں پہلے اس نے کھیرا خربوزہ اور ٹماٹر لگا رکھے تھے اور بے وقت کی بارشوں سے اُمڈے دریا کی سرکش لہروں نے بپھرتے ہوئے وہ سب کچھ نگل لیا تھا۔

شفاعت خان جب واپس اپنے گھر لوٹا تو وہاں گاؤں کے سارے لوگ جمع تھے۔ عورتیں بھی تھیں لگتا تھا سب اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے کیونکہ اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے اور یکے بعد دیگرے وہاں سے تتر بتر ہو گئے۔

"دردانہ بس اللہ کے کرم سے بچی ہے"۔ ماں ساجدہ بیگم نے آنچل کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "جا کے خود ہی دیکھ لے"۔

شفاعت خان اس کوٹھڑی میں گیا جس میں دردانہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے موت کے منہ سے نکل کر اپنے بچے کے ساتھ کھاٹ پر سوئی ہوئی تھی۔ شفاعت خان نے بہت کمزور آنکھوں سے دردانہ کو دیکھا۔ دردانہ نے آنکھیں کھول کر شفاعت کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے میں ایسی بے چارگی اور ندامت تھی کہ شفاعت خان کا کلیجہ دہل گیا۔ تب ہی شفاعت خان کی نظر دردانہ کے پہلو میں سوئے ہوئے بچے پر پڑی۔ موٹا تازہ گول مٹول بچہ بالکل بے فکر اپنی ماں سے لپٹ کر سویا ہوا تھا۔ بہت خوبصورت اور معصوم وہ سچ مچ کوئی فرشتہ لگ رہا تھا۔ شفاعت خاں کے اندر پہلی بار ایک باپ کے احساس نے جنم لیا۔ اس کی آنکھیں بچے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ تب ہی باہر دالان سے شرافت خان کی آواز سنائی دی۔

"حبیب اللہ ڈاکیا آیا ہے، کوئی ڈاک لایا ہے"۔

شفاعت نے دیکھا کہ پاک کمپیوٹر بلڈنگ سے نوکری کے لئے انٹرویو لیٹر آیا تھا۔ شفاعت خان کے پاس پچھلے کئی مہینوں سے اس طرح کے لیٹر آنے بند ہو گئے تھے تو کیا رات کو دریا راوی کی ریت پر سوئے ہوئے جو کچھ وہ سوچ رہا تھا شاید اللہ کی بارگاہ میں اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ کسی فرشتے نے اس کے دکھوں اور مصائب کو جان لیا تھا۔ کیا دردانہ نے سویرے جس بچے کو جنم دیا تھا وہ بغیر پروں کے سچ مچ کوئی فرشتہ تھا جو اپنے جنم کے ساتھ ہی پورے خاندان کے لئے نئی زندگی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ پاک کمپیوٹر بلڈنگ کے ارسال کردہ اور دفتر روزگار کی معرفت اس تک پہنچے اس انٹرویو کارڈ میں شفاعت خان کو ایک نئے مستقبل کا سویرا جھلملاتا دکھائی دے رہا تھا۔ طویل مدت کے بعد اس کے دل میں پھر سے امید کی سنہری ملائم دھوپ

اُگنے لگی۔ اس رات شفاعت خان ٹھیک سے سو نہیں سکا۔ اپنی زندگی کے جس درخت کو وہ اب تک ٹھنٹھ سمجھ بیٹھا تھا اس میں کہیں سے پھر کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

پاک کمپیوٹر بلڈنگ میں اس دن وہ انٹرویو کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ اس کے اندر اس بار بے پناہ خوداعتمادی اور ہر حالت میں ملازمت حاصل کر لینے کا جوش تھا۔ ایک گھنٹے کا تحریری امتحان تھا۔ پھر ایک گھنٹہ کے وقفہ کے بعد جسمانی آزمائش تھی۔ شفاعت خان مکمل یکسوئی اور لگن کے ساتھ جت گیا۔ ایک گھنٹے والا تحریری امتحان اس نے آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں نمٹا دیا۔ سوال بہت آسان تھے اور ان کے جواب بھی نیچے لکھے ہوئے تھے۔ بس صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگانا تھا۔ اس کے بعد پندرہ سو میٹر کی دوڑ، وزن اٹھانا۔ میدان کے پانچ چکر لگانا، آئی سائٹ ٹیسٹ، رنگوں کی پہچان اور جسمانی آزمائش میں دو گھنٹے لگے۔

شام چار بجے پاک کمپیوٹر بلڈنگ کے بھرتی دفتر کے دروازے سے دو سو امیدواروں میں سے چنے گئے جو پانچ نام پکارے گئے ان میں سے پہلا نام شفاعت خان ہی کا تھا۔ شفاعت خان کا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک انہونی ہونے جا رہی تھی۔ اب بہت جلد اس کی زندگی کی اب تک بے یقینیوں کا اختتام ہونے جا رہا تھا۔ اسے ہر ماہ تنخواہ ملا کرے گی۔ گھر میں ہر روز چولہا جلے گا۔ باپ اور ماں کا علاج ہو گا۔ محبت خان کی پڑھائی اور پرورش بخوبی ہو سکے گی۔ دردانہ کو مزدوری میں دوسروں کے یہاں جان نہیں کھپانی پڑے گی۔

پاک کمپیوٹر بلڈنگ کے منیجر نے شفاعت خان سے اس کے سارے سرٹیفکیٹ اور مارک شیٹس دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"ارے تم ابھی تک نوکری کا جگاڑ کیوں نہیں بٹھا پائے۔ اگر تم تھوڑی سی کوشش کرتے تو تمہیں کوئی اچھی ملازمت مل سکتی تھی"۔

"جائننگ کب تک ہو جائے گی؟" شفاعت خان نے پوچھا۔

"جائننگ ہی سمجھو"۔ منیجر نے جواب میں کہا۔ "اسی ہفتے کے اندر اندر کاغذی کارروائی پوری ہو جائے گی اور اگلے ہفتے تک تقرری کا خط تمہارے پتے پر بھیج دیا جائے گا"۔

شفاعت خان کے گھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پوسٹ آفس کے کھاتے میں دو ہزار روپے پڑے تھے۔ شفاعت خان نے ایک مچھر دانی، ایک کلو دیسی گھی، گڑ، کچھ نئے برتن اور دردانہ اور محبت خان کے لئے کچھ کپڑے خریدے۔ اس نے اپنے لئے بھی نیلے رنگ کی ڈینم کی پینٹ، چیک والی شرٹ، پچاس روپے کا ایک پرس اور بیس بیس روپے کے دو رومال خریدے۔ گوالے کو کہہ کر اس نے روز سویرے آدھ کلو دودھ کا باقاعدہ بندوبست کر دیا۔

گاؤں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ شفاعت خان کو آخرکار پاک کمپیوٹر بلڈنگ میں اچھی پکی نوکری مل گئی ہے۔ گاؤں کے جو لوگ اس سے مکمل طور پر منہ پھیر چکے تھے، انہوں نے بھی اس سے میل جول بڑھانا شروع کر دیا۔ جو لوگ اس کی محنت اور پڑھائی کا مذاق اڑانے لگے تھے انہوں نے دبی دبی آواز میں کہنا شروع کر دیا۔ "یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسی ڈگری اور پڑھائی کے بعد شفاعت خان کب تک خالی بیٹھتا"۔

"دراصل شفاعت خان جولاہا ذات کا ہے"۔ کچھ لوگوں نے یہ تبصرہ بھی کیا۔ "اسے اب ریزرویشن میں ڈال دیا گیا ہے۔ نوکری اسے تحفے میں ملی ہے کیونکہ اس ذات کا کوئی دوسرا لڑکا بی اے تھا ہی نہیں"۔

اس ہفتے شفاعت خان کے گھر میں ایک بار پھر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھی بنی اور ایک بار آلو مٹر کا سالن بھی۔ ماں ساجدہ بیگم اپنی آنکھوں کے اندھے پن کو بھول گئی۔ باپ شرافت خان نے پشاوری بیڑی کا پورا پیکٹ اور جہاز مارکہ ماچس کی ڈبیا خریدی جس کی تیلی کو رگڑ پٹی میں بس ہلکا سا گھستے ہی آگ جل اٹھتی۔ گھر کے باہر تھڑے میں بیٹھ کر شرافت خان نے کئی رات سے بلند آواز میں عالم لوہار کے ٹپے گائے اور نہ اسے ایک بار بھی کھانسی آئی اور نہ خون کے قطرے بلغم کے ساتھ باہر نکلے۔ ایک دن صبح صبح اندھی ساجدہ بیگم آنگن میں خوشی کے مارے چکر گھنی مارتے ہوئے زور سے گانے لگی۔

ہم پردیسی لوگ، ہم پردیسی لوگ
اب کے بچھڑے ملیں گے کب ہم؟
کب ہو سنجوگ، کیا جانے ہم پردیسی لوگ؟

شفاعت خان نے دوسرے ہفتے پاک کمپیوٹر بلڈنگ کی چٹھی کا ہر روز انتظار کیا لیکن اس ہفتے ڈاکیا ہی نہیں آیا۔ اس کے بعد کا ہفتہ ایسے ہی گزر گیا۔ بیس بائیس دن ہو رہے تھے پتہ چلا کہ چوہدری نفیس رضا کے لڑکے چوہدری احسن رضا کو چٹھی پہلے ہی مل گئی ہے اور اس نے سروس بھی جوائن کر لی ہے۔ شفاعت خان بے چین ہو گیا۔ اس نے کوہستان بس پکڑی اور پاک کمپیوٹر سینٹر پہنچا۔ بھرتی دفتر کے اسی منیجر نے تسلی دی کہ امید ہے دو پوسٹیں اور بڑھ جائیں گی اور اگر نہیں بھی بڑھیں تو شفاعت خان کا نام نہیں کٹے گا کیونکہ لسٹ میں اس کا نام پہلا ہے۔

شفاعت خان لوٹ آیا۔ منیجر نے اسے ایک آدھ مہینے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا اور مکمل بھروسہ دلایا تھا لیکن شفاعت خان کے اندر کچھ بجھ سا گیا تھا۔ اسے فکر ہو رہی تھی کہ گوالا مہینہ گزرتے ہی ہر روز کے آدھ کلو دودھ کا پورا حساب مانگے گا۔ دردانہ نے اسے ڈھارس رکھنے کو کہا۔ ماں ساجدہ بیگم نے داتا دربار سے منت مانی۔ باپ شرافت خان کچھ چپ سا رہنے لگا۔ اس نے رات میں ماہیے گانے چھوڑ دیئے اور اسے کھانسی پھر آنے لگی۔

شفاعت خان ڈیڑھ ماہ بعد پھر پاک کمپیوٹر بلڈنگ گیا۔ بہت انتظار کرنے کے بعد منیجر نے اسے بھرتی دفتر کے اندر آنے دیا۔ اس نے اس سے اور انتظار کرنے کے لئے کہا لیکن اس بار اس نے انتظار کی آخری حد نہیں بتائی۔ اس بار کی آواز میں پہلے جیسی اپنائیت بھی نہیں تھی۔ شفاعت خان نے چلنے سے پہلے ذرا زور دے کر پوچھا کہ کیا وہ اگلے مہینے کے بعد ایک بار پھر آ کر پتہ کر لے؟

"ویسے تو پتہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ منیجر نے بے دلی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "چٹھی ملے گی تو اپنے آپ پتہ چل جائے گا"۔ پھر اس نے کہا۔ "دراصل اس روز امیدواروں کو سلیکٹ کرنے اسلام آباد سے پاک کمپیوٹر بلڈنگ کا جو افسر آیا تھا، سالے نے ایک پوسٹ پر اپنے داماد کو فٹ کر دیا ہے...... سب اوپر والوں کا کھیل ہے"۔

شفاعت خان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اگلے مہینے شفاعت خان پھر پتہ لگانے گیا۔ شاید کچھ ہو جائے۔ صبح دس بجے سے لے کر دوپہر ساڑھے تین بجے تک اسے دفتر کے باہر بیٹھے رہنا پڑا۔ چپڑاسی کی منت سماجت کے بعد جب اسے اندر جانے دیا گیا تو وہاں پتہ چلا کہ پہلے والا منیجر چھٹی پر گیا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نیا موٹا سا منیجر اس کا کام دیکھ رہا تھا۔ اسے اس فائل کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ شفاعت خان کو اپنی اوریجنل مارک شیٹس اور سرٹیفکیٹوں کی فکر ستانے لگی۔ اس نے ان کے بارے میں پوچھا۔

"تمہارے سرٹیفکیٹوں کا بھلا ہم کیا کریں گے؟" نئے موٹے منیجر نے جواب دیا۔ "اگر ملازمت نہیں دی گئی تو رجسٹرڈ ڈاک سے واپس بھیج دیں گے۔ ورنہ اگلی بار خود آ کر لے جانا"۔

شفاعت خان پھر لوٹ آیا۔ اس کے من کے سب سے اندرونی کونے نے بخوبی جان لیا تھا کہ اس کی زندگی کے ٹھنٹھ کی کسی گانٹھ سے جو نئی کونپلیں پھوٹنے والی تھیں اللہ نے اس کی مصیبتیں جان کر اس کے لئے رحم کی جو دو بوندیں ٹپکائی تھیں انہیں بدقسمتی کی لو نے جھلسا ڈالا تھا۔ اب کوئی امید کہیں سے نہیں بچی تھی۔ اگر اس کے پاس کوئی نقدی جمع ہوتی تو کسی دلال سے مل کر روپے اوپر تک پہنچا کر وہ یہ نوکری حاصل کر سکتا تھا۔ شفاعت خان کی حالت کو گاؤں کے امیر لوگوں نے سب سے پہلے جان لیا اور پہلے کی طرح وہ پھر اس کی تعلیم اور قابلیت کا مذاق اڑانے لگے۔

اس دن شفاعت خان ذلت کے کڑوے گھونٹ پی کر رہ گیا جس دن ضلعی چیئرمین سردار آصف علی ڈوگر کا بیٹا علی ڈوگر جو اسی کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا اور بمشکل تمام بی اے تھرڈ ڈویژن میں پاس کر سکا تھا لیکن اپنے سسر کی سفارش پر پولیس میں انسپکٹر ہو گیا تھا۔ اس نے اسے آواز دے کر بلایا تھا۔

"شفاعت خان! پرسوں ہی ہم نے پاک کمپیوٹر بلڈنگ کی ایک نئی شاخ کا افتتاح کروایا ہے"۔ اس نے بڑی رعونت سے کہا۔ "اگر مناسب سمجھو تو کمپیوٹر بلڈنگ میں صفائی ستھرائی کا کام دردانہ جی کے ساتھ مل کر سنبھال لو۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ تو ملے گی ہی۔ جناح کمرشل بحریہ ٹاؤن میں ہم تمہارا مکان پکا کروا دیں گے"۔

"سوچ کر بتاتا ہوں"۔ شفاعت خان نے کہا تھا اور اس نے اپنے اندر اٹھتی ذلت کو منہ پھیر کر اس سے چھپا لیا تھا۔

علی ڈوگر کے منہ سے دردانہ کا نام سن کر اس کے اندر کہیں اپنی بے چارگی اور بے بسی کا احساس گہرا ہوتا گیا اور نامعلوم خوف نے بھی اس کے دماغ کے کسی کونے میں جنم لیا۔ جلد کچھ کرنا ہو گا ورنہ اس کا سارا خاندان ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ کچھ ایسا کام جو اس کے بس میں ہو۔ بس اور کسی کی مدد یا سفارش کی ضرورت نہ ہو۔ دردانہ کا خوبصورت چہرہ اور علی ڈوگر کی شاطر آنکھیں بار بار اس کے سامنے کوند جاتی تھیں۔

اسی پل اس نے طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے سرٹیفکیٹ مارک شیٹس اور دوسرے کاغذات کا پتہ کرنے پاک کمپیوٹر بلڈنگ نہیں جائے گا کیونکہ ان کاغذ کے ٹکڑوں کی کہیں بھی کوئی قیمت نہیں رہ گئی تھی جس کی بنیاد پر ملازمتیں ملتی تھیں اور سرکاری سکیموں سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ وہ بنیاد اس جیسے لوگوں کے پاس ہے ہی نہیں۔ اس رات شفاعت خاں رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر میں نہیں سویا۔

دردانہ سے صبح صبح لوٹنے کا کہہ کر کندھے پر کدال ٹانگ کر وہ دریا راوی پر چلا آیا اور ساری رات کسی پاگل کی طرح ککڑی، کھیرا، خربوزہ، ٹماٹر لگانے کے لئے کیاریاں بنانے میں لگا رہا۔ صبح چار بجے کے آس پاس جب شمال میں قطب تارہ اپنی چمک بجھ جانے کے باوجود چمک رہا تھا، شفاعت خان نے اپنی پیشانی اور چھاتی کے پسینے کو پونچھا اور دھیرے دھیرے رینگتا ہوا دریا راوی کی دھار میں کھڑا ہو گیا۔ چلو میں پانی بھر کر سر پر چھینٹا مارا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اللہ سے دعا مانگی۔

"میرے اللہ! تُو ہی خالق کائنات ہے، تُو ہی اس کائنات کا سب سے بڑا تخلیق کار ہے، تُو ہی ہر شخص کو رزق و خوشی و سکون اور اقتدار بخشتا ہے۔ تُو نے ہی انسان، جانور، پودے، دریا اور پہاڑ بنائے۔ تُو نے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کائنات کی ہر شے تخلیق کی۔ تُو ہی بیماروں کو شفاء، بے روزگاروں کو روزگار، جاہلوں کو علم اور مظلوموں کو انصاف دینے والا ہے۔ اے میرے رب! میری دھرتی کے سب غریبوں کو خوشحال کر دے"۔

شفاعت خان جب درود پاک کا ورد کرتا ہوا دریا راوی کی دھار میں سے باہر آ رہا تھا تب اس کی آنکھ سے امڈتے آنسو دریا راوی کے پانی میں ٹپک کر بہہ رہے تھے۔ جہاں ننھی منی مچھلیاں ان کے نمک کو چکھنے کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی تھیں۔ جب شفاعت خان گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ دردانہ نے پورا آنگن گوبر سے لیپ رکھا ہے۔ ماں ساجدہ بیگم چادر پر کھیرا، لوکی، تربوز، خربوزے کے بیج پھیلا کر اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر انہیں بیننے میں لگی ہوئی تھی۔ باپ شرافت خان آنگن کے کونے میں بانس کے چھلکے نکالنے میں مصروف تھا اور بیچ آنگن میں اس کا ڈیڑھ سال کا بیٹا کھرپی سے گھاس کھودنے کا معصوم کھیل کھیلنے میں مگن تھا۔

اس کے قدموں کی آہٹ سن کر ساجدہ بیگم نے سر اٹھایا اور نابینا ہو چکی آنکھوں کو اپنے بیٹے کی آنکھوں سے ملا کر مسکراتے ہوئے بتایا کہ مینا کے گھونسلے میں مادہ مینا نے دو بچوں کو جنم دیا ہے۔ ساجدہ بیگم بہت خوش ہوتی۔ اگر دیکھ پاتی کہ اس کی بات سن کر شفاعت خان کے چہرے پر خوشی کس طرح دمک رہی ہے۔ اس روز رات میں کھانا کھانے کے بعد شفاعت خان دردانہ اور محبت خان کو بھی اپنے ساتھ دریا راوی لے گیا۔ دردانہ نے اپنے ہاتھ میں ڈھیر سارے بیج پکڑ رکھے تھے اور کندھے پر محبت خان کو بٹھا رکھا تھا۔ محبت خان کچھ ہی دیر میں دریا راوی کنارے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے ملنے والے سکھ میں ڈوب کر گہری نیند سو گیا تھا۔ دردانہ اور شفاعت خان بیج اگانے کے لئے

کیاریوں میں گوبر کی کھاد ڈال کر الگ الگ پھلوں سبزیوں کے بیج بونے میں لگے رہے۔ دو گھنٹے میں کام نپٹ گیا۔ دردانہ جب گڑھے سے دریا راوی سے پانی لا کر بیجوں کی کیاریوں میں چھڑکاؤ کر رہی تھی تو آکاش پہ ٹمٹماتے تاروں کی روشنی میں شفاعت خان اس کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ آکاش کے تاروں سے گرتی سلیٹی چاندنی کی مدھم جھلک میں دردانہ کا سانولا جسم خالق کا شاہکار معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے برسوں میں دھیرے دھیرے بنایا ہو۔ جو محبت کے سوا کچھ بھی دے نہیں سکتا جو محبت کے سوا کچھ بھی نہیں لے سکتا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ ٹیٹری کی آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی۔ دریا راوی کی نم ہوا کے بھاری پن میں دردانہ کے بدن سے اٹھنے والی پسینے کی خوشبو نے شفاعت خان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس عورت نے اس سے شادی کرتے ہوئے کیا سپنا دیکھا تھا اور اسے کیا ملا۔ صبح سے لے کر رات تک ہر روز بلاناغہ ہر سکھ دکھ، ہاری بیماری، بھوک پیاس میں وہ اس کے ساتھ کھڑی رہی۔ شفاعت خان کے دل میں دردانہ کے لئے گہری ہمدردی اور اپنائیت پیدا ہوئی۔ وہ اسے پیار بھری نظروں سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ دردانہ نے مٹکا ریت پر لگایا اور کھڑی ہو کر اپنا جُوڑا باندھنے لگی۔ شفاعت خان اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ دردانہ چپ تھی۔

"چلو دردانہ کبڈی کھیلتے ہیں؟" شفاعت خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہو...... تو...... تو!" اس نے دردانہ کا بازو پکڑ لیا تھا اور اس کے پیٹ اور بغلوں میں گدگدی کرنے لگا تھا۔ دردانہ اس سے چھوٹنے کے لئے جھپٹ پٹا رہی تھی۔ "ارے...... ارے...... محبت خان جاگ جائے گا۔ چھوڑ دو مجھے، چھوڑ...... چھوڑ"۔

دردانہ دریا راوی کی طرف بھاگی وہ کسی جوشیلی آزاد ہرنی کی طرح قلانچیں مار کر آکاش کے کنگریالے سلیٹی اجالے کے نیچے دور تک پھیلی راوی کی ریت پر دوڑ رہی تھی۔ اس کی آواز ہر پل دور ہوتی جا رہی تھی اور وہ ہر پل چھایا بنتی ہوئی اندھیرے میں گم ہوئی جا رہی تھی۔

"ہو...... تو...... تو...... تو......" کہتا ہوا شفاعت خان پوری تیزی سے اس کی طرف دوڑا دردانہ نے اور دم لگایا۔ شفاعت خان ہر پل اس کے قریب آتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار بڑھائی اور دریا راوی کے کنارے کنارے پانی میں چھپ چھپ کرتی ہوئی پورے جی جان سے بھاگتی چلی گئی۔

"آ...... آ...... چھولو جانو!" ہر پل آواز اس کے کان کے آتی جا رہی تھی۔ دردانہ جانتی تھی کہ وہ شفاعت خان کو اور جھکا نہیں پائے گی پھر بھی اس نے آخری زور لگایا لیکن تب تک ایک ہی اچھال میں شفاعت خان نے اسے پکڑ لیا۔ دونوں راوی کے پانی میں چھپاک سے گر گئے۔

چھوڑ......!" وہ چلائی۔ شفاعت خان نے اسے راوی کے پانی میں گرا لیا اور اس کے پاس سرکتے ہوئے کہا۔

"دردانہ! تم پانی میں کنول کی صورت بے لوث ہو"۔ اور اسے ساتھ لگا لیا۔

بیساکھ کی اس گرم رات میں دور آکاش میں ٹمٹماتے ستاروں کی مدھم سلیٹی روشنی میں دریا راوی کے پانی میں دو جوان مچھلیوں کی طرح وہ دونوں بے باک اور بے روک ٹوک چھپا چھپ کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں دردانہ کے گلے سے اٹھتی ہوئی ہنسی اور قلقاری کے ساتھ شفاعت خان کی بھاری سانسوں کی ہو...... تو...... تو...... رات کے سکوت کو چیر جاتی تھی۔ تھکی ہوئی دردانہ

راوی سے لوٹ کر بھیگی ساڑھی میں ہی محبت خان کے پہلو میں سو گئی تھی لیکن شفاعت خان جانے کتنی رات تک راوی کے کنارے میں ہی پڑا ہوا آکاش کے تاروں کی مدھم روشنی میں گاتا رہا۔

دریا کی روانی ہے
لگتا ہے یہ جیون
بہتا ہوا پانی ہے
شیشہ ہے نہ پتھر
خالی میری جھولی
کیا میرا مقدر ہے

اس کے گلے میں آج ایک ایسا سریلا پن اتر آیا تھا کہ دور سنائی دیتے ٹیٹری کے بول بھی قریب آ کر اس کی سنگت کرنے لگے تھے۔ بعد میں شاہانہ اسی رات کی یاد بنی تھی۔ اس سال تو ککڑی، تربوز اور سبزیوں کی فصل اچھی ہوئی لیکن بازار میں بھاؤ مندا ہو جانے سے کمائی کچھ خاص نہیں ہو سکی تھی۔ دردانہ امید سے تھی۔ پھر بھی اسے دوسروں کی مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ شفاعت خان بھی جی توڑ محنت کرتا رہا۔ اللہ نے تو ایک بار اس کی دعا سن لی تھی لیکن بعد میں راوی کا پانی امڈ آتا اور شفاعت خان کی مہینوں کی محنت کو اس کی باڑ نگل جاتی۔

شرافت خان کی کھانسی بڑھنے لگی تھی۔ حالانکہ چھ کلومیٹر دور کے قصبے کے سرکاری ہسپتال میں ایک بہت اچھا ڈاکٹر آ گیا تھا۔ ڈاکٹر خرم باجوہ نے شفاعت خان کو سمجھایا تھا کہ ٹی بی کے لئے ہسپتال سے مفت دوا ملتی ہے اور اس کے باپ کو اس کا پورا کورس کرنا چاہیے۔ انہوں نے اسے ایک پولیتھین کی تھیلی میں دو مہینے کی دوا بھر کر دے دی تھی لیکن شرافت خان خود ہی نہ وقت پر دوا لے پاتا تھا اور نہ پورا پرہیز ہی کر پاتا تھا۔ ماں ساجدہ بیگم کی آنکھ کے بارے میں ڈاکٹر خرم باجوہ نے

www.aiourdubooks.net

بتایا تھا کہ آپریشن سے چالیس فیصد روشنی لوٹ سکتی ہے لیکن اس میں کم از کم آٹھ دس ہزار خرچ ہوں گے۔ انہوں نے شفاعت خان کو بھروسہ دلایا تھا کہ اگر ضلع کا کوئی اچھا اور ایماندار کلکٹر آیا تو اس کا یہ کام کروا دیں گے۔

لیکن سال پہ سال گزرتے رہے ایسا کلکٹر نہیں آیا۔ بیچ میں ایک بار ایک رضا کار انجمن کی طرف سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی بستی میں آنے لگے تھے۔ انہوں نے دردانہ اور شفاعت خان کو بہت یقین دلایا کہ وہ جلد ہی کوئی ایسا بندوبست کر دیں گے کہ اس کا خاندان آرام سے اپنی گزر بسر کرنے لگے گا۔ انہوں نے کئی عرضیاں بھی لکھیں اور ان پر شفاعت خان کے دستخط کرائے لیکن پھر ان کا آنا ہی بند ہو گیا۔ پتہ چلا کہ لڑکے لڑکی نے شادی کر لی ہے اور وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ وہ لڑکی اب کسی ٹی وی چینل میں کام کرنے لگی تھی اور لڑکی نے کراچی میں ہی اپنے ڈائریکٹر جنرل پھوپھا کی مدد سے کورنگی بستی کے مکینوں کے لئے کام کرنے والی کوئی انجمن کھول لی تھی اور وہ ملک و بیرون ملک کے دوروں پر رہتے تھے۔

وقت گزرتا رہا شفاعت خان اور دردانہ اپنی محنت مزدوری اور اللہ کے کرم سے کسی طرح دن گزار رہے تھے۔ شاہانہ دو سال کی ہو چکی تھی اور محبت خان چار کا۔ شرافت خان اب زیادہ تر کھاٹ پر ہی پڑا رہتا تھا۔ کبھی کی رسی کبھی بٹ دیتا یا بانس کے چھلکے نکال دیتا لیکن اس کی کھانسی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی چھاتی کی ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی۔ کئی بار وہ کھانستا تو بلغم کے ساتھ خون ہی نہیں لگتا گوشت کے لوتھڑے باہر نکل رہے تھے۔ ادھر ڈاکٹر خرم باجوہ کا تبادلہ صوبائی افسروں نے کسی اور ضلع میں کر دیا تھا۔ اب شفاعت خاں کو ہسپتال سے ٹی بی کی مفت گولیاں دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جب بھی وہ جاتا اسے اگلے ہفتے آنے کے لئے کہہ دیا جاتا۔ اس کا باپ شرافت خان کمزور ہو گیا تھا کہ کھانس کر تھوکنے کے بعد کھاٹ پر لیٹا زمین کو دیکھتا رہتا۔ چیونٹیاں اور مکھیاں تک اس کی کھانسی کی آواز پہچاننے لگی تھیں۔ جیسے ہی وہ نیچے کھاٹ کی بغل میں کھانس کر تھوکتا پتہ نہیں کہاں سے چیونٹے اس کی بلغم کی طرف جھنڈ بنا کر چل پڑتے۔

ایک دن تو شرافت خان دہل گیا، جب اس نے دیکھا کہ اس کے کھانستے ہی گدھ مکھیاں بھنبھناتی ہوئی اس کے اردگرد منڈلانے لگیں۔ شرافت خاں کو اپنا آخری وقت قریب آتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ساجدہ بیگم کو آواز دینا چاہی لیکن اس کی آواز نہ نکلی، اس سے پہلے ہی کھانسی کے شدید دورے نے اس کے گلے کو پھر سے اپنی گرفت میں لے لیا اور آخر میں وہاں سے چلو بھر خون اور گوشت کے لوتھڑے باہر گرے۔

شفاعت خان اور دردانہ راوی کی سبزیاں سنبھالنے جا چکے تھے، گھر میں صرف اندھی ساجدہ بیگم تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی، گرتی پڑتی آئی اور اپنے شوہر شرافت خان کو چھو چھو کر رونے لگی۔ گزشتہ سال بھر سے اس کے گھٹنوں کو گٹھیا نے جکڑ لیا تھا۔ شرافت خان نڈھال تھا، کچھ دیر بعد اس کی کھانسی رکی اور اس نے ساجدہ بیگم کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”ارے او اندھی کیوں رو رہی ہو؟ میں ابھی نہیں مروں گا۔ محبت خان اور شاہانہ کی شادی کرانے کے بعد مروں گا۔ مت رو“۔ شرافت خان نے بیوی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ”لا بانس اور کلہاڑی دے میں بانس چھیل دوں“۔

اس روز آنگن میں عدالت خان اور دردانہ بانس کی چٹائی بننے میں لگے تھے۔ بازار کے چوہدری یاسر علی کی دکان پاک ہینڈی کرافٹس سے اتنا بڑا آرڈر ملا تھا

کہ دو تین مہینوں تک شفاعت خان اور دردانہ کو دم مارنے کی فرصت نہیں تھی۔ شرافت خان اور ساجدہ بیگم بچوں کو سنبھالتے رہتے۔ روزانہ پچاس چٹائیاں بناتے تھے۔ شرافت خان بیچ بیچ میں اپنی کھاٹ سے اتر آتا اور جب تک کھانسی اسے نڈھال نہ کر دیتی بانس کی پکسیاں چھیلنے میں لگا رہتا۔ پرانا ہنر اور تجربہ تھا۔ دردانہ چٹائی اس طرح بن رہی تھی جیسے اس کی انگلیوں کو کوئی مشین چلا رہی ہو۔ ساڑھے چار سال کا محبت خان ہاتھ میں بانس کی لاٹھی لے کر ڈھائی سال کی شاہانہ کو بکری کی طرح ہر...... ہر...... کرتا ہوا ہانک رہا تھا اور ننھی سی شاہانہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی بکری کی طرح ممیاتی ہوئی آنگن کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گرتی پڑتی رینگ رہی تھی۔ تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ شفاعت خان کا ساڑھو (ہم زلف) عظیم الدین اپنی سائیکل دیوار سے لگا کر اندر آیا۔ وہ بازار کے ریاض فرنیچر ہاؤس میں آرا مشین چلاتا تھا اور مالک کے کہنے پر یہاں وہاں بل وصول کرنے جاتا رہتا تھا۔ عظیم الدین کے آنے پر دردانہ بہت خوش ہوئی۔ بہت دنوں بعد اس کے میکے کے پاس کے گاؤں سے کوئی مہمان اس کے سسرال آیا تھا۔ چائے پانی کے بعد عظیم الدین نے شفاعت خان کو بتایا کہ ابھی تین روز پہلے وہ کسی کام سے پاک کمپیوٹر بلڈنگ آفس گیا تھا۔ وہاں جا کر اسے پتہ چلا کہ دھیدو والی کا سمیع اللہ وہاں شفاعت خان کے نام سے پچھلے چار سال سے سپروائزر کی نوکری کر رہا ہے اور ہر مہینے دس ہزار سے اوپر تنخواہ لے رہا ہے۔

عظیم الدین نے کہا کہ اسے پتہ چلا ہے کہ سمیع اللہ کے باپ ارباب مغل نے بھرتی دفتر کے منیجر کو پٹا کر شفاعت خاں والی نوکری کا لیٹر اپنے آوارہ بیٹے سمیع اللہ کو دے دیا۔ شفاعت خان کے انٹرویو کے دن جمع کئے گئے سرٹیفکیٹوں اور مارک شیٹوں میں شفاعت خان کی فوٹو تو تھی نہیں اس کا فائدہ اٹھا کر سمیع اللہ نے خود کو شفاعت خان کے روپ میں پیش کر دیا اور ہر جگہ شفاعت خان کی جگہ اپنا فوٹو لگا کر عدالتی حلف نامہ سے لے کر گزیٹڈ افسر تک سے اس کی تصدیق کروالی۔ اس طرح سمیع اللہ پاک کمپیوٹر بلڈنگ میں شفاعت خان ولد شرافت خان ذات جولاہا بن کر اطمینان سے سپروائزر کی ملازمت کرنے لگا اور دس ہزار ماہانہ تنخواہ لینے لگا تھا۔

عظیم الدین نے بتایا کہ اس نے سمیع اللہ کو پاک کمپیوٹر بلڈنگ کے پاس ایک ہوٹل میں چائے پیتے دیکھا تھا۔ اس کے گلے میں جو پلاسٹک کا آئی کارڈ جھول رہا تھا اس میں نام تو شفاعت خان لکھا ہوا تھا لیکن فوٹو سمیع اللہ کا تھا۔ اتنا ہی نہیں اس کے ساتھ اس وقت جتنے بھی لوگ تھے سب اسے شفاعت خان ہی کہہ رہے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سمیع اللہ نے اپنے گاؤں دھیدو والی کی رہائش چار سال سے چھوڑ دی ہے اور اب پاک کمپیوٹر بلڈنگ کی ورکرز کالونی میں بال بچوں کے ساتھ رہنے لگ گیا ہے۔

یہاں اس کی بیوی بیاج پر روپے اٹھانے کا دھندا کرتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ورکرز کالونی کے سب ہی لوگ سمیع اللہ کو شفاعت خان اور اس کی بیوی کوبتا کو دردانہ میڈم کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ سمیع اللہ شفاعت خان کی طرح بی اے تو نہیں دسویں فیل ہے اس لئے پاک کمپیوٹر بلڈنگ میں کام کرنے کی بجائے افسروں کے ساتھ چاپلوسی، نشہ آور ادویات کا استعمال اور یونین بازی میں لگا رہتا تھا۔

اپنے ساڑھو عظیم الدین کی بات سن کر شفاعت خان کا سر گھوم گیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے، کوئی بھی آدمی آخر کوئی دوسرا آدمی کیسے بن سکتا ہے؟

(یہ کہانی جاری ہے)

www.aiourdubooks.net

ایک تاثر

اللہ وکیل

جب اللہ آپ کے ساتھ ہے تو پھر یہ نہ سوچ کام کتنا بڑا ہے اور مخالف کون ہے۔

☆ حبیب اشرف صبوحی

انسان کی طویل زندگی میں بے شمار کردار آتے ہیں، کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں کہ انسان انہیں بھلا دیتا ہے اور کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جن کو انسان مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا۔ وہ اپنی بے شمار نیکیوں اور غریب پروری کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا کردار آیا جس کو میں کبھی بھی نہیں بھلا سکتا۔ وہ کردار ہے محمد شفیع صاحب کا۔ محمد شفیع صاحب ایک ریٹائرڈ سرکاری اعلیٰ آفیسر ہیں۔ وہ میرے گھر کے نزدیک ہی رہتے ہیں اور ان سے ملاقات میرے ایک قریبی عزیز کی معرفت ہوئی۔ میرے یہ عزیز ایک سرکاری محکمے میں کام کرتے تھے اور شفیع صاحب کے ماتحت کام کرتے تھے۔ میرے عزیز ایک دفعہ کراچی سے تشریف لائے اور شفیع صاحب سے ملنے کی خواہش کی اور بتایا کہ یہ ہمارے کئی سال آفیسر رہے اور بہت غریب پرور شخص ہیں۔ میں ان سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں انہیں ملوانے شفیع صاحب کے پاس لے گیا۔

وہ تو مل کر واپس کراچی چلے گئے لیکن میرے ان سے تعلقات قائم ہو گئے۔ وہ میری بڑی عزت کرتے تھے اور ہر مسئلے میں میری رائے لیتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا کہ آپ عمر میں تجربہ میں اور علم میں مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں لیکن وہ کہتے تھے کہ ایک رائے سے دو آراء کا ہونا بہتر ہے۔ وہ مجھے اتنی عزت دیتے تھے کہ جب ان کی لڑکی جو ایک معروف ڈاکٹر ہیں، کا نکاح ہونے لگا تو شادی کے گواہوں میں میرا نام لکھوا دیا۔ میں نے ان سے بہت کہا کہ آپ کے بہت سے رشتہ دار موجود ہیں انہیں یہ عزت کا موقع دیں لیکن وہ کہتے تھے کہ میرے رشتہ دار آپ ہیں، فیصل آباد کام کے سلسلے میں جاتے تو مجھے ساتھ لے کر جاتے الغرض میرا بہت زیادہ احترام اور محبت کرتے۔

میری شادی کراچی میں ہوئی ہے اور سسرال کراچی میں ہے۔ جب میں اپنے سسرال جاتا تو ان کے پڑوسی سلیم صاحب مجھ سے ملنے ضرور آتے یا مجھے

اپنے گھر بلوا لیتے۔ بہت محبت اور خلوص کے آدمی تھے اور کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتے تھے۔ ایک دفعہ کراچی گیا تو سلیم صاحب مجھ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے وہ ''شب برأت'' کی مبارک رات تھی۔ اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ سلیم صاحب کہنے لگے کہ اس رات اللہ تعالیٰ کے بندوں کی تقدیر کا فیصلہ ہوگا۔ کسی کے رزق میں اضافہ ہوگا اور کسی کے رزق میں کمی اور کسی کی زندگی کا پتہ جھڑ جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ اس دفعہ میرا پتہ بھی جھڑ جائے گا اور میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا۔

میں نے کہا کہ اس کا علم تو کسی کو بھی نہیں۔ انسان کو زبان سے اچھی بات نکالنی چاہیے۔ بعض دفعہ قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔ آپ پر ابھی بہت ذمے داریاں ہیں۔ بچے آپ کے بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی تعلیم، تربیت اور دیگر مسائل آپ کے سامنے ہونے چاہئیں۔ یہ آپ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ صحت مند ہیں اور کوئی بیماری بھی نہیں ہے لیکن وہ بڑی مایوسی کی باتیں کرتے رہے اور میں ان کی حوصلہ افزائی اور بچوں کے بہتر مستقبل کی باتیں کرتا رہا۔

کچھ دن کراچی قیام کے بعد میں لاہور چلا آیا۔ چند ماہ بعد مجھے اپنے سسرال سے خبر ملی کہ سلیم صاحب جن سے کچھ عرصہ قبل میں مل کر آیا تھا، دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے ہیں۔ بہت افسوس ہوا۔ بالکل یقین نہیں آتا تھا۔ چند ماہ قبل جو باتیں انہوں نے اپنے بارے میں کہی تھیں وہ سچ ہو گئی تھیں۔ فوری طور پر ایک خط ان کی بیگم کو تعزیت کا لکھا اور اپنی ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا۔ ان کی بیگم بہت حوصلہ مند اور ہمت والی تھیں۔ میری اپنے سسرال بات ہوتی رہتی تھی اور میں اکثر سلیم مرحوم کی فیملی کے متعلق پوچھتا رہتا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ ان کی بیگم بڑے حوصلہ اور ہمت سے بچوں کی تعلیم و تربیت کر رہی ہیں۔ بہت خوددار خاتون ہیں۔ محلے کے کچھ صاحب ثروت لوگوں نے ان کا وظیفہ باندھنے کا فیصلہ کیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ والدین کی طرف سے کچھ زرعی زمینوں سے آمدن ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزر اوقات کرتی تھیں۔

ایک دفعہ میں دفتر کے کام سے کراچی گیا تو حسب روایت ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔ خیر خیریت معلوم کی، وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ مکان کرائے کا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے مکان کا کرایہ دے رہے ہیں۔ مالک مکان بہت نیک اور شریف آدمی ہے، ہمیں جو مرمت یا رنگ روغن کرانا ہوتا ہے تو ہم کرا لیتے ہیں اور اس کے کرایہ میں سے کاٹ لیتے ہیں۔ اس نے نہ کبھی کوئی شکایت کی اور نہ کبھی کرایہ بڑھانے کی بات کی۔ اس کے ایک دوست وکیل آتے ہیں اور ہر ماہ کرایہ لے جاتے ہیں اور کبھی بھی کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ مالک مکان لاہور میں رہتے ہیں۔ نہ ہمیں ان کے نام کا پتہ ہے اور نہ رہائش کا۔ آج سے دس سال پہلے جب ہم نے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا تب وہ آئے تھے۔ میرے خاوند سلیم سے ملے تھے۔ کرائے کی ساری کارروائی زبانی طے کی تھی اور اپنے ایک دوست وکیل کو مختار نامہ دے گئے تھے اور ہمیں یہ کہہ گئے تھے کہ ہر ماہ یہ میرے دوست آپ سے آ کر کرایہ لے جایا کریں گے اور مجھے بھیج دیا کریں گے۔ آپ ان سے رابطہ رکھیں، ہم باقاعدگی سے ہر ماہ کرایہ ان کے دوست کو دے دیتے ہیں لیکن اس ماہ ہمیں ایک نوٹس ملا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ میں نے اس مکان کا بیعانہ مالک مکان کو دے دیا ہے۔ 3 ماہ بعد اسے خالی کر دیں، ورنہ قانونی کارروائی کی جائے گی۔ ہم سخت پریشان ہیں۔ جنہوں نے یہ مکان خریدا ہے وہ کوئی خان صاحب

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہیں۔ مالک مکان کے جو دوست کرایہ لینے آتے تھے ان سے بھی رابطہ کیا کہ مالک مکان کا لاہور کا پتہ اور نام وغیرہ بتا دیں تاکہ ان سے بھی درخواست کی جائے کہ ابھی ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ مکان خالی کر سکیں لیکن انہوں نے لاہور کا پتہ بتانے سے انکار کر دیا ہے۔

میں نے ان کو حوصلہ دیا اور بتایا کہ مکان اتنی جلدی خالی نہیں کرایا جا سکتا۔ آپ فوری طور پر سٹے آرڈر (Stay Order) عدالت سے لے سکتی ہیں۔ میرے ایک دو عزیز وکیل ہیں ان سے میں آپ کا رابطہ کرا دوں گا۔ میری سسرال والوں نے بھی ان کی ہر قسم کی امداد کا یقین دلوا دیا۔

اس کے ساتھ میں نے ان سے کہا کہ آپ اللہ کو بھی یاد کریں اور ”حسبنا اللہ نعم الوکیل نعم المولٰی و نعم النصیر“ کا ورد کرتی رہا کریں جس کا مطلب ہے کہ ”اللہ میں اپنے ہر کام میں تجھ اپنا وکیل بناتی ہوں اور تُو ہی مددگار ہے“۔ انہوں نے میری باتوں پر توجہ دی اور کہا کہ وہ آج سے یہ وظیفہ شروع کر دیں گی۔

لاہور آنے کے چند روز بعد میرے کرم فرما جن کا کہانی کے شروع میں ذکر کیا ہے۔ شفیع صاحب ایک روز مسجد میں مل گئے۔ نماز کے بعد مسجد میں بات چیت ہوتی رہی۔ باتوں کے درمیان شفیع صاحب کہنے لگے کہ شاید اگلے ماہ مجھے کراچی جانا پڑے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ میرا وہاں مکان ہے۔ اسے فروخت کرنا ہے۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ جب میں نے ان سے مکان کا محل وقوع پوچھا تو انہوں نے اسی مکان کا ذکر کیا جس میں سلیم صاحب کی بیوہ رہتی تھی۔ میں نے بے قراری کی حالت میں پوچھا آپ نے اس مکان کا بیعانہ لے لیا ہے؟ انہوں نے مثبت جواب دیا اور پوچھا کہ تم اتنے کیوں پریشان ہو گئے ہو؟

میں نے انہیں اپنے سسرال کے گھر کا نمبر بتایا وہ میرے سسرال والوں کو جانتے تھے۔ پھر میں نے بتایا کہ جو بیوہ آپ کے گھر میں رہتی ہیں اس کو میں نے بہن بنایا ہوا ہے اور وہ سخت پریشان ہے۔ اس کے بچے ابھی چھوٹے ہیں اور اس کا کوئی ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے۔ آپ مہربانی فرما کر اس خان صاحب سے بیعانہ واپس لیں۔ شفیع صاحب کہنے لگے کہ تم نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ بیعانہ میں یہ شرط لکھی گئی ہے کہ اگر میں بیعانہ سے مکر جاؤں یا واپس لینا چاہوں تو دوگنا بیعانہ دینا پڑے گا۔ میں نے کہا چاہے کچھ بھی ہو، اس بیعانہ کو منسوخ کروانا ہے۔ اس سلسلے میں جو میں مدد کر سکتا ہوں میں ان شاء اللہ اس میں حصہ ڈالوں گا۔ شفیع صاحب کہنے لگے کہ جس آدمی کے ہاتھوں مکان کا بیعانہ ہوا ہے وہ میرے دفتر کا آدمی ہے اس سے منت سماجت کروں گا۔ آگے اللہ کی مرضی۔ آؤ ہم اللہ کے گھر میں بیٹھے ہیں، سچے دل سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کرے اور بیوہ کی مدد ہو۔ ہم نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی۔

چند دنوں کے بعد وہ کراچی گئے اور بیعانہ منسوخ کروا کر آئے اور بیوہ سے جا کر ملے اور ان کو یقین دلوایا کہ آپ کے بچے جب تک کسی قابل نہیں ہو جاتے آپ اسی گھر میں رہیں۔ آج اللہ کے فضل سے سلیم صاحب کے دونوں لڑکے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہو گئے ہیں اور بیٹی نے داؤد انجینئرنگ کالج سے انجینئرنگ کر لی ہے اور سب بچوں کی شادیاں ہو گئی ہیں۔ شفیع صاحب کی وہ پراپرٹی کئی کروڑ کی ہو گئی ہے۔ جس کو انہوں نے فروخت کر دیا ہے۔ شفیع صاحب آج کل علیل ہیں۔ اللہ کرے ان کی یہ نیکیاں ان کی صحت کی بحالی کا پیغام بنیں۔ آمین!

علم و تحقیق

جادو، جنات اور عامل

روایات ○ مفروضے ○ حقائق

یہ تحقیقی مضمون ان شاء اللہ جوگیوں، سادھوؤں، پروفیسروں، بنگالی بابوں، جھوٹے پیروں، شاہ صاحبوں اور تعویذ گنڈا کرنے والے نام نہاد صوفیوں سے آپ کو نجات دلا دے گا۔

☆ محمد افضل رحمانی 0314-4652230

(تیسرا حصہ)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جادو کے بارے میں پچھلے میں نے کچھ تفصیل عرض کر دی ہے۔ یہ ایک سفلی علم ہے اور اس کا سیکھنا، سکھانا کفر ہے کیونکہ اس میں غیر اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے جو کہ صریحاً شرک ہے لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔

چونکہ یہ سفلی اعمال جن اور شیاطین انجام دیتے ہیں اور ان کا وجود محقق ہے (تفصیل آگے آئے گی) اس لئے جادو یا جادوئی اثرات و واقعات کا انکار کسی ذی شعور سے ممکن نہیں ہے۔ امم سابقہ اور عہدِ نبوی میں متعدد ایسے خارقِ عادت واقعات رُونما ہوئے ہیں، بعد کے ادوار میں بھی ہوتے رہے اور آج بھی ہو رہے ہیں، یہ واقعات اس قدر تواتر کے ساتھ پیش آئے کہ ان کا انکار تو کجا ان کو شک و شبے کی نگاہ سے دیکھنے کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''پس جو شخص جنوں، شیطانوں اور جادو کا انکار کرے اور جنوں کے انسانوں کے بدنوں میں داخل ہونے اور قسموں یا منتروں کے ذریعہ انہیں بلانے اور حاضر کرنے کا انکار کرے تو اس نے ایسی بات کو جھٹلایا جس کا اسے علم نہیں ہے۔ (مجموع الفتاوٰی صفحہ 24، 280)

پُراسرار عورت

میری کہانی ''پُراسرار عورت'' جو ماہنامہ ''حکایت'' میں شائع ہوئی تھی کو اکثر قارئین نے دلچسپی سے پڑھا اور پسند بھی کیا لیکن بعض قارئین نے فون کالز کے ذریعے اور بعض نے بالمشافہ ملاقات کر کے کہانی کے بعض مندرجات پر کھل کر اعتراض بھی کیے چونکہ کہانی میں بعض واقعات ایسے تھے جن کو بعض جدید اور سائنس زدہ ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ظاہر ہے آپ ایسے ذہن کو دھونس، دھاندلی سے تو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ ضرور ہی ان واقعات کو تسلیم کرے ہاں آپ ایک نقطۂ نگاہ ضرور بیان کر سکتے ہیں۔ آگے کسی کا ذہن قبول کرے یا نہ کرے، اس کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔ البتہ اختلاف برائے اختلاف تو کسی صورت بھی مستحسن نہیں ہے اگر کوئی بات دلائل کے ساتھ کی جائے تو میری ناقص رائے میں اس پر غور کرنا قطعاً معیوب نہیں ہے اور یہ زحمت کر لینے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً جو بات قرآن و حدیث سے ثابت ہو جائے اس پر کم از کم مسلمان کو ضرور سرِ تسلیم خم کر دینا چاہئے۔

اختلاف کے بعد اقرار

ان دنوں جبکہ کہانی شائع ہوئی تھی محترمہ امتیاز اشرف صاحبہ نے مجھ سے سخت اختلاف کیا۔ شروع شروع میں تو فون پر ہی بات چیت ہوتی رہی ان کا مؤقف تھا کہ جنات نام کی کوئی مخلوق سرے سے موجود ہی نہیں۔ اصل میں انہوں نے کسی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب ''ہمارے پیغمبر'' کا مطالعہ کیا تھا جس میں مصنف نے اپنے زعم میں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جنات وغیرہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں اور وہ اس سے کافی متاثر ہو گئی تھیں اور کتاب کے مندرجات کو بالکل صحیح سمجھ لیا تھا۔ میں نے انہیں عرض کی کہ آپ وہ کتاب مجھے بذریعہ ڈاک ارسال کر دیں تاکہ میں اس کا مطالعہ کر کے آپ کے شبہات کا جواب دے سکوں۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد کتاب مجھے موصول ہو گئی۔ محترمہ انگلش میں ماسٹر کی ڈگری کی حامل تھیں اور ایک کالج میں لیکچرار تھیں۔ بعد میں ہماری بالمشافہ ملاقات بھی ہوئی جس کے نتیجے میں موصوفہ نے اپنے مؤقف سے رجوع کیا اور میری بہت ممنون ہوئیں۔

ہمارے پیغمبر نامی کتاب سے مختصر اقتباس

قرآن حکیم میں جنات اور شیاطین سے سرکش

قوتیں مراد لی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے باب میں جہاں جہاں ان قوتوں کا ذکر آیا ہے وہاں رُوئے سخن وحشی قبائل اور پہاڑی لوگوں کی طرف ہے یہ وہ لوگ تھے جو غیر متمدن زندگی بسر کرتے تھے اور بلا کے جفاکش تھے۔ ہیکل کے متعلق جو بیان کیا گیا ہے کہ اسے سلیمان علیہ السلام نے جنات و شیاطین سے تعمیر کرایا درحقیقت اس سے انہی جفاکش اور بلانوش تنومند اور غیر متمدن قبائل کی طرف اشارہ ہے جو متمدن زندگی بسر کرنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتے تھے۔ (ہمارے پیغمبر صفحہ 116)

گویا مصنف نے جنات و شیاطین کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دیا اور جنات و شیاطین سے وحشی قبائل اور پہاڑی لوگ مراد لے لئے۔ چنانچہ مصنف اسی ذہنیت کے ساتھ ترجمے میں بھی ہیرا پھیری کرتا ہے۔ مثلاً سورہ صٓ کی آیت نمبر 37 کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

اور دیکھو ہم نے سرکش اور وحشی قبائل کو ان کا تابع کر دیا تھا، کیا معمار اور کیا غوطہ خور اور ان کے علاوہ اور سرکش بھی تھے جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔

یعنی جس جگہ بھی لفظ جن یا شیاطین آتا ہے ان کا ترجمہ وحشی قبائل اور سرکش ہی کرتے ہیں۔ صحیح ترجمہ یہ ہے۔

اور تابع کر دیئے سارے شیاطین عمارت کرنے والے اور غوطے لگانے والے بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی)

حالانکہ قرآن مجید میں تھوڑا سا تدبر کر لینے سے صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے کہ جنات سے مراد وحشی قبائل نہیں بلکہ حقیقتاً جن ہی مراد ہیں جو انسانوں سے ایک علیحدہ مخلوق ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت مبارکہ 82 دیکھیں:

ترجمہ: اور تابع کئے کتنے شیطان جو غوطہ لگاتے سلیمان علیہ السلام کے واسطے اور بہت سے کام بناتے اور ہم نے انہیں تھام رکھا تھا۔

اس آیت پر شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کا حاشیہ دیکھئے:

شیطانوں سے غوطہ لگواتے جواہر دریا سے نکلواتے جہاں آدمی کا مقدور نہیں اور عمارت میں بھاری کام ان سے کرواتے اور سفر میں حوض برابر لگن تانبے کی اور کنویں برابر دیگیں اٹھائے چلتے اور ان میں کھانا پکاتے اور سخت کام ان سے لیتے۔

صاحب عقل و بصیرت آیت مبارکہ کے اس ٹکڑے پر غور فرمائیں۔

''اور ہم نے انہیں تھام رکھا تھا''۔ یعنی سرکش اور طغیان سے جنوں کو بچانا اور ان پر کنٹرول رکھنا ہمارا کام تھا تاکہ وہ شر و فساد نہ کریں۔ بقول مصنف اگر اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے وحشی قبائل اور پہاڑی لوگ ہوتے تو کیا سلیمان علیہ السلام ان پر کنٹرول نہ کر سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی اپنی طرف نسبت کرنے سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ وہ کوئی اور مخلوق تھی جس کی سرکشی اور طغیان کو روکنا سلیمان علیہ السلام کے بس میں نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے انہیں مسخر کر دیا تھا۔

قرآن مجید میں واضح طور پر فرمان باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: اور جنوں میں کتنے تھے جو محنت کرتے اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے اور جو کوئی پھرے ان میں سے ہمارے حکم سے کھائیں ہم اس کو آگ کا عذاب۔ بناتے اس کے واسطے جو کچھ چاہتا۔ قلعے اور تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں چولہوں پر جمی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

(سورہ سبا آیت 12)

ہوئی۔

بہر حال مسلمانوں میں سے سلف خلف کا عقیدہ یہی کہ جنات بطور ایک مخلوق کے موجود ہیں اور سید سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنوں کو مسخر کر دیا تھا۔ چونکہ تمام مسلمانوں کا یہ اجتماعی عقیدہ ہے بلکہ دور جاہلیت میں مشرکین مکہ بھی جنات کے وجود کے قائل تھے لہٰذا اس اجتماعی عقیدہ پر دلائل لکھنے کی ضرورت تو جنہیں، قرآن و حدیث میں بے شمار آیات و آثار میں جنات کا ذکر موجود ہے اور اس پر آئمہ تفسیر، آئمہ کرام، علماء سلف و خلف کی علمی بحثیں موجود ہیں لیکن وہ اس قدر علمی پیچیدہ ہیں کہ عام لوگ شاید انہیں سمجھ نہ پائیں۔ اس موضوع پر مولانا مودودی مرحوم کی ایک تحریر میری نظر سے گزری ہے جو قدرے آسان اور عام فہم ہے۔ افادہ عام کے لئے مولانا کی تحریر پیش خدمت ہے۔ میرا خیال ہے کہ جو بھی غور و خوض سے اس تحریر کو پڑھے گا ان شاء اللہ کئی وساوس سے اسے نجات مل جائے گی اور حق بات روز روشن کی طرح اس پر واضح ہو جائے گی اور اگر کوئی غلط نظریے سے متاثر ہو چکا ہے تو اس کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی کیونکہ اس میں مولانا مرحوم نے منکرین جنات کے دلائل و اعتراضات کا بھرپور علمی محاکمہ کیا ہے اس مضمون کے شروع میں مولانا لکھتے ہیں:

”یہ مضمون ایک کتاب پر تنقید کے سلسلے میں لکھا گیا تھا جو چند سال قبل شائع ہوئی تھی۔ ابتداً ہم نے مصنف کے ان خیالات پر مختصر تنقید کی تھی جو انہوں نے اپنی کتاب میں جنوں کے متعلق ظاہر کئے تھے۔ پھر ایک اہل قلم نے اس تنقید پر تعاقب کیا تھا اس کے جواب میں یہ مضمون لکھا گیا چونکہ اس سے مقصود محض فائدہ علمی ہے کسی پرانی بحث کو تازہ کرنا نہیں ہے۔ اس لئے دونوں صاحبوں کے نام حذف کر دیئے ہیں“۔

منکرین جنات اور ان کے اعتراضات

جن کی حقیقت کے متعلق شبہات کی ابتدا دور جدید میں غالباً انیسویں صدی کے وسط آخر میں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں محض کسی مذہبی کتاب کی سند پر کسی ایسی شے کو موجود ماننا، جس کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ ہو، بڑے شرم کی بات ہو گئی تھی اور ایسی شرم ناک بات کا ارتکاب صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو اس زمانے کے اہل علم کی نگاہوں میں تاریک خیال اور توہم پرست کٹھ ملا بننے کے لئے تیار ہوتا۔ ان حالات میں ان مسلمانوں نے جو اپنی دنیوی ترقی کے لئے اپنے غیر مسلم آقاؤں اور پیشواؤں کی نگاہ میں روشن خیال اور عقل پرست بننا ضروری سمجھتے تھے، ایک نئی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا اور ہر اس مسئلے کو جسے ماننے کے لئے انیسویں صدی کے مادہ پرست بندگان حواس و پرستاران عادت، آزمادہ نہ ہو سکتے تھے، ایسے عجیب طریقوں سے تاویل کی خراد پر چڑھایا کہ وہ مسئلہ قرآن سے خارج بھی نہ ہوا اور ان لوگوں کے افکار و تخیلات کے مطابق ڈھل بھی گیا جو قرآن کی روح اور اس کے اصول اوّلیہ سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔

اس سلسلہ میں جن قرآنی ارشادات کو توڑا مروڑا گیا انہی میں سے ایک وہ ارشادات ہیں جو ابلیس، شیاطین اور جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان الفاظ سے کوئی ایسی مخلوق مراد نہیں ہے جو انسان سے الگ فوق الطبیعی وجود رکھتی ہو۔ بلکہ ان سے کہیں تو انسان کی اپنی بہیمی قوتیں مراد ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے اور کہیں ان سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں اور کہیں ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ ان کا ارتکاب صرف وہی شخص کرسکتا ہے جو یا تو عربی زبان اور قرآن مجید کا تھوڑا سا علم بھی نہ رکھتا ہو، یا پھر وہ جس کے دل میں خدا اور یوم آخرت کے خوف سے زیادہ اہل دنیا کا خوف ہو لیکن 1857ء کے ہنگامے کے بعد جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان گزرے ہیں ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس لئے یہ اور ان سے بھی زیادہ رکیک تاویلات قرآن مجید میں کی گئیں اور طرفہ ماجرا یہ کہ ادعائے علم و حمایت اسلام کے ساتھ کی گئیں۔ جس طرح انسان پر بہت سے دور گزر چکے ہیں اسی طرح یہ دور بھی گزر گیا۔ اب خود یورپ میں بھی ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو روحانیت کا قائل ہے اور اس محسوس و مرئی دنیا کے علاوہ ایک ایسے عالم کے وجود کو بھی مانتا ہے جو ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔ اس لئے اب جن و شیاطین کے مستقل وجود کو تسلیم کرنا اتنا خطرناک نہیں رہا جتنا اب سے پہلے کچھ مدت تھا۔ تاہم ابھی اس دور کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں اور ابھی تک محض قرآن مجید کی سند پر کسی ایسی بات کو ماننے سے دماغ انکار کر رہے ہیں جو فوق الطبیعی ہونے کے ساتھ خارق عادت بھی ہو۔ یہ اسی دور کے بچے کچھے اثرات تھے جو اس دور میں ہم کو نظر آئے۔

مولانا...... قرآن کے صریح ارشادات کو دیکھ کر یہ تو ماننے پر مجبور ہو گئے کہ ”جن“ سے مراد وہ ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان سے علیحدہ وجود رکھتی ہے لیکن قرآن میں جگہ جگہ جنوں کی طرف جو امور منسوب کئے گئے ہیں وہ چونکہ خارق عادت ہیں اور ان کو بعینہ اس طرح ماننا جس طرح قرآن میں وہ بیان ہوئے ہیں، اقتضائے عقلیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اس لئے انہوں نے کسی نہ کسی طرح تاویل کر کے جنوں کی دو قسمیں قرار دے لیں۔ ایک وہ مخصوص نوع کی مخلوق جو ناری الوجود ہے اور انسان سے اصلاً مختلف ہے۔ دوسرے انسانوں کا کوئی خاص طبقہ جس کے متعلق نہ وہ خود جانتے ہیں نہ کسی حوالہ سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا طبقہ ہے اور کس بناء پر 'جن' کے نام پر موسوم ہو گیا؟

ہمارے دوست...... الحمدللہ ان اثرات سے محفوظ ہیں مگر پھر بھی ایک مقام پر ان کو 'جن' کے انسان ہونے کا شبہ ہو ہی گیا۔ وہ مولانا...... کے اس خیال سے تو متفق نہیں ہیں کہ ”قرآن مجید میں جہاں جہاں جن و انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد وہ آتشیں جن نہیں بلکہ انسان ہی کا ایک طبقہ ہے“۔ لیکن خاص کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے جنوں پر بھی ان کو شبہ ہے کہ وہ انسان ہی تھے، آتشیں نہ تھے، کیونکہ وہ نظر نہ آتے تھے اور انسانوں کی طرح غوطے لگاتے اور برتن بناتے تھے۔

دو قاعدے

اس مسئلے کی تحقیق میں آگے قدم بڑھانے سے پہلے دو قاعدے ذہن نشین کر لیجئے:

اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ جب اپنی معلومات میں سے کسی ایسی شے کو جو ہمارے دائرہ علم اور ادراک سے خارج ہے، ہمارے علم میں لانا چاہتے ہیں تو لامحالہ وہ اس شے کو ہماری زبان کے کسی ایسے ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کو ہم نے اس چیز کے ساتھ کسی قریب تر مشابہت رکھنے والی چیز کے لئے وضع کیا تھا تا کہ ہم اس شے کا کسی حد تک صحیح تصور کر سکیں جو اللہ کے علم میں ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کسی چیز کو یونہی کسی مناسبت اور ربط معنوی کے بغیر کسی خاص لفظ سے موسوم کر دے، درآں حالیکہ اس چیز کے لئے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر اس خاص لفظ کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جس

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جنوں کی انہی فوق الانسانی صفات اور قدرتوں کی بناء پر اہل عرب خدا سے ان کا نسب ملاتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

''یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری قرار دے دی''۔ (الصفت:85)

اور اسی بناء پر وہ عبادت میں ان کو خدا کا شریک بناتے تھے۔ (جیسا کہ قرآن میں ہے)

''بلکہ وہ جنوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں سے اکثر لوگ انہی کے معتقد بنے ہوئے تھے''۔ (سبا:14)

''اور انہوں نے اللہ کے ساتھ جن شریک ٹھہرا لئے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے اور انہوں نے علم کے بغیر خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کر لی ہیں''۔ (انعام:100)

نیز وہ مصیبت اور خوف کے وقت انہی جنوں سے پناہ مانگتے تھے (جیسا کہ قرآن میں ہے)

''انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے''۔ (الجن:6)

واضح رہے کہ اس آیت میں ایک ہی جگہ انس اور جن کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور صاف ظاہر ہے کہ جن ہرگز انسانی جنس سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ ملائکہ کو بھی جن کہتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ کا قول ہے:

''اس نے ملائکہ جن میں سے نو کو تابع کر لیا جو اس کے حضور کھڑے رہتے ہیں اور مفت خدمت کرتے ہیں''۔

فرشتوں کے متعلق جہلائے عرب کا خیال تھا کہ وہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس کی طرف متعدد مقامات پر قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے مثلاً:

''انہوں نے ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں لڑکیاں (یا دیویاں) قرار دیا ہے''۔ (الزخرف:19)

''کیا تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں سے سرفراز کیا اور خود اپنے لئے بیٹیاں رکھیں؟'' (بنی اسرائیل:4)

ان شہادتوں کے مقابلہ میں ایک شہادت بھی عرب کی روایات سے ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جس سے معلوم ہوتا کہ عرب کبھی لفظ جن کا اطلاق حقیقی معنوں میں انسان پر بھی کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس تمام شواہد یہی بتاتے ہیں کہ اہل عرب 'جن' اور 'انس' کو دو مختلف نوع کی مخلوقیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر بدر بن عامر کہتا ہے:

وَلَقَدْ نَطَقْتُ قَوَافِيًا اِنْسِيَّةً

وَلَقَدْ نَطَقْتُ قَوَافِي التَّجْنِيْن

اور عمران بن حطان الحروری کہتا ہے:

قَدْ كُنْتُ عِنْدَكَ حَوْلاً لَا تَرُوْعُنِي

فِيْهِ رَوَائِعُ عَنْ اِنْسٍ وَ لَا جَانِي

اس کے بعد ائمہ لغت کی یہ متفقہ شہادت ملاحظہ ہو۔ جوہری اپنی کتاب الصحاح میں کہتا ہے:

''جن بخلاف انس، اس نام سے اس لئے موسوم ہوئے کہ وہ پوشیدہ ہیں، نظر نہیں آتے''۔

اور ابن سیدہ کہتا ہے:

''جن ایک نوع کی مخلوق ہے جس کا یہ نام اس لئے پڑا کہ وہ نگاہوں سے مخفی ہے، دکھائی نہیں دیتی''۔

چند مقامات

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ لغت عرب میں جن کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں ''چھپے ہوئے'' اور ''پوشیدہ'' کے ہیں۔ اس لفظ کو جب انواع مخلوقات میں سے کسی نوع کے لئے نام کے طور پر استعمال کیا جائے گا تو ضرور ہے

کہ وہ کوئی ایسی نوع ہو جو عادتاً مخفی و مستور ہوتی کہ اس کا ظاہر اور نمایاں ہونا خرق عادت میں سے شمار کیا جائے۔ نہ یہ کہ وہ عادتاً ظاہر اور نمایاں ہو جیسے انسان۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ لفظ سیال، کا اطلاق ہمیشہ ایسی ہی چیز پر کیا جائے گا جو عادتاً بہنے والی ہو اور اگر کبھی وہ جامد پائی جائے تو اس کا جمود خلاف معمول شمار کیا جائے گا، مثلاً پانی لیکن اگر کوئی شخص لفظ سیال کا اطلاق کسی ایسی چیزی پر کرے جو عادتاً جامد ہو (مثلاً پتھر) اور جس کا جامد ہونا نہیں بلکہ سیال ہونا خلاف معمول ہو تو آپ یقیناً حکم لگا دیں گے کہ وہ شخص لفظ سیال کے معنی سے ناواقف ہے اور لفظ کو اس کے غیر معنی موضوع لہ میں استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید میں لفظ جن (مخفی و مستور) کا اطلاق کسی ایسی مخلوق پر کیا جاتا جو عادتاً مخفی و مستور نہیں ہے بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرئی و محسوس ہے (مثلاً انسان) تو نعوذ باللہ یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ اس کتاب کو پیش کرنے والا یا تو مجنون ہے یا لفظ جن کے معنی سے ناواقف ہے۔ یقین مانئے کہ ایسی صورت میں خواہ تمام عجم قرآن پر ایمان لے آتا مگر کوئی عرب تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتا کیونکہ وہ جن کا بطور معجزہ خرق عادت مرئی و محسوس بن جانا تو مان سکتا ہے مگر یہ کبھی بھی نہیں مان سکتا کہ مرئی و محسوس انسان کو جن کے لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ جس وقت کفار عرب نے کہا تھا کہ محمد کو کوئی عجمی شخص قرآن سکھاتا ہے تو اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ کوئی دلیل نہ پیش کر سکے اور جب قرآن نے اس الزام کا جواب یہ دیا کہ

''جس شخص کو یہ سکھانے والا بتاتے ہیں، اس کی زبان تو عجمی ہے حالانکہ قرآن جس زبان میں ہے وہ عربی مبین ہے'' (النحل:103)۔ تو اس جواب کو سن کر تمام عرب کی زبانیں بند ہو گئی تھیں لیکن اگر کہیں اس وقت کفار عرب کو ایک مثال بھی قرآن میں ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ 'جن' کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہو تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ 'جن' کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہو تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان عربی مبین ہے جس میں 'جن' کا اطلاق انسان پر کیا جا رہا ہے۔

دوم یہ کہ عرب میں پہلے سے 'جن' کا نام ایک ایسی فوق الطبعی غیر جسمانی مخلوق کے لئے موضوع اور شائع و متعارف تھا جو عادتاً محسوس نہ ہوتی تھی، جس کو کبھی کبھی وہ ''سعالی'' اور ''غول'' وغیرہ کی شکل میں دیکھتے تھے اور جس کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ فوق الطبعی انداز سے ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پس جب قرآن نے اس شائع شدہ لفظ کو استعمال کیا تو لامحالہ اس کے معنی وہی لئے جائیں گے جن کے لئے وہ پہلے سے وضع کیا ہوا تھا اور شائع تھا۔ قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ عربی میں اتارا گیا ہے تاکہ عرب جو اس کے اوّلین مخاطب ہیں، اس کو سمجھ سکیں۔ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (یوسف:2)

یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ہو سکتا تھا جب کہ قرآن میں وہی الفاظ اور اصطلاحات اور انداز بیان استعمال کئے جاتے جو عرب میں رائج و معروف تھے، یا اگر اہل عرب کی زبان کے کسی لفظ کو معلوم و متعارف معنی کے سوا کسی خاص معنی میں استعمال کیا بھی جاتا تو وہ اصل لغت کے خلاف نہ ہوتا اور اس خاص معنی کی تشریح کر دی جاتی تاکہ عرب اس کو سمجھ سکتے لیکن آپ لفظ 'جن' کے جو معنی بیان کرتے ہیں، نہ کلام عرب میں معلوم و متعارف ہیں اور نہ ان کی کوئی ایسی تشریح ہی قرآن میں ملتی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس نام کا وہ مسمّٰی مراد نہیں ہے جو اہل عرب نزول قرآن کے زمانہ میں عموماً اس سے مراد لیا کرتے

تھے۔ اب اگر آپ کی بات مان لی جائے تو قرآن کا اپنا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ وہ عام فہم عربی میں اترا ہے۔

سوم یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ عربوں کے اس اعتقادِ باطل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جن اور ملائکہ کو خدائی میں شریک ٹھہراتے تھے، خدا سے ان کا نسب جوڑتے تھے، ان سے پناہ مانگتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے، پھر ان اعتقاد کا ابطال اس طرح کیا گیا ہے کہ 'جن' خدا کے شریک نہیں ہیں، نہ اس کی اولاد ہیں، بلکہ وہ بھی اسی طرح خدا کی ایک مخلوق ہے جس طرح انسان اس کی مخلوق ہے، فرق یہ ہے کہ انسان مٹی کے سرشت سے پیدا کیا گیا ہے اور 'جن' آگ کی پھونک سے۔ مگر حکام خداوندی کے مخاطب دونوں ہیں۔ خدا کے سامنے جواب دہ ہونے میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور نافرمانی کی سزا دونوں کے لئے یکساں ہے۔ پس انسان کا ان کی عبادت کرنا محض ایک جاہلانہ فعل ہے بلکہ اس میں انسان کے لئے ذلت بھی ہے۔ اس لئے کہ انسان ایک بالاتر نوع ہے۔ جنوں کے نمائندے 'ابلیس' کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور انکار کرنے پر وہ راندۂ درگاہ کیا گیا۔ انسان کو خلافت اور رسالت کے بلند مناصب پر سرفراز کیا گیا اور جنوں کو اس کی اطاعت اور پیروی کا حکم دیا گیا جیسا کہ سورۂ احقاف کے آخری اور سورۂ جن کے پہلے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ پھر انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ ہستی حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ شرف عطا ہوا کہ جن ان کے تابع کئے گئے۔ یہ تمام باتیں جو قرآن میں عربوں کے اعتقادات باطلہ کی تردید کے لئے کی گئی تھیں، اسی صورت میں بامعنی ہو سکتی تھی جب ۔ ان میں 'جن' سے مراد ہی مخلوق ہوتی جس کو اہل عرب خدائی میں شریک اور عبادت میں خدا کا ساجھی بناتے تھے۔ ورنہ اگر ان میں 'جن' سے مراد انسان ہی ہوتے تو پھر یہ کسی طرح بھی عربوں کے اوہام کا ابطال کرنے والی نہ ہوتیں اور عربوں کے وہ اعتقادات اپنی جگہ رہ جاتے جو وہ اپنے تصور میں جنوں کے متعلق رکھتے تھے۔

چہارم یہ کہ اگر جنوں کے ذکر سے کسی خاص مقام یا بعض مخصوص مقامات پر قرآن کا مقصود دراصل انسانوں یا ان کے کسی خاص گروہ کا ذکر کرنا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کو لفظ 'جن' سے تعبیر کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ کیوں نہ ان کو لفظ انسان ہی سے تعبیر کیا گیا؟ خواہ مخواہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا حاجت پیش آئی تھی جن سے ناری جن اور خاکی جن کے درمیان التباس واقع ہوتا؟ اس طرح کی تاویلات کے بارے میں یہ ایک اہم اصولی سوال ہے جس کو ہمارے زمانے کے اکثر زالی تاویلیں کرنے والے حضرات قرآنی الفاظ کے معنی بیان کرتے وقت نظرانداز کر جاتے ہیں۔ وہ اس پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے کہ جب کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لئے معروف اور شائع الفاظ عربی زبان میں موجود ہیں اور خود قرآن نے بھی اس معنی کو بیان کرنے کے لئے حسب موقع وہی الفاظ استعمال کئے ہیں تو آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر اس معنی کو بیان کرنے کے لئے (اگر واقع میں اس کا مقصود وہاں وہی معنی بیان کرنا ہو) بعض دوسرے الفاظ استعمال کرتا، درآنحالیکہ وہ الفاظ اس معنی کے لئے شائع اور متعارف نہ تھے اور نہ ہیں؟ مثال کے طور پر اگر واقعہ یہی تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو مصر سے یا دوسرے مقامات سے اعلیٰ درجہ کے غواص، ساز، معمار اور سنگ تراش آدمی فراہم کر دیئے گئے تھے تو یہی کہہ دینے میں کون سا امر مانع تھا کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایسے اور

ایسے آدمی فراہم کر دیئے تھے۔ کیا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا کہ مجبوراً اس کو 'جن' اور 'شیاطین' کے الفاظ کے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا خود اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کا ذکر کرنے کے مواقع پر ان کو انسان یا بنی آدم کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا ہے؟ اور اگر خاص آدمیوں میں کوئی خصوصیت ایسی تھی کہ ان کو 'جن' اور 'شیاطین' کے استعاروں میں ادا کرنا ضروری تھا تب بھی اس تصریح میں کیا چیز مانع تھی کہ یہ 'جن' بنی آدم سے تھے؟

(ملاحظہ ہو سورۂ سبا، رکوع 2۔ سورۂ ص رکوع 3)

قرآن میں معنی 'جن' کی تصریح

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن مجید نے لفظ 'جن' کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں 'جن' اور 'انسان' کی حقیقتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں اور بالفاظ صریح ایک جگہ نہیں، متعدد جگہ بتایا گیا ہے کہ 'جن' ایک ناری الاصل مخلوق ہے اور 'انسان' ارضی الاصل ہے۔ لفظ 'جن' کو استعمال کرنے کے ساتھ جب اس کے معنی کی یہ تصریح بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہے تو عقل یہ چاہتی ہے کہ جہاں کہیں وہ الفاظ استعمال ہوں وہاں اس کے وہی معنے لئے جائیں جن کی تصریح کی جا چکی ہے۔ (۲) اس کے خلاف کسی اور معنی کے لئے ضروری ہے کہ یا تو اس دوسرے معنی کی بھی کوئی تصریح قرآن میں موجود ہو، یا پھر آپ کے پاس ایسے قوی دلائل موجود ہوں جن کی بناء پر قرآن کی تصریح کے خلاف معنی میں اس لفظ کو لینا جائز ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم کوئی ایک ہی آیت ایسی پیش فرمایئے جس میں 'جن' بہ معنی 'انسان' کی ویسی ہی تصریح ہو جیسی کہ 'جن' بہ معنی "آتشیں مخلوق" کی تصریح ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کو حق ہے کہ آپ کے دلائل کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ اس حد تک قوی ہیں کہ قرآن نے 'جن' کے جس معنی کی تصریح کی ہے اس کو چھوڑ کر آپ کے تجویز کردہ معنی کو قبول کیا جائے۔

(۲) بلاشبہ قرآن میں دو جگہ 'جان' کا لفظ 'سانپ' کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن اوّل تو خود قرآن میں دوسری جگہ اس چیز کے لئے ثُعْبَانٌ 'جانَ' بمعنی سانپ عربی میں عام طور پر مستعمل ہے اور موقع و محل سے ہر عربی دان خود جان لیتا ہے کہ یہاں 'جان' سے مراد سانپ ہے۔

جن بمعنی انسان کی پہلی دلیل

مولانا...... نے جس بناء پر 'جن' کے انسان ہونے کا گمان کیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

''...... 'جن' کا لفظ قرآن میں صرف مکی سورتوں میں آیا ہے۔ مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا اور انس کا لفظ بلا جان کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے ہی ایک طبقہ کے ہیں''۔

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ کسی سورت کے مکی یا مدنی ہونے اور جن کے ساتھ انس کا لفظ آنے یا نہ آنے کو لفظ 'جن' کے معنی میں آخر کس قسم کا دخل حاصل ہے؟ آپ ان تمام آیتوں کو نکال کر دیکھ لیجئے جن میں 'جن' اور 'انس' کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ کسی جگہ بھی آپ کوئی اشارہ ایسا نہ پائیں گے جو انس کے عام اور جن کے خاص ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں کہیں جن اور انس کے الفاظ معطوف

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

معطوف علیہ کی حیثیت سے آئے ہیں، وہاں عطف نہ تو عطف العام علی الخاص کے طور پر آیا ہے نہ عطف الخاص علی العام کے طور پر اور نہ عطف الشیء علی مراد فیہ کے طور پر۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کے عطف کے حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ سامع کو پہلے سے اس کا علم ہو کہ معطوف ومعطوف علیہ میں سے ایک عام ہے اور دوسرا خاص، یا دونوں مترادف ہیں۔ مثلاً: رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ (نوح:28) میں سامع خود سمجھ سکتا ہے کہ عطف، عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔ یا اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْکَ وَ مِنْ نُوْحٍ (الاحزاب:7) میں صاف معلوم ہو جات اہے کہ عطف، ت عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ یا فَاَلْقٰی قَوْلَهٗ کِذْبًا وَ مَیْنًا میں عطف کا عطف الشیء علی مراد فیہ کے قبیل سے ہونا ہر وہ شخص جانتا ہے جو 'کذب' اور 'مین' کے معنی سے واقف ہے۔ پس جب جن وانس میں یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو لامحالہ طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ ان دونوں کے درمیان واؤ عطف مطلق معیت کے لئے ہے۔ کیونکہ لغت سے یا عرف سے یا کسی قرینہ عقلی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے درمیان عموم وخصوص یا ترادف کا تعلق ہے۔

اگر قرآن کی اصطلاح خاص میں ان دونوں کے درمیان عموی وخصوص کا تعلق ہوتا اور بغیر کسی تصریح کے وہ ان دونوں کے درمیان محض واؤ عطف کا استعمال کرتا تو یہ اس کے بیان کا نقص ہوتا۔ اس مقصد کے لئے اس کو کم از کم الانس والجن منھم ہی کہنا چاہئے تھا تاکہ سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ جن کے نام سے جس گروہ کو یاد کیا جا رہا ہے وہ لغت اور عرف عام کے خلاف انسانوں کا ایک گروہ ہے۔

لیکن ہم کو عطف ومعطوف علیہ کی بحث میں بھی پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مدعی کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں جن وانس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں ہی کا ایک طبقہ مراد ہے۔ اب آپ ان تمام آیات کو پڑھ جایئے جن میں یہ دونوں لفظ یکجا استعمال ہوئے ہیں۔ اگر خود انہی میں متعدد آیتیں آپ کو ایسی مل جائیں جن میں ان دونوں گروہوں کی مغائیرت صاف نظر آتی ہو تو مدعی کا دعویٰ آپ باطل ہو جائے گا (اب ایسی آیات ملاحظہ ہوں)

''ہم نے انسان کو کالے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور اس سے پہلے جنوں کو ہم نے لُو کی گرمی سے پیدا کیا تھا''۔ (الحجر:26،27)

''اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لپٹ سے''۔

(الرحمٰن:14،15)

''پس اُس روز نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کی بابت پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن سے''۔

(الاعراف:39)

''ان سے پہلے ان حوروں کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے''۔ (الرحمٰن:56)

''انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے''۔ (الجن:6)

''جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع کرے گا پھر ملائکہ سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہی کو پوجا کرتے تھے؟ وہ عرض کریں گے تُو پاک ہے، ہمارا ولی تُو ہے نہ کہ یہ۔ دراصل یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور ان میں سے اکثر درحقیقت انہی پر ایمان رکھتے تھے''۔ (سبا:40،41)

''اور انہوں نے اللہ کے اور جنوں کے درمیان رشتہ جوڑ رکھا تھا''۔ (الصفت:158)

''اور جس دن اللہ اُن سب کو جمع کرے گا تو فرمائے گا: اے گروہ جن! تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا اور انسانوں میں سے جو ان کے دوست تھے وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم میں سے بعض نے بعض سے خوب فائدہ اٹھایا اور ہم اب اس مدت کو پہنچ گئے جو تُو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی''۔

(انعام:128)

ان آیات سے کیا ثابت ہو رہا ہے۔ یہ کہ جن اور انس دو الگ اور متباین الحقیقت گروہ ہیں؟ یا یہ کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا جز ہے۔

دوسری دلیل

(منکرین جنات کی) دوسری دلیل یہ ہے کہ ''ابلیس اور اس کی ذریت کو، جو حسب تصریح قرآن 'جن' ہیں، اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی بیان کیا ہے۔ اِنَّهٗ یَرٰکُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف:27) بخلاف اس کے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو جن تھے وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے، لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام والے جن وہ آتشیں جن نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں''۔

اس کے جواب میں بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام والے جنوں کے متعلق قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ نظر آتے تھے، انسانی شکل میں تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے علاوہ عام لوگ بھی ان کو دیکھتے تھے۔ لہٰذا قرآن کی جو آیت آپ استدلال میں پیش فرما رہے ہیں، وہ ان آیات کے خلاف نہیں ہے جن میں حضرت سلیمان علیہ السلام والے جنوں کا ذکر آیا ہے۔ رہا آپ کا یہ گمان کہ وہ انسانوں کے سے کام کرتے تھے، تو یہ بھی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن میں کہاں کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح پانی میں غوطے لگاتے تھے یا انسانوں کی طرح برتن اور عمارتیں بناتے تھے، یا انسانوں کی طرح باندھے جاتے تھے؟ وہاں تو مطلقاً غواصی اور ظروف سازی اور معماری وغیرہ کا ذکر ہے اور محض اس ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غواصی وغیرہ انسانوں کی سی غواصی وغیرہ تھی۔ تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غواصی بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ہے جس طریقہ سے انسان غوطہ لگاتا ہے اور ظروف سازی وغیرہ انہی طریقوں سے منحصر ہے جنہیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ اگر محض یہ بات کہ جو فعل انسان کرتا ہے وہ کسی ہستی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ حکم لگانے کے لئے کافی ہو کہ وہ ہستی لامحالہ انسان ہی ہونی چاہئے تو ایک شخص نعوذ باللہ خود اللہ کو انسان کہہ سکتا ہے کیونکہ قرآن میں بعض وہ افعال جو انسان کرتے ہیں، اللہ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں مثلاً بولنا، دیکھنا، سننا وغیرہ۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس پہلو سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آتے تھے اور انسانوں ہی کی طرح وہ سب افعال کرتے تھے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے تب بھی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس گروہِ مخلوقات سے خارج تھے جو نظر نہیں آتا۔ اس لئے کسی مخلوق کا ایسا ہونا کہ وہ انسان کو نظر نہ آئے، اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا نظر آنا ممکن ہی نہ ہو اور بطور خرقِ عادت بھی وہ نظر نہ آ سکے۔ قرآن میں شیاطین جن کے غیر مرئی ہونے کی صفت تو صرف ایک ہی جگہ بیان ہوئی ہے مگر ملائکہ کی اس صفت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے مثلاً:

لیعنی شیطان نے اپنے اولیاء سے کہا کہ میں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

فرشتوں کی وہ فوجیں دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔ (انفال:48)

"پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی سکینت اس پر اتاری اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید کی جن کو تم نہ دیکھتے تھے"۔ (التوبہ:14)

"اور اللہ نے وہ لشکر اتارے جن کو تم نہ دیکھتے تھے"۔ (التوبہ:26)

"جب تم پر فوجیں حملہ آور ہوئیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہ آتے تھے"۔ (احزاب:9)

"جس روز یہ لوگ ملائکہ کو دیکھیں گے، اس روز مجرموں کی خیر نہ ہوگی"۔ (الفرقان:22)

اس کے باوجود متعدد مواقع پر قرآن مجید ہی ان بیان کیا ہے کہ ملائکہ انسانی شکل میں آئے ہیں نہ صرف انبیاء نے بلکہ عام انسانوں تک نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان بہت سی مثالوں کو دیکھ کر آپ نے ملائکہ کے متعلق بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ ان سے مراد بھی انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے؟ غیر مرئی ہونے میں دونوں برابر۔ انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے واقعات ملائکہ میں متعدد اور جنوں میں صرف ایک۔ باوجود اس کے تعجب ہے کہ آپ ملائکہ کے متعلق تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ خرقِ عادت بار بار وہ انسانی صورت اختیار کرتے رہے ہیں لیکن جنوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ سن کر آپ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غیر معمولی دعا کو قبول کر کے جس طرح اللہ تعالیٰ نے خرقِ عادت کے طور پر ہوا اور پرندوں کو ان کے تابع کیا تھا اور ان کو جانوروں کی بولیاں سکھائی تھیں، اسی طرح بطور خرقِ عادت اس نے جنوں کو بھی مرئی و محسوس بنا دیا ہوگا۔ اس کے برعکس آپ قرآن کی تمام تصریحات اور لغت عرب کے خلاف یہ تاویل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ صرف اس خاص موقع پر انسانوں کو 'جن' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مولانا...... تو اس ایک مثال سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کی ایک مستقل قسم کا نام ہی 'جن' فرض کر لیتے ہیں۔ درآنحالیکہ اس کے لئے کوئی ثبوت ان کو قرآن سے نہیں ملا اور اس کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیات اور کلام عرب کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا بار اٹھانے سے پہلے کیا اس بات پر غور کر لینا بہتر نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غیر مرئی مخلوق کو مرئی بنا دینا کون سا ایسا مستبعد اور محال امر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی مشقت اور اتنے تکلف کی حاجت پیش آئے؟ جب آپ نے ملائکہ جیسی لطیف مخلوق کا مرئی ہونا مان لیا تو شیاطین جیسی کثیف مخلوق کے مرئی ہو جانے میں اتنا استبعاد کیوں محسوس ہوتا ہے؟ قرآن مجید میں جنوں کی جو کچھ حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک آتشیں مخلوق ہے لیکن جبریل فرشتے کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وہ 'روح' اور وہ بھی 'روح اللہ' ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے اچھے خاصے آدمی کی شکل میں نمودار ہوئی"۔ (مریم:117)

"یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے، اس کو لے کر روح الامین اترا"۔ (الشعراء:192،193)

جب "روح اللہ" جیسی مجرد از عوارض مادہ شے کا باذن الٰہی مرئی ہو جانا ممکن ہے تو "نارالسموم" جیسی چیز کا جو مادے اور مادی تکاثف سے قریب تر ہے جسمیت اختیار کر لینا کیوں ناممکن یا بعید از عقل و قیاس ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر قرآن میں تاویلات بعیدا کا دروازہ کھولا جائے؟ قرآن کی رُو سے تو صرف باری

تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ انسان کی نگاہیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں: قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ (اعراف:143) صفت بالذات صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ صفت بالذات نہیں ہے۔ البتہ بعض کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا کہ وہ عادتاً نظر نہیں آتیں لیکن اگر اللہ چاہے تو وہ اس پر قادر ہے کہ خواہ ان کو مرئی کر دے یا ہماری نظروں کو اتنا تیز کر دے کہ ان کی لطیف تر صورتوں کو دیکھ سکیں۔

تیسری دلیل

آپ نے اور مولانا...... نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ "حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جو غوطہ خور اور معمار وغیرہ تھے ان کو 'شیاطین' کہا گیا ہے اور شیاطین کا اطلاق جنوں کی طرح انسانوں پر بھی کیا گیا ہے۔ اس لئے آپ کہتے ہیں کہ ان معماروں اور غوطہ خوروں کو ان کے مرئی ہونے اور انسانوں کے سے کام کرنے کی بناء پر شیاطین الانس کیوں نہ سمجھا جائے"۔

اس کو دلیل کے بجائے میں صرف غلط فہمی کہوں گا۔ اوّل تو قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے کاریگروں اور خادموں کے لئے صرف شیاطین ہی کا لفظ نہیں آیا بلکہ 'جن' کا لفظ بھی آیا ہے مثلاً:

"اور سلیمانؑ کے لئے اس کے لشکر از قسم جن و انس و پرند جمع کئے گئے"۔ (النحل:117)

"اور جنوں میں سے جو اس (حضرت سلیمانؑ) کے آگے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے...... جو کچھ وہ چاہتا وہ اس کے لئے بناتے تھے، بڑی بڑی عمارتیں، مورتیں اور حوض جیسے بڑے بڑے تھال اور ایک جگہ جمی رہنے والی بھاری دیگیں...... پھر جب ہم نے سلیمانؑ پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا تو ان کو اس کی موت کی خبر جس چیز نے دی وہ کچھ اور نہ تھا، محض زمین کا کیڑا جو سلیمانؑ کے عصا کو کھا رہا تھا۔ جب سلیمانؑ گر پڑے تب ان جنوں پر یہ راز کھلا کہ وہ غیب جانتے ہوتے تو اتنی مدت تک اس ذلیل غلامی کے عذاب میں نہ پڑے رہتے"۔ (سبا:12-14)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غوطہ خور اور معمار شیاطین 'جن' کی قسم سے تھے، شیاطین الانس نہ تھے۔ دوسرے یہ بات آپ کی اور مولا ان کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی کہ قرآن مجید میں کہیں مطلقاً الشیطان اور الشیاطین بول کر انسان مراد نہیں لئے گئے ہیں، بلکہ ابلیس اور اس کی ذریت ہی مراد لی گئی ہے۔ ہاں اگر کہیں انسانوں کے کسی گروہ کے لئے شیاطین کا لفظ بطور صفت استعمال کیا گیا ہے تو ایسے ہر موقع پر صراحۃً یا کنایۃً یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں، جیسے:

وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (الانعام:113)

وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَکُمْ (البقرہ:14)

ایمان بالکتاب کا مقتضیٰ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی ایسی قوی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بناء پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں، یا کسی دوسرے مقام پر، لفظ 'جن' کے معنی متعین کرنے میں اس معنی سے انحراف کرنا جائز ہو جس کی تصریح خود قرآن مجید متعدد مواقع پر کر چکا ہے اور جب اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے تو کسی شخص کے لئے جو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ جس کو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اللہ نے 'جن' کہا ہے اور آدمی نہیں کہا، اس کو وہ اپنے قیاس سے آدمی کہہ دے۔ ایسا قیاس کرنے کے ہم خوگر ہیں، ان واقعات کے خلاف ہے جو بعض مواقع پر قرآن مجید میں جنوں کی طرف منسوب کئے گئے ہیں لیکن اسی طرح آگ کا ایک خاص شخص کے لئے سرد ہو جانا، لکڑی کا ایک خاص موقع پر اژدہا بن جانا، دریا کا ایک خاص وقت میں پھٹ کر راستہ دے دینا، ایک شخص کا مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان ڈال دینا اور مُردوں کو زندہ کر دینا، چند آدمیوں کا ایک غار میں تین سو سال تک سوتے پڑے رہنا اور پھر بھی زندہ رہنا، ایک شخص کا مرنے کے سو برس بعد جی اٹھنا اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کا جوں کا توں بالکل تازہ حالت میں پانا، ایک شخص کا ساڑھے نو سو برس تک زندہ رہنا اور وہ بھی یوگا کی مشقوں سے نہیں بلکہ ایک منکر قوم کے مقابلہ میں تبلیغ دین کی تھکا دینے والی مشقوں کے ساتھ، یہ اور ایسے ہی متعدد واقعات ہیں جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے ہیں اور سب اس عادت جاریہ کے خلاف ہیں جس کو دیکھنے کے ہم خوگر ہیں۔

اگر ہم قرآن کو اللہ علیم وخبیر اور قادر وتوانا کا کلام نہ مانیں تو سرے سے ان واقعات کی تاویل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ محض اس بنیاد پر ان سب کو جھٹلا دیا جا سکتا ہے کہ ایسا ہوتے ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ دیکھا اور اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن اس اللہ کا کلام ہے جو ازل سے ابد تک عالم وجود کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا حقیقی علم رکھتا ہے اور اللہ وہ خالق ہے جس کے معجزے ہم کو سورج اور سیاروں اور زمین اور خود اپنے وجود میں ہر آن نظر آ رہے ہیں تو ہمیں کسی غیر معمولی اور خلاف عادت واقعہ کو بعینہ اسی طرح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا جس طرح وہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔

یہ واقعات تو کیا چیز ہیں، اگر قرآن میں کہا گیا ہوتا کہ ایک وقت میں چاند کو ماؤنٹ ایورسٹ پر لا کر رکھ دیا گیا تھا اور کسی وقت اللہ نے سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالا تھا، تب بھی ایک مومن صادق کو اس بیان کی صداقت میں ایک لحہ کے لئے شک نہ ہو سکتا تھا اور نہ کسی طرح تاویل کر کے اس کو عادت جاریہ کے مطابق ثابت کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ اس لئے یہ کائنات جس کی وسعت کا تصور کرنے سے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے اور اس کائنات کی ہر شے، حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا اور کسی جانور کے جسم کا ایک بال بھی اپنی پیدائش میں درحقیقت اتنا ہی حیرت انگیز معجزہ ہے جتنا چاند کا ایورسٹ پر آ جانا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ ایک قسم کے واقعات کو دیکھنے کی ہمیں عادت ہو گئی ہے، اس لئے ہم کو ان کے معجزہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا اور دوسری قسم کے واقعات شاذ ہیں اس لئے ان کی خبر جب ہم کو دی جاتی ہے تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے اور ہماری عقل جو صرف مشاہدات و تجربات پر اعتماد کرنے کی خوگر ہو گئی ہے ان کو باور کرنے میں جھجکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق جب ہم کو کوئی خبر دی جائے تو ہمیں حق ہے کہ ان کے وقوع کے متعلق قابل وثوق شہادت طلب کریں لیکن ایک مومن کے لئے قرآن سے بڑھ کر قابل وثوق شہادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ دل سے یقین رکھتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے فعل پر خود اللہ ہی کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ البتہ جو شخص قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک رکھتا ہو اس کو حق ہے کہ قرآن کے ہر بیان میں شک کرے خواہ وہ عادت جاریہ کے موافق ہو یا مخالف! (ترجمان القرآن 1935ء) (جاری ہے)

کشمیر کہانی

وقت کے قیدی

''یہ وقت کے قیدی ضرور آزاد ہوں گے۔ کشمیر بنے گا پاکستان، کشمیر بنے گا پاکستان!''

دستگیر شہزاد
0300-9667909

صبح شیو کرتے وقت میں نے جب آئینے میں چہرہ دیکھا تو مجھے پھر سے ڈاکٹر کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کئی روز سے ٹل رہا ہے مگر آج آفس سے واپس ہوتے وقت ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤں گا۔ اس میں مزید لاپروائی ٹھیک نہیں۔ آج ہر قیمت پر ڈاکٹر سے ملنا ہی ہے۔

پچھلے ایک ہفتہ میں ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ معاملہ اگرچہ دفتر کا تھا مگر گھر میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ بیوی نے ایک آدھ بار اظہار ہمدردی کرتے ہوئے سن گن لینے کی کوشش کی خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ آج جب Enternal Audit رپورٹ آ گئی اور اس کے Counter سے متعلق کسی گڑبڑ کا ذکر نہیں پایا بلکہ کچھ پذیرائی ہوئی تھی۔ صاحب کی باتوں پر مجھے قطعی یقین نہ ہوا۔ جب تک میں نے خود نہیں پڑھ لی اور اس کے بعد ہی راحت کی سانس لی۔ چہرے پر کئی روز کے بعد اطمینان نظر آیا تھا۔ ہفتہ بھر سے بگڑے ہوش و حواس درست ہوئے تھے۔ اس خوشی میں میں نے پورے سٹاف کو چائے پلائی، سگریٹ اور پان کے ساتھ۔

میرا خیال تھا کہ اعلیٰ افسران کی جانچ پڑتال یا Audit سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے جو کسی بھی سطح پر ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ حوصلہ و جسارت مجھ میں تھی ہی نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دفتر میں مَیں خاصا ایماندار واقع ہوا تھا۔ کیونکہ آمدنی والی سیٹ پر ہونے کے باوجود پیسے کے لئے کبھی کسی سے تھوڑا بہت بھی اختلاف نہیں ہوا تھا۔ جس نے جو دے دیا آنکھ بند کر کے میں نے رکھ لیا۔ ساتھیوں کو البتہ کچھ شکایت ضرور تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ریٹ خراب کر رہا ہوں۔

''کاہے کا ریٹ؟'' میری تاویل ہوتی۔ ''اپنی خوشی سے جو دے دے وہی بہت ہے۔ لینا تو حالانکہ یہ

بھی نہیں چاہئے پر اب تنخواہ سے پورا نہیں ہوتا''۔

یہی وجہ تھی کہ باہر کے لوگوں کی رائے میرے بارے میں خراب نہیں تھی اور یہ بھی مجھے معلوم تھا۔ یہ خیال کبھی اس درجہ تقویت دیتا کہ مجھے یقین کرنا پڑتا کہ مرنے کے بعد اللہ بھی کم سے کم اس کمائی کے بارے میں باز پُرس نہیں کرے گا۔

مجھے دفتر کا ماحول حیرت انگیز طور پر بدلا ہوا نظر آیا۔ میری عادت تھی کہ کام کے اوقات میں بنا ضرورت میں سیٹ سے نہیں اٹھتا۔ کچھ کا خیال تھا کہ جب سامنے خوبصورت لڑکی بیٹھی ہو تو کرسی سے اٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میں ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتا، غصہ تو بہت کم ہی آتا، زیادہ تر باتوں کا جواب تبسم ہوتا۔ کبھی کبھی مجھے کوفت بھی ہوتی کہ پندرہ سال کی ملازمت کے بعد بھی بابو والا مزاج کیوں نہیں اپنایا۔ اس وقت جو کانا پھوسی ہو رہی تھی وہ روز والی نہیں تھی اور میری ذات سے بھی وابستہ نہیں تھی۔ اس بات کا پختہ یقین تھا۔ ساتھ کام کرنے والوں کے چہرے صرف پُراسرار ہی نہیں ہوئے تھے اجنبیت کا احساس بھی کرا رہے تھے۔ وہ لوگ جو عورتوں کی طرح لگائی بجھائی کے عادی تھے ان کی نظر بچاتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی غرض سے میں باہر نکلا۔

یہاں بھی راز داریاں برتی جا رہی تھیں۔ اب ذہن میں اندیشے مزید گہرے ہونے لگے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ہندو انتہا پسند مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر شہر کے حالات بگاڑ رہے ہیں میری الجھنیں بڑھ گئیں۔ بیوی بچوں کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ گلاس کی آدھی چائے میز پر رکھ کر تیزی سے اندر آیا۔ صاحب سمیت پورا عملہ غائب تھا۔ صرف دو چپڑاسی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی سے الماری بند کی اور سکوٹر نکال کر گھر کا رخ کیا۔ گھر آتے آتے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میں بُری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بہت تیز سکوٹر چلائی تھی۔ کئی بار خود کو ٹکرانے سے بچایا تھا۔ عام طور سے میں گاڑی اتنی تیز نہیں چلاتا تھا مگر اس وقت معاملہ بہت مختلف تھا، میرا بس چلتا تو اُڑ کر گھر پہنچ جاتا۔

لوگ گھروں کے باہر کھسر پھسر کر رہے تھے۔ گیٹ کے سامنے سکوٹر روکی تو پڑوسیوں کی مشکوک نگاہیں میری طرف اٹھ گئیں۔ رسماً بھی کسی نے حال احوال نہیں پوچھا۔ فی الحال میرے پاس بھی وقت نہیں تھا۔ سب سے پہلا کام تو بیوی بچوں کی خیریت معلوم کرنا تھا۔ پڑوسیوں کی نظروں کے عتاب سے بچنے کے لئے بڑبڑاتے ہوئے سکوٹر سمیت اندر گھس آیا۔ آہنی دروازہ دیوار سے ٹکرا کر تیزی سے واپس آیا تھا۔ اگر میں ہاتھ بڑھا کر اسے روک نہ لیتا تو یقیناً چوٹ لگتی۔ پھرتی سے پھاٹک بند کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ بیوی بچوں کو سامنے پا کر اطمینان کی گہری سانس لی۔ بیوی کے چہرے پر ہراس کی لکیریں نمایاں تھیں۔ بچے تمام باتوں سے بے خبر کھیلنے میں مصروف تھے۔

ریموٹ اٹھا کر میں نے ٹی وی آن کیا۔ ثوبیہ سے پانی لانے کو کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ خبریں شروع ہونے والی تھیں۔ بچے اب شور بھی کر رہے تھے۔ میں نے بُری طرح ڈانٹا۔ وہ تینوں معاملے کی نزاکت سے انجان حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کیوں کہ اس سے پہلے توڑ پھوڑ کئے بغیر انہیں سخت ڈانٹ نہیں پڑی تھی۔ یہ شور و شغب تو روز کے معمولات تھے۔ چار سالہ ابوذر سہم کر ماں کی گود میں دبک گیا۔ صوبیہ نے گلاس میز پر رکھ کر اسے اٹھا لیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً مجھ سے الجھ پڑتی مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔

دوپہر تک سب کچھ نارمل تھا۔ صوبیہ روز کی طرح برابر والے رام اوتار جی کے گھر آدھا گھنٹہ بیٹھ کر آئی

تھی اور ان کی لڑکی کو قورمہ بنانے کی ترکیب سکھاتی تھی۔ اسی وقت خبر ملی کہ شہر میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ چار پانچ مر بھی گئے ہیں۔ دونوں فرقوں کے لوگ یہ ثابت کرنے پر تلے تھے کہ مرنے والے انہی کے فرقے کے تھے۔ اس میں کتنی صداقت ہے یہ کسی کا مسئلہ نہیں تھا۔ بات کو نمک مرچ لگا کر آگے بڑھا دیتے اور خیال کرتے کہ فی الحال ان کی ذمہ داری ختم اور یہ سب کچھ نوجوان طبقے تک ہی محدود نہ تھا۔ معمر اور سنجیدہ اشخاص بھی یہی سب کر رہے تھے۔

ٹی وی سے کرفیو کی تصدیق ہونے کے بعد میری مشکلیں اور بڑھ گئیں۔ میرا معاملہ دوسروں سے بہت مختلف تھا۔

''کتنا منع کیا تھا میں نے کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے''۔ ٹی وی بند کیا تو بیوی شروع ہو گئی، جیسے اسی انتظار میں تھی۔ ''چاروں طرف ہندوؤں کی آبادی ہے اور گھر کے عین سامنے بڑا سا مندر۔ صبح آنکھ کھلتی ہے تو گھنٹے اور سنکھ کی آوازیں، مگر میری تو ہر بات آپ کو بُری لگتی ہے''۔

میں اس وقت کسی طرح کی بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ بہرحال مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دو چار گھر بھی مسلمانوں کے اور ہوتے تو کتنی ہمت بندھتی لیکن گھر خریدتے وقت اور ہر چیز کا کتنا خیال رکھا تھا۔ پر یہ چُوک ہو گئی۔ اس وقت اس طرح سوچنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ حالات تو اِدھر دس بارہ سالوں سے بگڑے ہیں۔ اگرچہ اس علاقے میں کسی ایک فرقے کی اکثریت نہیں ہوئی تھی مگر جس جگہ میرا گھر تھا وہاں آس پاس کسی مسلمان کا دوسرا گھر نہیں تھا۔ مشکلیں اس باعث بڑھ رہی تھیں۔ حالانکہ سڑک کے اس پار والی لین میں مسلمانوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی مگر چند قدم کا فاصلہ کبھی اتنا بڑھ جائے گا اس کا احساس کبھی پہلے نہیں ہوا۔ میرے تمام عزیز و اقارب اور دوست شہر کے اس حصے میں مقیم تھے جہاں کرفیو لگا تھا۔ وہاں تو جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لے دے کر یہی محلہ بچتا ہے۔ حالات زیادہ بگڑنے کی صورت میں اسی طرف نکل جاؤں گا۔ تازہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کی غرض سے صوبیہ کو کچھ تسلی بخش جملے ادا کئے۔

قبل اس کے کہ میں باہر نکلتا ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے شیشے میں خود کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر ٹھہر گیا۔ کچھ سوچتا ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ پیشانی کی دائیں طرف کئی روز سے نکلا ہوا دانہ کچھ اور بڑا نظر آیا۔ اُبھرے ہوئے حصے کو دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پھنسی یا دانہ ہرگز نہیں۔ دانے وغیرہ کی ہیئت سے میں بہرحال واقف تھا۔ بیوی سے شبہ کا اظہار کیا تو اس نے بھی تائید کی اور کہا کہ پہلی فرصت میں ڈاکٹر کو دکھاؤں۔ چھوٹی موٹی چیزوں میں بھی لاپرواہی نہیں برتنی چاہئے۔ آگے کچھ اور کہتی تبھی گیٹ کے باہر سے کچھ لوگوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ہم پر لرزش سی طاری ہو گئی لپک کر بیوی بچوں کو اندر والے کمرے میں بند کیا۔ گو کہ صوبیہ مجھے بھی روکتی رہی مگر میں تجسس اور خوف کے سائے تلے باہر آ ہی گیا۔ دبے قدموں سے گیٹ تک آیا پھر آہستہ سے ایک آنکھ اس احتیاط سے دروازے کی جھری سے لگا لی کہ حملے کی صورت میں بہت زیادہ نقصان نہ ہو۔

گلی کا منظر خیالوں کے قطعی برعکس نظر آیا۔ سامنے والے رام نریش جی چبوترے پر دو تین لوگوں کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کان لگا کر میں نے سننے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آگے کچھ فاصلے پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میں بھی اگر اس

www.aiourdubooks.net

وقت اپنوں کے بیچ ہوتا تو بچے ماں کی گود میں یوں ڈرے سہمے نہ ہوتے۔ عدم تحفظ کا احساس کس قدر مشکل ہوتا ہے آج مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔ احتیاط سے کنڈی کھولی تا کہ وہ لوگ نہ سن پائیں۔ باہر نکل کر پھر سے دروازہ بند کیا۔ ہراس کو چھپاتے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔ رسمی سی ہائے ہیلو کے بعد اپنے مقصد پر آ گیا۔

''یہاں سے کون لوگ دوڑتے ہوئے گزرے ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

جواب میں پاٹھک جی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''تم لوگ ابھی آپ کی ہی بات کر رہے تھے۔ رام نریش جی کا خیال تھا کہ آپ نہیں نکلیں گے، پر میں کہہ رہا تھا ضرور نکلیں گے''۔

میں نے بہت کوشش کی مگر خجالت چہرے پر آ ہی گئی۔ میں سوچ رہا تھا میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر بار بنا کسی قصور کے مجھے مضحکہ بنا دیا جاتا ہے۔

اب میں ایک ساعت بھی وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ مگر انہوں نے ایسی اخلاقی زنجیریں ڈال دی تھیں کہ ان سے رہائی اتنی آسان نہ تھی۔ بظاہر جتنی نظر آ رہی تھی۔ میں فکر مند تھا کہ اندر جا کر بیوی کو معاملے کی اطلاع دوں۔ وہ پریشان ہو گی اور تبھی ایک پولیس کی جیپ آ کر رکی۔ لڑکے گیند بلا سنبھال کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ میں بھی سڑک کراپنے پھاٹک تک آ گیا تھا۔ تھانیدار نے سب کو اندر جانے کا حکم دیا اور یہ ہدایت بھی کہ کوئی باہر نہ دکھائی دے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا بلکہ میرے جی میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ حضور تھوڑے تھوڑے وقفے سے آپ چکر لگا لیں تو بڑی نوازش ہو گی۔ آگے کچھ اور سوچ پاتا کہ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں بھی جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔

سورج دن بھر کا سفر سمیٹ رہا تھا۔ فضا میں تاریکی کے ساتھ اداسی بھی پھیلتی جا رہی تھی۔ رات کسی تقریب کی ہو تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے مگر جب خوف کے سائے میں گزارنی ہو تو یہ ذہن و دل میں ہی نہیں اوپر نیچے ہوتی سانسوں میں بھی ہیبت پیدا کر دیتی ہے۔ بیوی بچوں کو سمیٹے میں کونے میں دبکا ہوا تھا۔ ایک ایک پل جیسے صدیوں پر محیط ہو۔ پہلے بھی مسائل اور دشواریاں آئیں مگر وقت کی سفاکیت نے ایسے کرب و اذیت سے کبھی دوچار نہیں کیا۔ جیسا کہ آج چند گھنٹوں میں گزر گیا تھا۔

ہر چند کہ اس وادی کشمیر میں امن و امان تھا مگر یہ قائم ہی رہے، اس کی ذمہ داری پاکستان ہی نبھاہ سکتا ہے۔ بچے بھی سہمے ماں کے پہلو میں سمٹے ہوئے تھے دور دراز سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ ہر آہٹ پر ہماری سانسیں تھم سی جاتیں۔ خوف قطروں کی شکل میں مساموں خلیوں سے نکل پڑتا۔ رات کیسے گزرے گی؟ گزر بھی پائے گی یا نہیں؟ ایسے بہت سارے سوال ذہن کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ ذرا ذرا دیر میں فون کی گھنٹی بج اٹھتی۔ حالانکہ میں نے گھنٹی کی آواز کو کم کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود امپورٹڈ فون کی وہ آواز جس کی بہت لوگ تعریف کر چکے تھے، پر اشتعال انگیز نعروں کا شائبہ کیوں ابھر رہا تھا۔ میں وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ دماغ میں یہ بھی آیا کہ ریسیور اٹھا کر الگ رکھ دوں مگر خیریت کے لئے اماں کے فون بھی آ رہے تھے۔ بھوک نے بھی اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیئے بلکہ اب شدت تک پہنچ گئی تھی۔ بچے بنا کھائے سونے لگے تھے، دل میں ہوک سی اٹھی۔ فوراً صوبیہ سے چاول پکانے کو کہا۔ شاید وہ اسی انتظار میں تھی ابوذر کا سر آہستہ سے اٹھا کر تکیہ پر رکھا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

تکیہ کے پاس مجھے ایک پوٹلی سی نظر آئی۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اٹھایا اور کھولے بغیر مجھے معلوم ہو گیا

کہ اس میں زیور اور نقدی تھی۔ اپنے معاملات میں عورت نازک وقت میں بھی ہوش نہیں کھوتی۔ اس ادا اس کے ساتھ صوبیہ کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔ تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی؟ کمرے کی ہر چیز کو نئے زاویے کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اچانک میرا دھیان گیٹ پر لگی اپنے نام کی پلیٹ کی طرف گیا اور ایک دم سے اچھل گیا۔ جلدی سے اٹھ کر ابوذر کا بستہ تلاش کیا۔ اس میں سے سیاہ رنگ کا مارکر نکالا اور لپک کر گیٹ تک آیا۔ جلدی سے پلیٹ اتاری، دونوں طرف جھانک کر دیکھا، دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا اور تو اور ساری رات بھونکنے اور آوازہ گردی کرنے والے کتے تک غائب تھے۔ بالکل ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر میں نے دیوار پر بڑے حرفوں میں ''اوم'' لکھا۔ اس پر کئی بار مارکر پھیرنے کی وجہ سے بہت واضح نظر آنے لگا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے کی سانس لی اور اندر بھاگ آیا۔

اس کے بعد صوبیہ کو کر سمیت کمرے میں داخل ہوئی۔ بچوں کو جگایا، کچی نیند سے اٹھنا انہیں تھوڑا ناگوار ضرور لگا مگر جس طرح وہ کھانے پر ٹوٹے تھے ہم میاں بیوی کے لئے وہ منظر عجب سا تاثر دینے والا تھا۔ خوشی بھی تھی اور غم بھی۔ کیا زیادہ تھا اور کیا کم یہ ہم طے ہی نہیں کر پائے۔ کرسی پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ کو دیکھ کر صوبیہ بولی۔

''آپ نے یہ صحیح کیا۔ میں بھی سوچ رہی تھی''۔

''اوم!'' میری زبان پر آتے آتے رک گیا۔ مجھے یقین تھا کہ صوبیہ اس بات کو کسی بھی قیمت پر تسلیم نہیں کر پائے گی۔ وہ بہت مذہبی قسم کی واقع ہوئی ہے اور فی الحال اسے سمجھایا بھی نہیں جا سکتا کہ میرے لئے اس وقت زندگی پہلے ہے۔

رات سبک خرامی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جتنی بار ہماری نظر کلاک پر جاتی اتنی بار گھڑی کے خراب ہونے کا دھوکا ہوتا۔ پچھلی گلی کی طرف سے بلی کتے کی آہٹ سے بھی اندر باہر کے سب تناسب بگڑ جاتے۔ صوبیہ مسلسل آیت کریمہ اور قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی۔ اللہ اللہ کر کے شب آدھی سے زیادہ گزر گئی، بچے اب گہری نیند میں سو رہے تھے۔ تھوڑے وقفے سے صوبیہ اور شہروز کچھ بول دیتے تو موجودگی کا احساس ہوتا۔ نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اسی طرح کمرے میں قید ہیں۔ کچھ گھنٹوں کا خوف و ہراس نصف زندگی کی رعنائیوں کو کس طرح غارت کرتا ہے۔ اس کا خوب اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ دس بجے تک پٹرول کار نے کئی چکر لگائے تھے۔ جس سے ہمیں بڑی تقویت مل رہی تھی۔ ورنہ باہر کہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہم بالکل بے خبر تھے۔ بے خبری اطمینان کے ساتھ ساتھ تشویش بھی بڑھا رہی تھی۔

''پولیس نہ چاہے تو کہیں کچھ نہیں ہو سکتا ہے؟'' صوبیہ نے کہا تو مجھے خیال آیا۔ کہ ادھر دو گھنٹے سے گاڑی نہیں آئی ہے۔ لہجے میں تھوڑا خدشہ بھی پوشیدہ تھا۔ ہو سکتا ہے کسی اور طرف راؤنڈ پر گئے ہوں۔ اسی وقت اچانک پچھواڑے کی گلی میں کچھ لوگوں کے ہونے کی آہٹ ملی اور یہ قطعی واہمہ نہیں تھا۔ صوبیہ تو بس چیخنے والی تھی۔ مگر تب تک شہروز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دبے پاؤں چل کر میں صحن میں آیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ اتنی سی دیر میں میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سرگوشیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آنگن کا دروازہ بہت مضبوط نہیں تھا۔ ایک جھٹکے میں الگ ہو سکتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ رہی سہی ہمت بھی پارہ پارہ ہو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گئی۔ گپ چپ کے ساتھ زنجیر اور لوہے کی راڈ کی کھنک بھی سنائی دی۔ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ جاننے سے زیادہ ضروری تھا اپنا دفاع۔ انتہا پسند ہندو ہوں یا غیر ملکی، غرض و غایت تو ایک ہی ہوتی ہے۔ وقت بہت کم تھا۔ موت دروازے تک آ چکی تھی، کسی بھی لمحہ دھڑ دھڑا کر اندر گھسنے والے تھے۔

شہروز نے فوراً پولیس کو فون کیا۔ شاید آ ہی جائے۔ اس کے بعد ایک ڈنڈا تلاش کیا جو ایک ضرب سے زیادہ کا متحمل نہیں تھا۔ باورچی خانے سے ترکاری کاٹنے والا چاقو نکالا اور یہ طے کر لیا کہ جتنے زیادہ سے زیادہ وار ہو سکتے ہوں وہ کرے گا ضرور۔ تھانہ کچھ فرلانگ کی دوری پر تھا۔ صوبیہ نے مشورہ دیا کہ آنگن کی بتی جلا دو تاکہ انہیں ہمارے جاگنے کا احساس تو ہو۔ روشنی کا فوری کچھ اثر ہوا۔ رکے ہوئے قدموں میں کچھ حرکت ہوئی اور تبھی خاموشی کو چیرتی ہوئی پولیس کی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ دھم، دھم! قدموں کی آواز تیز ہوئی اور چند لمحوں میں ہی یہ شور کمزور پڑ کر خاموش ہو گیا۔

میں سرعت سے تالا کھول کر سڑک پر آیا۔ پٹرول جیپ دروازے پر کھڑی تھی۔ میں نے داروغہ کو اپنا حوالہ دیا کہ باقی باتیں بتائیں۔ اب تک کئی ہندو گھروں کے لوگ باہر آ چکے تھے۔ پولیس کا پورا عملہ بھاگ کر گلی تک آیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں سگریٹ کے تازہ ٹکڑے پڑے تھے جس میں اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ داروغہ نے اٹھا کر باریکی سے دیکھا اور پھینک دیا۔ میں نے شہروز کی ہمت افزائی کی۔ شہروز کو اس کی سخت ضرورت بھی تھی مگر اس کے ساتھ پولیس کے خوشگوار رویے سے حیرت بھی تھی۔ ہر چند کہ پولیس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا مگر پولیس کے بارے میں معلوم تو اچھی طرح سے تھا۔

داروغہ نے دو سپاہی آگے سڑک پر بٹھا دیئے اور انہیں سخت ہدایات دیں کہ اس پورے خطے پر اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ ہی ذمے دار ہوں گے۔ جانے سے قبل شہروز نے داروغہ کے سینے پر لگی نام کی پٹی دیکھ لی۔ برجستہ اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ تو یہ معاملہ ہے تبھی تو میں کہوں کہ یہ انہونی کیسے؟"

گاڑی کے چلے جانے کے بعد پھر سے خاموشی طاری ہو گئی مگر اس بار فرق تھا۔ جیسے جنگل کا راستہ ختم ہو گیا اور اچانک مضافاتی علاقے کی حدود دکھائی دینے لگی ہوں۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ بہت سکون سے گزرا۔ میں نے چائے پی، ٹی وی پر خبریں سنیں، پاکستان کے چینلز "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے" اور ہندوستان کے چینلز "کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے" کہہ رہے تھے۔ اسی اثناء میں کئی بار غنودگی طاری ہوئی۔ صوبیہ نے تو ایک نیند مار بھی لی۔ کسمساتے ہوئے میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بج گئے تھے۔ اسی وقت "نعرہ تکبیر، اللہ اکبر" اور "ہر ہر مہادیو، جے شری رام کے فلک شگاف نعرے سنائی دیئے۔ اللہ خیر کرے۔ شاید یہاں بھی کچھ ہو گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ صوبیہ کی آنکھ بھی کھل گئی۔ صدائیں حالانکہ دور سے آ رہی تھیں مگر مشکلات تو بڑھ گئی تھیں۔ سڑک پر تعینات دونوں سپاہی غائب تھے۔ محلے کے تمام لوگ باہر نکل آئے۔ اس بار ہجوم میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اس بار ان کے چہروں پر بھی بے چینی کی جھلک تھی۔ آگے بڑھ کر شہروز جب غول میں شامل ہوا تو لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اخوت اور بھائی چارے کی اہمیت کا ادراک کر دیا۔

"ہمارا خیال تھا کہ کہیں بھی کچھ ہو پر کشمیر میں

امن قائم رہنا چاہئے۔ کشمیر میں سب کشمیری ایک ہیں لیکن ہندوستان سے انتہا پسند آتے ہیں تو......"

"آپ بالکل بے فکر رہیں"۔ شہروز نے کہہ تو دیا مگر معاملے کی نزاکت میں خوب سمجھ رہا تھا لیکن خطرناک آوازیں کبھی سپر کا کام بھی کرتی ہیں۔ اس کا احساس آج ہی ہوا۔ تحفظ کا خیال چیزوں کے مفاہیم کیسے بدلتا ہے۔ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہی چار جملے اگر یہ شام کو بول دیتے تو ان کے معنی کتنے مختلف ہوتے۔ اضطرابی کیفیت پر قابو رکھتے ہوئے میں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ National Integration پر چھوٹی سی تقریر بھی کر ڈالی۔ اندر آتے وقت میں بالکل بے بھرم نہیں تھا۔ لاکھ تسلیاں دی گئی ہوں مگر خطرے سے پہلے خطرے کا سدباب خطرہ کم کر دیتا ہے۔ اس بات پر فی الحال تو یقین نہیں کیا جا سکتا۔ پورے منظر پر اب نئی طرح سے روشنی ڈالنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ انتہا پسند ہندوستان سے ہی آتے ہیں۔ پر کہیں نہ کہیں مقامی لوگوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد شور دھیما پڑ گیا۔ میں نے اطمینان سانس لی۔

امن کسی بھی صورت قائم رہنا چاہئے۔ دنگے فساد مجھے قطعی پسند نہیں تھے۔ بہرحال اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ صبح ہو گئی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے آنکھیں جل رہی تھیں۔ بیسن پر جا کر میں نے پانی کے چھینٹے مارے۔ آئینہ دیکھ کر میں پھر سے چونکا۔ جبیں پر نکلا ہوا دانہ اس بار کچھ اور بڑا نظر آیا۔ انگلی پھیرتے ہوئے آہستہ سے دبانے کی کوشش کی۔ وہ بہت سخت تھا مگر درد نہیں ہو رہا تھا۔ پہلے تو مجھے لگا تھا کہ شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ کیڑے کے کاٹنے کا اثر بھی اتنا دیرپا نہیں ہوتا۔ اب تو کافی روز ہو گئے تھے۔ پھر آخر یہ بلا کیا ہے؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دانہ انگلی کے برابر ہو گیا تھا اور ورم بھی اسی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اب تو دور سے نظر آنے لگا تھا۔ اس مسئلے کا حل ڈاکٹر کو دکھائے بغیر نہیں نکلے گا۔ حالات نہ بگڑے ہوتے تو کل میں نے ڈاکٹر سے رجوع کر لیا ہوتا۔ میں نے طے کیا کہ آج کسی بھی قیمت پر ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤں گا۔

کل والے دنگے فساد اور انتہا پسندی کی وجہ اور دیگر تفصیلات اخبار سے معلوم ہو گئیں۔ پانچ لوگ مارے گئے تھے۔ پہلے صفحہ پر پانچوں لاشوں کی تصویریں چھپی تھیں۔

"ابو! یہ جو پانچ لوگ مرے ہیں یہ ہندو ہیں یا مسلمان؟" آٹھ سالہ اقبال نے مجھ سے پوچھا۔

میں حیرت سے اقبال کا منہ تکتا رہ گیا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں ہاں یہ ضرور لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی کانٹا پھنس کر ٹوٹ گیا ہو۔ دن کا ماحول رات سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ رات اسی شہر آشوب میں گزری ہے۔ سری نگر شہر میں روز سے زیادہ چہل پہل تھی۔ اخبارات پڑھنے کے بعد تبادلہ خیال شروع ہو گیا تھا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور شاید اس سے بھی زیادہ ضروری تھا اپنی برادری کے لوگوں سے ملنا۔

ڈاکٹر کشف کا مطب کھلا ہوا تھا۔ میں نے انہیں دکھایا۔ ان کے سوالوں کا جواب دیا۔ اس کے باوجود مجھے لگا ڈاکٹر صاحب مسئلہ کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے۔ بس روایتی سے جملے، پریشان نہ ہوں، کوئی خاص بات نہیں۔ کبھی کبھی کسی چیز کے Infection سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ دوا لکھ رہا ہوں ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا اور نہیں بھی ہوا تو ایک چیرا لگا دوں گا۔

جن لوگوں کے پاس فون کی سہولت تھی میں نے یاد کر کے سب کی خیریت معلوم کی۔ سب جگہ سے یہی

اطلاع ملی کہ کشمیر کے حالات سدھر رہے ہیں۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے میرا من اوبنے لگا تھا۔ بچے تو پھر سے کھیل کود میں مصروف ہو گئے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ سکول سے چھٹی مل گئی تھی۔ صوبیہ سے بھی کہاں تک باتیں کرتا اور ایسے حالات میں جب ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو کسی کے اندر کیا چھپا ہے۔ کوئی بھید نہیں دینا چاہئے۔ مجھے انتظار تھا کہ کرفیو میں کچھ ڈھیل ہو تو بیوی بچوں کو لے کر اماں کے پاس باغ چلا جاؤں اور جب تک حالات پوری طرح نارمل نہ ہوں وہیں رہوں۔ لاکھ وہاں کرفیو لگتا ہو مگر رات خوف کے سائے میں جاگ کر تو نہیں گزرتی ہو گی۔ وہاں کسی کی آواز پر سانسوں کا زیر و بم منتشر نہیں ہوتا اور نہ ہی منہ کھولنے سے پہلے دماغ پر زور دینا ہوتا ہے کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں۔

آخر یہ انتظار بھی ختم ہوا۔ تین روز بعد دو گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔ میں پوری تیاری پہلے ہی کئے بیٹھا تھا۔ فوراً آٹو بلایا جھٹ پٹ سب تیار ہوئے۔ میں نے ٹھہر کر پڑوسیوں کو اپنے جانے کی اطلاع دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ذرا گھر کا خیال رکھنا۔ یہ جان بوجھ کر کہا تھا تاکہ بعد میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ واپسی پر گھر صحیح سلامت ملے گا، اس کا یقین نہ مجھ کو تھا نہ صوبیہ کو۔ اس وقت جان کی حفاظت زیادہ ضروری تھی۔ مگر صوبیہ کا دم اب بھی کئی چیزوں میں اٹکا ہوا تھا۔ پر صبر کے علاوہ کوئی چارہ اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

اماں کے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ اماں نے ایک ایک کو چھاتی سے لگا کر شکرانے کے جملے ادا کئے۔ ہماری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ اس کے بعد اماں نے فوراً پیشانی کے وافر حصے کے بارے میں استفسار کیا یہ تو اور بڑھ گیا، دکھایا نہیں کیا؟

میں نے اماں کو پوری تفصیل بتائی۔ انہوں نے حکیم سیف اللہ کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ ان کی نظر میں حکیم سیف اللہ سے بہتر کوئی معالج ہی نہیں۔ کیسے کیسے امراض ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھیک ہوئے تھے۔ ہر بار ذکر نکلنے پر پوری روداد مثالوں کے ساتھ بیان کر دیتیں۔

گھنٹوں کشمیر اور سری نگر کے حالات کا ذکر چلتا رہتا۔ صوبیہ جو تین دنوں سے بولنے کو ترس گئی تھی۔ اسے بھی موقع مل گیا تھا۔ دیورانیوں کو لاگ لپٹ کر بتانے میں مصروف تھی کہ زیورات کس ہوشیاری سے بچا کر لائی تھی اور پولیس کو فون کرنے کا خیال بھی اسی کا تھا جب کہ شہروز صوبیہ کے حوالے سے ساری باتیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ رات ڈھلنے کے ساتھ یہاں بھی شورش برپا رہی۔ نعرے بازیاں بھی ہوئیں اور فائر بھی۔ بم کے دھماکے بھی توقف سے سنائی دیتے رہے۔ یہاں کے مزاج سے بھی میں اچھی طرح واقف تھا۔ غنڈے، بدمعاشوں کے لئے تو یہ وقت تیوہار جیسا ہوتا ہے مگر مجھے ان سب باتوں سے کیا؟ یہاں زندگی کو کم سے کم کسی کا خطرہ تو نہیں دس کلو میٹر کے فاصلے پر نہ زمین کا رنگ بدلا نہ آسمان کا رنگ بدلا۔ وہی آب و ہوا لیکن کتنا فرق تھا۔ دونوں جگہوں پر۔

اگلے کرفیو میں چار گھنٹے کی چھوٹ دی گئی۔ ماحول تیزی سے سازگار ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا جلد از جلد کرفیو ختم ہو اور سب کچھ معمول پر آ جائے۔ تیسرے دن چھوٹ کی مدت کچھ اور بڑھ گئی۔ لوگ عجلت میں ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ دکانداروں نے قیمتیں بڑھا دی تھیں مگر احتجاج کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ ڈھیل ختم ہونے سے ذرا پہلے ماحول ایک بار پھر بگڑ گیا۔ خبر اڑی کہ ہندو انتہا پسندوں نے دو مسلمان لڑکوں کو ٹائر کے ساتھ زندہ جلا دیا ہے۔ اس کا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

فوری ردعمل ہونا ہی تھا۔ فائرنگ اور دھماکوں میں بھی تیزی آ گئی۔ پیچھے والی گلی کے کچھ اوباش لڑکے ایک ادھیڑ عمر شخص کو گھسیٹ رہے تھے۔ اس کی کلائی پر بندھا ہوا کلاوا مصیبت بن گیا تھا۔ میں دوستوں کے ساتھ نکڑ پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ چیخوں سے میرا دھیان اس طرف گیا اس کی قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ دوستوں کو لے کر میں اس طرف دوڑا۔ چھری اور ڈنڈے ہاتھوں میں لہرا رہے تھے۔ اتنی دیر میں دو چار اور سنجیدہ لوگ آ گئے تھے۔ سب نے مشکل کر اسے بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑایا مجھے معلوم تھا یہ کام میرے اکیلے کا نہیں تھا۔ وہ شخص خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پتلون میں پیشاب بھی کر دیا تھا۔ میں نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ یقیناً گر گیا ہوتا۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ غسل خانے میں اسے چھوڑ کر بھائی کا کرتہ پاجامہ لا کر دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ نہا کر باہر آیا گھبراہٹ اور خوف اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ گھر کے لوگ اس کی اعانت کر رہے تھے، اس لئے کوئی نئی دشواری سامنے نہ آئی۔ میں نے چائے کا کپ اسے دیتے ہوئے پوچھا۔ ایسے حالات میں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟

"پانچ دن سے میں اپنے کارخانے میں بند تھا"۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہاں آگے میری بیٹی رہتی ہے، اسی کے گھر جا رہا تھا۔ مالک نے بہت روکا تھا مگر......" اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں نے اس کی ہمت بندھائی اور یقین دلایا کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ کل جب کرفیو کھلے گا تو میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔ رونا تو اس نے بند کر دیا مگر چہرے سے لگ رہا تھا کہ میری باتوں کا اسے ذرا بھی یقین نہیں آیا۔

رات دیر تک چاروں طرف سے ہو ہلا سنائی دیتا رہا۔ کافی تعداد میں لوگ گھر کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے جو نہتے تھے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔ جو اسلحہ رکھتے تھے وہ منہ سے کم بول رہے تھے۔

"نعرہ تکبیر...... اللہ اکبر!"

"جے شری، رام جے، بجرنگ بلی! کی آوازیں فضا کو ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلا۔ دھڑام دھڑام کی آوازیں رک رک کر آ رہی تھیں۔ جن لوگوں کو بھڑاس نکالنے کا اطمینان ہو گیا وہ نیچے اترنے لگے۔ ٹھیک ایک گھنٹہ بعد شور پوری طرح تھم گیا۔ گھر میں تمام لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ابھی میرا چھوٹا بھائی گھبرایا ہوا آیا۔

"بھائی جان! شاید وہ آدمی بھاگ گیا"۔

"بنا بتائے، اتنی رات میں؟" میں بڑبڑا رہا تھا پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ تو بند تھا۔ اس کا مطلب چھت سے کود کر بھاگا ہے، چھت تو مگر خاصی اونچی ہے۔ میں خیالوں سے الجھ رہا تھا۔ ٹانگیں بھی ٹوٹ گئی ہوں گی کمبخت کی۔ میں تیزی سے زینے کی طرف گیا۔ گہری اندھیری رات میں وہ شخص اکیلا کھڑا حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

"یہ وقت کے قیدی ضرور آزاد ہوں گے۔ کشمیر بنے گا پاکستان، کشمیر بنے گا پاکستان!"

میں اور میرے بھائی دم بخود اسے دیکھے جا رہے تھے، میرے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر پونچھنا چاہا تو مجھے لگا ہاتھ چپچپا رہا ہے۔ شاید پھوڑا پھوٹ گیا تھا۔ اس کی آواز میں میری آواز شامل ہو گئی تھی۔ آزادی کی یہ آواز ایک آواز نہیں پوری وادی کی آواز ہے۔

❁❁❁

چار دیواری کی دنیا

......اور وہ پاگل ہو گیا

اس نے ماں کے کہنے پر اپنی تیسری بیوی کو بھی طلاق دے دی لیکن یہ صدمہ نہ سہہ سکا۔ اس کی ماں اس کی خوشیوں کی قاتل تھی۔

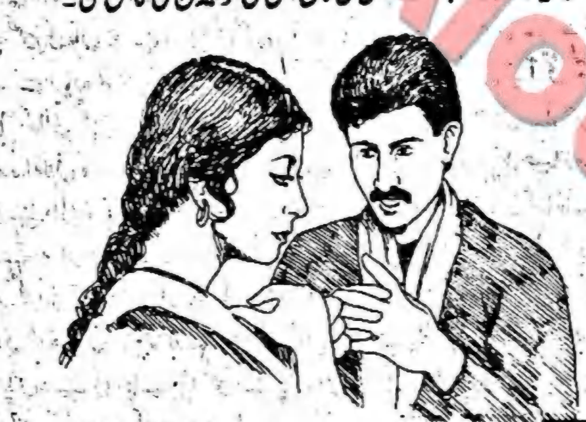

☆ فرزانہ نکہت

"فیضان پاگل ہو گیا ہے۔"

"فیضان کو پاگل خانے داخل کروا دیا گیا ہے۔"

ان خبروں نے خاندان بھر میں بھونچال سا برپا کر دیا۔ جن لوگوں کو حالات کا علم تھا وہ تو زیادہ حیرت زدہ نہ ہوئے لیکن حالات سے ناواقف لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ حیرانی پریشانی، رنج و صدمہ، خوف و دہشت، الجھنوں اور مخمصوں نے اپنی اپنی جگہ سب کو عجیب و غریب کیفیات سے دوچار کر دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، جتنے نفوس اتنے تبصرے۔ واقفان حال اس موقع پر یوں تبصرے کرتے دکھائی دیئے۔

"ارے صاحب یہ تو ہونا ہی تھا، ماں کی دھونس و جبر نے یہ گل کھلا ہی دیا"۔

"یہ انہیں بے جی کی بددعائیں لگی ہیں"۔

فیضان میرا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے والد چچا ظہیر ابا جان کے تایازاد بھائی تھے۔ وہ ایک بڑے سرکاری افسر تھے۔ ان کے والد کی کافی زرعی زمینیں اور جائیداد تھی۔ جو ان کے انتقال کے بعد ان کی تین بیٹیوں اور دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ چچا ظہیر کو جو اپنا حصہ ملا تھا اس سے وہ خاصے خوشحال اور فارغ البال ہو گئے تھے۔ وہ عمر میں ابا جان سے خاصے چھوٹے تھے۔ ان کی شخصیت بڑی شاندار اور پُر وقار تھی۔ ان کی شادی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خاندان سے باہر ہوئی تھی۔ ان کی بیوی آنٹی شمیم بے حد حسین و جمیل اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں جو زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں لیکن بے حد شائستہ اور مہذب انداز اطوار والی خاتون تھیں۔ چچا ظہیر ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کے غلام بے دام بنے رہتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ خوب زن مرید تھے اور اپنی بوڑھی ماں کی بجائے جو انہی کے پاس رہتی تھیں بیوی ہی کی سنتے اور انہی کے طرف دار بنے رہتے تھے۔

چچا ظہیر کی ماں جو بے حد بوڑھی تھیں۔ خاندان میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ بزرگ خاتون تھیں اور "بے جی" کہلاتی تھیں۔ وہ انتہائی نیک اور پرہیزگار بے حد عمدہ اخلاق والی سب سے محبت کرنے سب کو دعائیں دینے والی خاتون تھیں۔ جن کا سب احترام و عزت کرتے اور ان کی خدمت کرنا باعثِ فخر سمجھتے۔ ان کا اپنا گھر گجرات میں تھا۔ وہاں ان کی دو بیوہ بیٹیاں اپنے شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہا کرتی تھیں لیکن وہ ان کے پاس رہنے کی بجائے چچا ظہیر کے پاس اس لئے رہتی تھیں کہ وہ ان کی اولادوں میں سب سے چھوٹے ہونے کے سبب ان کے بے حد لاڈلے اور پیارے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے چچا توقیر بھی لاہور میں رہتے تھے وہ ان کے ہاں ایک دو دن کے لئے چلی جاتی تھیں ورنہ مستقلاً وہ چچا ظہیر ہی کے ہاں رہا کرتی تھیں۔

چچا ظہیر کی بیوی آنٹی شمیم فطرتاً مزاج کی بے حد تیز اور معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا کھڑا کر دینے کی شوقین واقع ہوئی تھیں۔ انہیں شروع ہی سے بے جی کا اپنے ہاں رہنا گراں گزرتا رہا تھا۔ بے جی بڑھاپے و بیماری میں ان کی خدمت کی محتاج تھیں اور یہ فریضہ وہ انتہائی ناگواری اور نفرت بھرے انداز میں انجام دیتی تھیں۔ ان کے لئے پرہیزی خوراک تیار کرنا، ان کی دوائیوں کا خیال رکھنا، ان کی خبر گیری سب ان پر بے حد گراں گزرتا تھا۔ وہ ہر دم منہ پھلائے رکھتیں، بڑبڑاتی رہتیں۔ دبی زبان میں چچا ظہیر کو انہیں بڑے بھائی کے گھر یا گجرات چھوڑ آنے کو کہتیں لیکن چچا ظہیر کو بے جی سے محبت تھی یا پھر لوگوں کی زبانوں کا ڈر، انہیں ٹالتے رہتے۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ چچا ظہیر کے ہاں ایک بیٹی نے جنم لیا۔ بے جی نے پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود اپنی بہو کی بے حد خدمت کی اور اس کا ہر ممکن خیال رکھا لیکن یہ آنٹی شمیم کی فطرت کی کجی تھی اور ناشکرا پن کہ انہوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور ان کے ساتھ ویسا ہی پہلے جیسا رویہ روا رکھا بلکہ اب تو انہوں نے ان کے ساتھ گستاخانہ پیش آنا اور ان کے ساتھ زبان درازی بھی کرنی شروع کر دی اور چچا ظہیر سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ انہیں گجرات یا بڑے بھائی توقیر کے ہاں چھوڑ آئیں ان سے اب ہرگز ان کی خدمتیں نہیں ہوتیں۔ چچا ظہیر بیوی کے غلام بے دام ہی تھے۔ وہ پہلے تو لوگوں کی زبانوں کے خیال سے ایسا کرتے ہوئے ہچکچایا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے بیوی کا خیال رکھنا ہی بہتر سمجھا اور بوڑھی ماں کے آنسوؤں کا لحاظ کئے بغیر اسے سامان سمیت بڑے بھائی کے ہاں چھوڑ آئے جن کی بیوی ہر کسی کے آگے تو اپنی ساس کی بڑی تعریفیں کرتی تھیں لیکن ایک دن بھی انہیں اپنے ہاں رکھنے کی روادار نہ تھیں۔ حالانکہ بے جی ان پر ہرگز کوئی بوجھ نہ بنتیں کہ وہ خود جائیداد والی تھیں۔

ضعیف و ناتواں، دکھی و غمزدہ بے جی صرف تین دن ہی چچا توقیر کے ہاں رہ پائیں کیونکہ چوتھے دن ان کی بیگم نے انہیں سامان سمیت موٹر میں بٹھا کر گجرات بیٹیوں کے پاس بھجوا دیا۔ چچا ظہیر کی طرح چچا توقیر بھی بیوی کے غلام بے دام اور ان سے دب کر رہنے والے

تھے۔ انہوں نے اس پر کوئی احتجاج نہ کیا نہ کچھ بولے۔ یوں بے جی دونوں بیٹوں سے مایوس اپنی بیٹیوں کے پاس گجرات چلی گئیں۔

بے جی سے چھٹکارا پا کر آنٹی شمیم نے خوب پر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ انہوں نے آزادانہ ہر جگہ آنا جانا شروع کر دیا۔ ان کا حلقۂ احباب بڑھتا ہی گیا۔ آئے دن کی دعوتیں، پارٹیاں ان کا معمول بن گئیں۔ اس دوران ان کے ہاں دوسری بیٹی کی پیدائش ہوئی لیکن ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے ٹھاٹ باٹھ میں اضافہ ہوتا گیا۔ امیرانہ طرز رہائش کے ساتھ انہوں نے کار بھی خرید لی جو اس زمانے میں بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ظاہر تھا یہ چچا ظہیر کی سوکھی تنخواہ کا اعجاز ہرگز نہیں تھا۔ بیگم کی اکساہٹوں اور ترغیب نے انہیں آمدنی کے غلط راستے دکھا دیئے تھے۔

پھر دو سال گزرنے کے بعد چچا ظہیر ایک نہایت خوبصورت اور پیارے سے بیٹے کے باپ بن گئے۔ اس کی پیدائش پر بے حد خوشیاں منائی گئیں۔ بڑا دھوم دھامی عقیقہ کیا گیا۔ اس کا نام فیضان رکھا گیا اور بڑے نازو نعم سے اس کی پرورش و پرداخت کی جانے لگی۔ بے جی اس وقت بیمار اور بستر پر تھیں اس لئے باوجود چاہنے کے وہ پوتے کو دیکھنے لاہور نہ جا سکیں۔ انہوں نے جو خواہش کی تھی کہ بیٹا اور بہو انہیں پوتے کو دکھانے گجرات لائیں، وہ بھی پوری نہ ہو سکی اور پوتے کی پیدائش کے مہینہ بھر بعد وہ آغوشِ لحد میں جا سوئیں۔

چچا ظہیر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کی تعلیم پر خاصی توجہ دی۔ ان کی دونوں بیٹیوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی جس کے بعد ان کی شادیاں ہو گئیں۔ فیضان نے ایم کام کیا اور ایک بینک میں اچھے عہدے پر ملازم ہو گیا۔

اب آنٹی شمیم کو اس کی شادی کی فکر ہوئی اور یہیں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔

فیضان چونکہ بے حد وجیہہ و حسین تھا، کماتا بھی اچھا تھا اس لئے آنٹی شمیم چاہتی تھیں کہ اس کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جو حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور فیشن پرست بھی ہو۔ خاندان میں ان کے اس معیار پر پورا اترنے والی کوئی لڑکی موجود نہیں تھی اس لئے انہوں نے خاندان سے باہر نظریں دوڑانی شروع کیں اور بالآخر ایسی ایک لڑکی تلاش کر ہی لی۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایم بی اے تھی۔ حسین بھی تھی اور آزاد خیال اور فیشن ایبل بھی تھی۔ وہ ایک معروف کاروباری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔ آنٹی شمیم اور چچا ظہیر کو یہ رشتہ بے حد پسند آیا۔ ادھر اس لڑکی فریدہ کے گھر والوں کو بھی یہ رشتہ اچھا لگا۔ چنانچہ دھوم دھامی منگنی کے بعد دھوم دھامی شادی ہوئی جس پر سب نے رشک کیا۔

سب کا خیال تھا اب فیضان کا گھر بس گیا ہے، وہ اور اس کی بیوی اب اکٹھے زندگی کے سفر کا آغاز کریں گے۔ ان کی زندگی بھی ہر شادی شدہ جوڑے کی طرح اس طرح گزرے گی کہ ان کے بچے ہوں گے، ذمہ داریاں ہوں گی مستقبل کی فکریں ہوں گی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فیضان کا شمار ایسے بیٹوں میں ہوتا تھا جو اپنی ماؤں کے ایسے زیرِ اثر ہوتے ہیں کہ ان کے پاس اپنی کوئی قوتِ فیصلہ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ جنہوں نے بالکلیہ طور پر اپنے آپ کو اپنی ماؤں کی سپردگی میں دے رکھا ہوتا ہے کہ وہ ان کے بارے میں اپنی مرضی چلائیں، فیصلے کریں اور وہ انہیں بلا چوں و چرا مانتے چلے جائیں۔

چنانچہ شادی کے بعد فیضان اور اس کی بیوی کا گھومنا پھرنا، سیر و تفریح، میل ملاپ شاپنگ و خریداری

WWW.URDUSOFTBOOKS.NET

سب آنٹی شمیم کی مرضی کے تابع ہو گیا تھا۔ ان کی مرضی سے سرِ مو انحراف کی جرأت نہ کبھی چچا ظہیر میں پیدا ہوئی تھی نہ فیضان میں۔ یوں بے چاری فریدہ گویا گھٹن میں مبتلا ہو گئی۔ وہ خود اچھا کماتی تھی۔ اپنے پیسے اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا اختیار رکھتی تھی لیکن آنٹی شمیم نے اس پر بھی پابندی لگا دی کہ ان کی مرضی کے بغیر وہ کہیں پیسے خرچ نہ کرے، کچھ خرچ کرنا ہو تو ان سے پوچھ لیا کرے۔

ایسی پابندیاں عام انسان کے لئے بھی ناقابلِ برداشت ہوا کرتی ہیں۔ پھر یہ فریدہ تھی جو آزاد خیال، آزادی پسند، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کھلے ماحول کی پروردہ تھی۔ اس نے فیضان سے اس کی ماں کے رویے کی شکایتیں شروع کر دیں۔ آنٹی شمیم سے بھی وہ احتجاج کرنے لگی۔ یوں گھر میں آئے دن شکر رنجیاں جنم لینے لگیں جو باقاعدہ لڑائی جھگڑوں کی صورت اختیار کر گئیں۔

پھر ایک دن خاندان والوں نے جو خبر سنی وہ انہیں انگشت بدنداں کرنے کو کافی تھی۔ یعنی فیضان نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، اس لئے کہ اس کا دماغ چل گیا تھا وہ پاگل ہو گئی تھی۔

لوگوں نے چچا ظہیر کو فون کر کے اس خبر کی تصدیق چاہی تو انہوں نے اس کی تصدیق تو ضرور کی مگر مزید کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اور آنٹی شمیم نے فون اٹھانا ہی بند کر دیا بلکہ لوگوں سے میل جول بھی ختم کر دیا۔ فیضان کی یہ شادی بمشکل پانچ ماہ برقرار رہی تھی۔

کچھ عرصہ خاموشی سے گزر گیا۔ پھر آنٹی شمیم کو فیضان کے لئے ایک نئی بیوی کی تلاش ہوئی۔ وہ انہیں اپنے ہی خاندان میں مل گئی وہ ان کی اپنی خالہ زاد بہن آنٹی زریں کی بیٹی شازیہ تھی۔ بی اے پاس، خوبصورت، خوب سیرت، ہنس مکھ خوش اخلاق۔ یہ شادی بھی خاصی دھوم دھام سے ہوئی جس میں تمام خاندان والوں نے شرکت کی۔ سب کا خیال تھا کہ فیضان کی پہلی بیوی کے برعکس جو غیر خاندان سے تھی آنٹی شمیم اس کی نئی بیوی کا جو ان کے اپنے خاندان سے تھی، ضرور لحاظ کریں گی۔ اسے بیٹی سمجھیں گی۔ اس سے محبت کا برتاؤ کریں گی اس کا خیال رکھیں گی۔ مگر یہ بھی سب کی خام خیالی ہی نکلی۔ شازیہ کے ساتھ بھی آنٹی شمیم کی وہی روش رہی جو فریدہ کے ساتھ تھی اور فیضان تو اپنی ماں کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آئے دن کے لڑائی جھگڑوں سے گھر کی فضا مکدر رہنے لگی۔ ساس بہو کے ان جھگڑوں میں چچا ظہیر بالعموم اپنی بیگم کے طرف دار بن جایا کرتے تھے۔ ایک دن دونوں عورتوں کے درمیان جو زنانے کی جنگ ہوئی تو چچا ظہیر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شیشے کی ایک بڑی سی بوتل اٹھا کر اس زور سے شازیہ کے سر پر ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کی چیخ و پکار پر ہمسائے دوڑے ہوئے آئے انہوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً پولیس کو خبر کی۔ جس پر پولیس والے آ کر چچا ظہیر کو اقدامِ قتل کے الزام میں پکڑ کر لے گئے۔ کچھ ہمدردوں نے شازیہ کو ہسپتال پہنچا دیا۔ جہاں اس کے سر میں کئی ٹانکے لگے۔ آنٹی زریں اور ان کے شوہر اس واقعہ کی خبر سن کر ہسپتال جا پہنچے اور شازیہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اب چچا ظہیر پر قاتلانہ حملے کے الزام میں مقدمہ چلنے لگا جو طول کھینچتا گیا۔ چچا ظہیر کو بچانے کے لئے چچا توقیر ان کے بڑے بھائی نے چوٹی کے وکلاء کی خدمات حاصل کیں، خوب روپیہ خرچ کیا اور بالآخر انہیں عدالت سے باعزت بری کروا لیا۔ اس کے ساتھ ہی فیضان کی طرف سے شازیہ کو طلاق نامہ بھجوا دیا گیا۔

خاندان والوں کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ جو کچھ ہوا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کوئی خلافِ توقع بات نہیں تھی۔

کچھ عرصہ گزر گیا۔ اس حادثے کی گرد بیٹھنے لگی، زندگی معمول پر آنے لگی، خاندان تقریبات کی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ان میں چچا ظہیر اور آنٹی شمیم کے ساتھ فیضان بھی کبھی کبھار دیکھنے میں آ جاتا تھا۔ وہ کچھ خاموش اور بجھا بجھا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی زندہ دلی شگفتہ مزاجی سب رخصت ہو چکے تھے۔ وہ کسی سے باتیں کرتے کرتے کچھ کھو سا جاتا، کچھ سوچنے لگتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اکیلے بیٹھے خود کلامی شروع کر دیتا تھا اور غائب دماغ سا دکھائی دیتا تھا۔

آنٹی شمیم اب فیضان کی تیسری شادی کی فکر کرنے لگی تھیں۔ خاندان والے تو انہیں اپنی بیٹیاں دینے کو تیار نہیں تھے اس لئے وہ باہر کوئی مناسب و موزوں رشتہ تلاش کر رہی تھیں جو بالآخر انہیں مل گیا۔ وہ لوگ اچھے خوشحال خاندانی لوگ تھے جو چچا ظہیر کی کالونی میں نئے نئے آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ایک کالج میں پروفیسر تھی اور بے حد خوبصورت خوش اطوار خوش اخلاق تھی۔ یہی آنٹی شمیم کو فیضان کے لئے بھا گئی تھی۔

فیضان کی یہ شادی بھی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ اس موقع پر خاندان کے بزرگوں نے چچا ظہیر اور آنٹی شمیم کو سمجھایا کہ وہ اپنے بیٹے کا گھر بسنے دیں۔ اسے اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی گزارنے دیں۔ اس میں کوئی مداخلت نہ کریں۔ فیضان کی اس شادی کو جب کافی عرصہ گزر گیا اور اس کی طرف سے کوئی خبر نہ اڑی تو خاندان والوں نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو یہ شادی بالآخر بچ ہی گئی۔ شاید چچا ظہیر اور آنٹی شمیم نے بالآخر عقل کے ناخن لے ہی لئے تھے اور اپنے بیٹے کے معاملات سے الگ تھلگ ہو گئے تھے لیکن یہ سب کی بھول تھی۔

آنٹی شمیم کی حاکمانہ طبیعت اور بیٹے اور بہو پر اپنی مرضی ٹھونسنے، ان کے ہر معاملے میں دخل دینے کی عادت نے جلد ہی گھر میں لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان جھگڑوں نے یہاں تک نوبت پہنچا دی کہ فیضان کی بیوی آئے دن روتی دھوتی میکے جا کر بیٹھنے لگی۔ اس کے ماں باپ نے چچا ظہیر اور آنٹی شمیم سے افہام و تفہیم کے ذریعے معاملات سلجھانے کی بے حد کوشش کی لیکن آنٹی شمیم اب ہر قیمت پر فیضان کی اس بیوی سے بھی چھٹکارا چاہتی تھیں۔ یوں یہ شادی بھی

غصہ عقل کو کھا جاتا ہے

ایک جذباتی شخص کسی سے جھگڑ پڑا اور اول فول بکنے لگا۔ مدمقابل نے اسے خوب مارا اور اس کا لباس تار تار کر دیا۔ اس کا یہ حال دیکھا تو ایک دانا شخص نے کہا۔ ”اگر تو عقل سے کام لیتا اور اپنی زبان کو قابو میں رکھتا تو تیرا یہ حال نہ ہوتا۔ تو اگر غنچے کی طرح اپنا منہ بند رکھتا تو پھول کی طرح دریدہ دامن نہ ہوتا“۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کم عقل اور گھبرایا ہوا شخص ہی شیخی بگھارتا اور اس کے نتیجے میں نقصان اٹھاتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ آگ سر تا پا زبان ہی زبان ہے۔ بھڑکتی ہے، چٹختی ہے، لپکتی ہے لیکن پانی کی تھوڑی سی مقدار بھی اسے بجھا دیتی ہے۔ غصہ بہرحال نقصان پہنچانے والی چیز ہے اور کمزوری کی حالت میں غصہ آئے تو وہ تو اور بھی تباہ کرتا ہے۔ یہ اتنی بری چیز ہے کہ قرآن مجید میں اس پر قابو پانے کی تاکید بطور خاص کی گئی ہے۔ (حکایاتِ سعدیؒ)

مرسلہ: محمد زہیر۔ لاہور

بالآخر اپنے انجام کو پہنچی۔ فیضان کی اس بیوی کو بھی طلاق مل گئی۔

اس خبر نے خاندان بھر کو سکتے میں مبتلا کر دیا۔ سب نے آنٹی شمیم اور چچا ظہیر کو بے حد برا بھلا کہا، ان کی مذمت کی کہ یہ کیسے ماں باپ ہیں جو اپنے اکلوتے بیٹے کے یوں دشمن بنے ہوئے تھے کہ اس کا گھر ہی نہ بسنے دے رہے تھے۔ چچا توقیر نے بھی ان کی بے حد مذمت کی اور ان سے میل جول بند کر دیا۔

شنید تھی کہ فیضان کو اپنی اس بیوی سے بے حد محبت تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی، خوب سیرت سلیقہ شعار اور خدمت گزار بھی۔ وہ بے چارہ اس سے شادی کے وقت یہ امید لگا بیٹھا تھا کہ اس کی ماں اپنی اس بہو کی تو ضرور قدر کرے گی اور اس کی زندگی اس کی رفاقت میں اچھی گزر جائے گی لیکن اس کی یہ امید پوری نہ ہو سکی تھی اور اس کی یہ شادی بھی اس کی ماں کے خودغرضانہ مفاد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

اس کے دل کی دنیا اجڑ گئی، زندگی برباد ہو گئی، ماں کے کہنے پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق ضرور دے دی لیکن وہ اس کا صدمہ نہ سہہ سکا۔ یہ دکھ کہ اس کی ماں اس کی ازدواجی زندگی کی قاتل تھی اس کی جان کا روگ بن گیا۔ اس پر پہلے طویل خاموشی کے حملے ہونے لگے پھر اس نے بے معنی اور بے ربط باتیں کرنی شروع کر دیں۔ وہ اکثر راتوں کو گھر سے باہر نکل جاتا تھا اور سڑکوں پر پھرتے ہوئے اونچی آواز میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا دماغ کام کرنا چھوڑنے لگا، اسے کسی کی پہچان بھی نہ رہی، اسے اپنا نام بھی بھول گیا۔ جو کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو جواباً وہ اونچے اونچے قہقہے لگانے لگتا۔ اب تو آنٹی شمیم اور چچا ظہیر کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔ انہیں اب کہیں جا کر ہوش آیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ کیسا ظلم کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے تین مرتبہ اس کی شادی کی تھی اور ایک بار بھی اس کا گھر نہ بسنے دیا تھا۔ وہ اس کے تمام ارمان، مستقبل کے سنہرے خواب، حسین امیدیں سب خاک میں سلاتے رہے تھے۔ وہ حد درجہ سعادت مند اور فرمانبردار بیٹا ان کے ہر ظلم پر خاموش رہا تھا۔ اس کا دکھ اپنے دل میں پالتا رہا تھا۔ حالات کا جبر اور دباؤ خاموشی سے سہتا رہا تھا اور بالآخر حوصلہ ہار گیا تھا۔ انہوں نے پہلے تو فیضان کے بارے میں کڑی رازداری برتنے کی کوشش کی اور چپکے چپکے اس کا علاج معالجہ کرانا شروع کیا لیکن اس کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی ہی چلی گئی۔ چار و ناچار اسے مینٹل ہاسپٹل یا پاگل خانے داخل کروانا پڑا۔

اس واقعہ کو چھ سال گزر چکے ہیں، فیضان کی حالت ویسی ہی ہے جیسا کہ پہلے تھی۔ مینٹل ہاسپٹل کے ڈاکٹر اس کی دماغی صحت کی طرف سے کوئی زیادہ پُرامید نہیں نظر آتے۔ یوں لگتا ہے گویا فیضان کی تمام عمر اب مینٹل ہاسپٹل میں ہی تمام ہو جائے گی۔ چچا توقیر اور آنٹی شمیم وقت سے پہلے ہی بوڑھے دکھائی دینے لگے ہیں۔ اکلوتے جوان بیٹے کا غم اوپر سے ضمیر کی خلش انہیں ہر دم بے چین رکھتے اور رُلاتے رہتے ہیں۔ ستم یہ ہے کہ کسی کو بھی ان سے ہمدردی نہیں۔ ان کی اپنی بیٹیاں بھی ان کے پاس آتی ہیں تو کھلی زبان میں انہیں اپنے بھائی کی خوشیوں کے قاتل کہتی ہیں۔

فیضان کی سابق طلاق یافتہ بیویاں اب اپنے اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہی ہیں اور فیضان؟ کاش کہ آنٹی شمیم بے جی پر ظلم نہ کرتیں۔ ان کی بددعائیں نہ لیتیں یا فیضان کو اپنی بیویوں کے ساتھ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے دیتیں تو یہ المیہ رُونما نہ ہوتا۔

ایک گوہرِ نایاب کی کتھا جسے زر کے پجاریوں نے غلاظت میں پھینک دیا تھا۔

شناخت

میں غلاظت کا ڈھیر ہوں، میرے تمام روپ جھوٹے ہیں۔ میں نہ کسی کی بیوی ہوں نہ محبوبہ، نہ کسی کی ماں نہ بہن۔ میں معاشرے کا ناسور ہوں، زندہ جہنم ہوں، میں فاحشہ ہوں...... مگر سوچو! کس کی بدولت مجھے یہ مقام ملا، کون ہے میرا مجرم؟

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

جگ بیتی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چمپا اپنی مثال آپ تھی، جس میں جوانی جنم پا کر طلوع سحر جیسی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ قدرت نے اسے صباحت کے رنگ میں رنگ ڈالا تھا۔ بازار میں وارد ہوئی تو اہلِ شوق نے اسے صبح کا تارا کہا، زہراء جو جس دم بھی نظر آئے، دلکش دکھائی دیتا ہے مگر صبوحی کش رسما بازار میں ناپید تھے، دلانِ تفتہ کو شبانہ درج ہی سے چارہ تھا۔ چمپا وہیں بجی اور محفلوں میں جگمگانے لگی۔

ہم آگئے تو رونق بازار دیکھنا

کسی نے مصرعہ کہا تو چمپا ہی کو سوچا ہوگا۔ اسے بازار میں لانے والے یہی سمجھتے تھے پھر پرکھ والوں نے ان کی تائید کر دی تھی، ان میں وہ بھی شامل تھے جن کی نگاہیں شعاعوں کا درجہ رکھتی تھیں۔ چاند نکلا تو ہر کسی نے دیکھا، اپنا لیا، بے قرار دلوں نے اسے ہوا کا جھونکا کہا، کچھ کو اندھیرے میں شمع نظر آئی، کئی پروانے دیوانہ وار اس پر دھن لٹانے لگے۔ جن کے لئے انگور کھٹے ٹھہرے وہ کن میں تن کے خواب بنا کرتے، یا نوک قلم عشق کے جام میں ڈبویا کرتے۔ قصیدے چمپا کو ڈاک کے ذریعے مل جائے۔

چمپا کے طفیل اس کے نگہبانوں کے وارے نیارے ہو گئے اور بابا ان کے گھر کی لونڈی نظر آنے لگی۔ انہوں نے واقعی کچرے کے ڈھیر سے سونے کی چڑیا پالی تھی۔ وہ کچرے کا ڈھیر تھی، یا سونے کی چڑیا؟ خیال چمپا کے ذہن میں ابھرا تو اس کے دل پر چھریاں سی چل پڑیں۔

اس نے جھرجھری لی۔ نمو پاتا ہوا تصور اس کی بے لذت انگڑائی میں سسکی کا پیوند بن کر رہ گیا اور ان لوگوں کو بھی دکھائی دینے لگا جو اس سے وابستہ تھے۔ چمپا آہستہ آہستہ اپنے ماضی کی طرف چل پڑی۔ وہ سردار بیگم کو واقعی کوڑے کے ڈھیر سے ملی تھی۔ یہ کذب نہیں تھا۔ کذب ہوتا تو ایک دنیا کذاب کہلانے لگتی۔ سوچ کر اس کا دل بکھر گیا۔ وہ ماں اس کی زندگی میں کبھی نہ لوٹ سکی تھی جس نے اسے جنم دیا مگر غلاظت سمجھ کر رات کی سیاہی میں گند کے انبار پر پھینک دیا تا کہ وہ جانوروں کا کھاجا بن جائے۔ اسے نجاست کے حوالے کرنے والے یہ تک بھول گئے کہ مردہ انسان بھی یوں کتوں کا راتب نہیں بنائے جاتے، وہ تو پھر زندہ تھی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، وہ دنیا کے جھمیلوں میں مقام کھوجنے کے لئے زندہ رہ گئی۔ سوچا کرتی کہ کاش اسے حیوان نگل کھاتے، وہ انسانوں کے جھنجھوڑ لینے سے توبچ جاتی۔

کیا بدکرداری کے چلن سے جنم پانے والی اولاد باکردار ہو سکتی تھی؟ اس نے سوچا تو اسے اپنا وجود بستی کے بدن پر فالتو چھیچھڑوں کی طرح بھائی دینے لگا، جنہیں قصاب ذبح سے علیحدہ نوچ پھینکتے ہیں، مگر ان کے بنا بستی کا وجود مکمل نہیں ہوتا۔

اس کی زندگی بھی عجب ڈھب پر چلی تھی۔ وہ لڑکپن تک یہ نہ سمجھ پائی کہ جس عمارت کی پناہ میں وہ رہتی تھی، کیا وہ اس کا گھر تھا یا وہ پرائے گھر میں مستعار لئے ہوئے چراغ کی صورت فروزاں تھی، سلگ رہی تھی۔ یہی سوچتے، طے کرتے، وہ خودرو جھاڑی کی طرح پروان چڑھ گئی تھی لیکن اتنا ضرور جان گئی کہ وہ اپنے گھر میں پرائی اولاد تھی۔

سردار بیگم نے اسے بھرے محلے کے سامنے اس لئے گود لیا تھا کہ وہ بے اولاد تھی مگر سعی بسیار کے باوجود اپنے خاوند کو لے پالک بچی کی طرف متوجہ نہ کرا سکی بلکہ گھر میں بدمزگیاں شروع ہو گئیں۔ قریشی صاحب حقیقی اولاد چاہتے تھے اور مرد ہونے کے ناطے بانجھ پن کا طعنہ زوجہ کے سر منڈھ دیا کرتے۔ سردار بیگم کے بھائی بدمزاج نہ ہوتے تو قریشی عقدِ ثانی کا بوجھ بھی اٹھا چکے ہوتے۔

چمپا گھر آئی تو انہیں زہر لگی۔ وہ آنکھوں سے منفی جذبوں کا اظہار اچھی طرح جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایسا وطیرہ زبان کے اظہار سے زیادہ مہلک ہوتا ہے، لہٰذا چمپا کو ان کی دو آنکھوں سے صرف حقارت ملی تھی، جسے اس نے قبول کر لیا تھا۔ سوچا کرتی کہ نہ جانے وہ کس جرم کی سزا پا رہی تھی؟

غریب گھرانے میں جو آتا وہ محدود ہوتا اور چمپا کے لئے صرف بچا کھچا بچ پاتا۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھوتے کرنا سیکھ گئی تھی۔ گھر میں نوکرانی کی طرح کام کرتی اور محلے والوں کے اترے ہوئے لباس بھی پہن لیتی۔ عقلمند ٹھہری جو اس نے خیراتی ادارے سے حسب لیاقت تعلیم حاصل کر لی۔ یہ درسگاہ اس کی اتنی ہی پیاس بجھا سکتی تھی۔ وہ مزید پڑھنا چاہتی تھی مگر گھر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں جو کبھی حدوں سے بڑھ کر پراسرار ہو جاتیں۔ پہلے شاید پس پردہ ہوتی ہوں گی مگر اب ایسی مروت کی ضرورت معدوم ہو چکی تھی۔ وہ گفتگو میں شمولیت کی تمنا کرتی تو بولتے لب اچانک خاموش ہو جایا کرتے تھے۔

چمپا سادہ لوح اور مجبور محض تھی، حالات کے سدھار کی صرف توقع کر سکتی تھی۔ پھر بھی کلیاں اس کے من میں کھل اٹھی تھیں، چند ارمان دل میں جاگ پڑے تھے مگر ان کا وجود بہت مبہم تھا۔ ایک روز تنہائی میں اس نے اپنا سراپا بغور دیکھا اور بدن میں آتی تبدیلیوں کا جائزہ لیا، نادر آئینے کے سامنے محوِ حیرت کھڑی رہی، خود کلامی کرتی رہی پھر اپنا دلہن روپ تلاش کیا جو اسے مناسب لگا۔ روپ بہروپ کے کئی ہیولے اس کے دل و ذہن میں پھڑپھڑاتے رہے۔ پندرہ سولہ سالہ دلہن اس نے ابٹن میں اسی نوع کی دیکھی تھیں۔

گھر میں گھٹن کا ماحول نہ ہوتا تو وہ اماں سردار سے بات کر لیتی مگر خوف کے مارے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ یہ بات البتہ وہ جان چکی تھی کہ اماں سردار امید سے تھی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مکاری کی یا پھر یہ کسی مایا کی دمک تھی جو سنبھالے سنبھل نہیں پا رہی تھی۔

"اپنے سدھار جانے کی تیاری کر لو"۔ ایک روز ٹیڑھی مکان کے بیچ لب اس پر پھٹ پڑے۔

یہ تو نوید اماں سردار کی طرف سے نہیں آئی تھی۔ اس میں روکھا پن تھا۔ چمپا کا دل دہل گیا، اسے لگا وہ کچرے کے ڈھیر پر گری پڑی تھی اور بڑا سا ئیل ڈاگ اس پر غرا رہا تھا۔

اگلی صبح مناسب لباس پہنا کر اسے تیار کر دیا گیا۔ ناشتے کے دوران جونہی اس نے چائے پی، اسے متواتر چکر آنے لگے جو تیزی سے ناقابل برداشت ہوتے گئے پھر وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی۔

"لاڈو پیا گھر جانے کو تیار ہے"۔ مردانہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور ذہن میں گونجنے لگی۔

"قریشی صاحب! میں نے اسے گود پالا ہے، اپنی بانہوں میں کھلایا ہے۔ چاہے باسی ٹکڑوں پر ہی پلی ہے مگر یوں جانور بھی گھر رہے تو اس سے بھی انس ہو جاتا ہے"۔ اماں سردار کی آواز چمپا کو کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"حرام وجود گھروں پر نحوست طاری کرتے ہیں، ان کی موجودگی میں نصیب نہیں کھلا کرتے"۔ قریشی صاحب نے منطق پیش کی۔

"ذی روحوں کا رازق آدمی نہیں اللہ ہے۔ یہ لڑکی گھر کو مایا بھم پہنچا کر کوچ کر رہی ہے"۔ یہ آخری صدا تھی جو چمپا نے سنی تھی اور اس کے کانوں پر بار بار ٹکرائی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ بعد ازاں جب بھی ہوش میں آئی، اسے لگا کہ وہ درد آلود سفر میں تھی، کسی گاڑی پر۔ ہلتی جلتی تو اس کے بازو میں ٹیکے کی سوئی گھونپ دی جاتی جس پر وہ ایک بار پھر حواس کھو بیٹھتی۔ بالآخر مشن مکمل ہو گیا اور اسے ہوش میں آنے کی اجازت مل گئی۔

"آپا! اس بار تم واقعی چاند کھوج لائی ہو"۔ حواس میں لوٹی تو اسے مہین سی آواز سنائی دی پھر آوازوں میں شوریدگی بڑھنے لگی۔

"تاروں کے ہجوم میں قمر کا نگینہ، آپا! کہکشاں خوب نکھرے گی"۔ ایک دوسری مہین آواز ابھری، پھر کئی آوازیں باہم گڈمڈ ہونے لگیں۔

"سنہری ہے یا کہ سونا، یہ تو وقت ہی بتائے گا لیکن ناری سونے میں تل کر آئی ہے"۔ آپا مروت نے جواب دیا۔ یہ تیر زبان نکال تو ہوش پاتی لڑکی کے شعور میں کھب گیا۔ اب وہ نئے دور حیات میں آنکھیں کھول چکی تھی۔ اسے گرد دھندلے سایوں کا گروہ دکھائی دیا تو اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس دوران اس سے چند لاشعوری بدنی حرکات بھی سرزد ہوئیں جو بے ربط تھیں۔ اس دم شاید اس کی آوازیں بھی بے صدا تھیں، پھر ایک دلخراش چیخ اس کے حلق سے ابھری جو بظاہر لاشعوری کے عالم میں ظاہر ہوئی تھی مگر اسے اپنی دکھائی دی۔ اس وقت اس کا چہرہ زرد تھا اور بدن کپکپا رہا تھا۔

"سونے میں تل کر آئی ہے"۔ چمپا کے نمو پاتے شعور میں یہ آواز کلبلا رہی تھی جو آخر بے قابو ہو کر طوفانی تھپیڑوں کی طرح اس کے ذہن پر ٹکرانے لگی۔ اب وہ گھٹنوں کے بل فرش سے چپکی ہوئی تھی اور اپنا وجود سنبھال لینے کی سعی کر رہی تھی۔

"میرے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے؟ سمجھ میں نہیں آ رہا"۔ وہ بولی پھر یک دم اس نے خاتون کو پہچان لیا جو اماں سردار کے پاس آیا کرتی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا، رانو! بس میرے اللہ کی دھرتی پر ایک جسم کا سودا ہوا ہے، چند مزید انسان بے ضمیر ہو گئے ہیں"۔ خاتون نے دھیمے لہجے میں کہا پھر بولی۔ "مجھے مروت کہتے ہیں، آپا مروت"۔ یوں اس نے اپنا

تعارف بھی کرا دیا۔ اس کے لہجے میں تاجروں والی اپنائیت تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" چمپا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ قدرے سنبھل کر فرش پر بیٹھ چکی تھی۔

"بازارِ حُسن میں"۔ آپا مروت نے جواب دیا۔ وہ یک دم زہر دینے کی عادی تھی۔ لمحوں کا بوجھ چمپا پر مسلط ہو گیا۔ کئی نظریں اسے اپنے وجود پر مرکوز دکھائی دیں۔ پسینہ اس کے ماتھے پر جھلکنے لگا۔

"میرے اللہ!" اس کے لبوں سے نکلا پھر ناتوانی اس کے بدن پر طاری ہو گئی اور وہ بے ساختہ فرش پر دراز ہو گئی۔

"سمجھ لو کہ تم اپنے مقام پر پہنچ چکیں۔ اب یہی اپنا نصیب جان لو"۔ آپا مروت نے معاملہ نمٹا دیا۔ چمپا کا چہرہ تناؤ میں بگڑ گیا اور وہ کروٹ بدل کر بُری طرح رو پڑی۔ اگلے لمحے جان گئی کہ آہ و زاری اور اشک اس کی تشفی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا صدمہ زیادہ بڑا تھا۔

"اسے پانی پلاؤ"۔ آپا مروت نے قریب کھڑی لڑکیوں سے کہا۔ جس پر لڑکیاں چمپا کے قریب آ گئیں اور اسے سہارا دیا پھر اس سے تشفی آمیز باتیں کرنے لگیں۔ چمپا کا ذہن بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔

"کیا اب میں گناہ بھری زندگی گزاروں گی؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں، شاید"۔ کسی نے اسے جواب دیا۔ چمپا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ اب وہ پوری طرح حواس میں آ چکی تھی۔

"ہم سب جیون کی سزا پا رہے ہیں"۔ ایک بجھی بجھی لڑکی بول پڑی۔ "اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھو"۔ اس نے کہا اور پانی کا گلاس اسے دیا۔ چمپا نے گلاس ایک طرف رکھ دیا۔

"مجھے اغوا کیا گیا ہے، اماں سردار مجھے فروخت نہیں کر سکتی۔ اس نے مجھے پالا پوسا تھا، وہ تو میری حفاظت کیا کرتی تھی"۔ چمپا بے یقینی کے عالم میں بولنے لگی۔ "چچا قریشی کیا ہوئے، کیا مجبوری تھی ان کی، انہوں نے کیوں نہیں بچایا مجھے، وہ کیوں نہیں آئے میرے پیچھے، کس نے باندھ دیئے ان کے ہاتھ؟" اس نے دہائی دی۔ اس کی بے ربط خیالی اور خود فریبی جاری تھی۔

"دولت نے، بٹیا! مایا نے جکڑے ہیں اس کے پاؤں اور ہاں مجھے تم پسند نہ آتیں تو میں تم پر جمع پونجی نہ صرف کرتی"۔ آپا مروت نے صورت حال واضح کی۔

"آپ نے مجھے اتنی بڑی سزا کیوں دی، میرا قصور کیا ہے، آپ کون ہوتی ہیں مجھے خریدنے والی، مجھے نصیب کا لکھا سمجھانے والی؟ آپ کو شرم نہیں آئی انسان کی قیمت لگاتے ہوئے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آدم کی اولاد اس قدر بے حس ہو سکتی ہے"۔ چمپا مسلسل بول رہی تھی۔

"میں ٹیلی فون ملاتی ہوں"۔ مروت نے تحمل سے کہا۔ "تم اپنے گھرانے سے بات کر لو۔ قریشی صاحب میری رقم لوٹا دیں تو میں تمہیں واپس گھر پہنچا سکتی ہوں۔ میں نے ہر رنگ کے لوگ دیکھے ہیں مگر ان جیسا گھٹیا اور لالچی شخص کبھی نہیں دیکھا۔ انہیں سگا بیٹا مل رہا تھا، وہ کچرے سے اٹھائی گئی لڑکی کا جہیز کیوں بناتے؟" یہ بات سن کر چمپا کی سٹی گم ہو گئی۔

آپا مروت نے ٹیلی فون ملایا اور ریسیور چمپا کے ہاتھ پکڑا دیا۔ قریشی صاحب نے فون اٹھایا لیکن چمپا کی آواز پہچان کر رابطہ منقطع کر دیا۔ چمپا سکتے میں آ گئی۔

"میرا دل ڈوب رہا ہے"۔ وہ بے قابو ہو کر رو پڑی، پھر اپنا ہاتھ سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسی کیفیت میں پانی کا گلاس اس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔

"کیا لاکھوں کے کرنسی نوٹ چچا قریشی کو جنت

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں پہنچا دیں گے؟'' وہ چیخ پڑی۔

''لڑکی! تم اپنے پیٹ کے جہنم پر سوچو''۔ آپا مروت جھلا گئی۔

چمپا نے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ اب وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ آپا مروت کرسی پر سے اٹھی اور اس کے پاس بیٹھ کر بظاہر اپنائیت سے اسے بہلانے لگی۔ چمپا اپنا چہرہ اس کی آغوش میں چھپا کر اونچی آواز میں رو پڑی۔

''میں ان حالات میں مر جاؤں گی''۔ وہ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں عہد کرتی ہوں چمپا! کہ حتیٰ الوسع تمہارا ساتھ دوں گی''۔ آپا مروت نے اسے تسلی دی۔ چند دیگر لڑکیاں بھی اشک بہا رہی تھیں۔ آپا مروت نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''لڑکیو! جلدی کرو، شبانہ بزم کی طرف وقت تنگ ہو چکا ہے''۔ اس نے حکم صادر کیا۔ فوراً ہی افراتفری سی مچ گئی۔ کام ہر سُو سرعت سے ہونے لگے۔ وقت بھاری ہو تو بھی آگے چل پڑتا ہے۔ اس کے پہیے میں جکڑے ہوئے اس کے ساتھ لڑھکتے چلے جاتے ہیں۔ وقت کی سواری رینگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

چمپا پر سچائیاں واضح ہونے لگی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ آپا مروت کو اچھی لگی تھی۔ بے شک آپا ہیروں کی پرکھ میں مہارت رکھتی تھی مگر چمپا کے معاملے میں وجوہ اور بھی تھیں۔

''مجھے اس لڑکی کی معصوم اداؤں پر ترس آتا ہے''۔ وہ کہا کرتی۔ ''میں نے اس پر احسان کیا ہے۔ اگر میں اس کی قیمت نہ لگاتی تو اس کی جستجو کرنے والے اور بھی تھے۔ میں اسے ان غلیظ لوگوں سے بچانا چاہتی تھی جو ہوس کے پجاری کہلاتے ہیں اور انسانوں سے حیوانوں والا سلوک رکھتے ہیں''۔

''جب بازار ہی نصیب ٹھہرا تو چہروں سے کون سا فرق پڑ جاتا؟'' ایک روز چمپا نے آہ بھر کر کہہ دیا۔

''راج دلاری! تم نے دنیا نہیں دیکھی''۔ آپا چونک پڑی۔ ''حیوان صفت نوعِ آدم کا ڈسا ہوا موت سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔ تم نے تنگ و تاریک گلیاں نہیں دیکھیں، جہاں حیات سسکتی ہے، انسانیت چیختی ہے، چراغِ زیست کی لو ہر دم پھڑپھڑاتی رہتی ہے''۔

''آپ کے ہاں بھی تو ناریاں مجبورِ محض ہیں؟'' چمپا بحث پر اتر آئی۔

''تم اگر اسے سماج دشمنی کہتی ہو تو یہ عداوت وہ اپنی مرضی سے کرتی ہیں، خود مختار ہیں۔ جب چاہیں اپنا ٹھکانہ بدل سکتی ہیں''۔ آپا مروت نے کہا۔

''زر خریدوں کے لئے تو وہی در وا رہ جاتے ہیں جن کے مکین یا تو اپنے ضمیر کے مجرم ہوتے ہیں یا پھر اپنی بے ضمیری پر فخر کرتے ہیں''۔ چمپا نے رائے دی۔

''تمہیں فروخت کرنے والے کیا چاہتے تھے؟ سوچا تم نے؟ تمہیں اپنانے والے بھی تم سے صرف مایا چاہیں گے۔ قصور محض تمہارے روپ کا ہے۔ نہ تمہاری جوانی نکھرتی نہ قربتی کا ضمیر لالچ کی بھینٹ چڑھتا۔ کسی معاشرے میں جتنے ضمیر بکیں گے اتنی ہی مروتیں جنم لیں گی''۔ آپا مروت نے کہا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنی ذات پر بات کی۔

''کبھی میں بھی بالی عمر رکھتی تھی۔ خوبرو تھی، عوارض پر گلاب کھلا کرتے تھے، مہکا کرتی تھی۔ لب نغمہ بج ہوتے تو سامع نوا کی رعنائیوں میں کھو جاتے۔ اپنے غم میری آغوش میں ڈال دیتے اور میری کایا میں سکون پانے کی جستجو کرتے۔ ان موقعوں پر میں اپنا کھیل کھیلتی۔ مجھے جیبیں خالی کرانے کا ڈھنگ سکھایا گیا تھا۔ یہی معاشروں کا دستور ہے۔ قیمت لگانے کا ہنر آنا چاہئے۔

چاہے یہ اپنی ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے عوضانے میں پورے ماہ کی آدمی تنخواہ ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے اس سے کسی غریب کا نوالہ ہی کیوں نہ چھن جائے۔ جان لو کہ ہوس بے لگام ہو جائے تو اس کے پجاریوں کو اولاد بھی بھول جاتی ہے۔ کسی حقدار کا نوالہ اپنے منہ میں ڈال لینا ہی 'مروت' کی کامیابی ہے''۔ آپا مروت نے چمپا کو سمجھاتے ہوئے بتایا۔

''مگر یہ گورکھ دھندے میرے ضمیر کے خلاف ہیں''۔ چمپا نے احتجاج کیا۔ مروت ہنس پڑی، پھیکی سی ہنسی پھر بولی۔

''بنو! تم نا سمجھ ہو، یہ دنیا مجبور کر کے مارتی ہے۔ یہاں ضمیر کچل دیئے جاتے ہیں۔ کسی 'مروت' کے رخساروں پر سرخی دھندلانے لگتی ہے تو ایک دوسری 'مروت' جنم لیتی ہے اور نمو پاتی ہے۔ نسلیں ایک دوسری کا خون چوستی ہیں۔ یوں ازمنہ اور ادوار میں 'مروتوں' کے سلسلے مرتب ہوتے ہیں جو معاشرتی تاریخ میں گمنام ہو کر فنا ہو جاتے ہیں''۔ آپا مروت نے مزید کہا۔ ''وقت اسی وقت تک لڑکی کی گرفت میں رہتا ہے جب تک اس کے عوارض پر مہک رہتی ہے۔ بعد ازاں وہ کسی چھکڑے میں بے جان لاش کی طرح پڑی رہتی ہے جسے کوئی دوسری لڑکی کھینچنے لگتی ہے''۔

''کیا کسی طور مجھے معاشرے میں باعزت مقام مل سکتا ہے؟'' چمپا نے استفسار کیا۔ ''کسی کے طفیل، کسی کے صدقے؟'' سوال آپا مروت کے دل پر تیر کی طرح لگا۔ وہ بھی مسوس کر رہ گئی، چمپا کے لفظوں نے اس کے احساسات پر ایک ضرب اور لگا دی تھی، جس پر ایک دوہری کہانی مروت کے چہرے پر کندہ ہو گئی۔

''کوئی تن دکھی، کوئی من دکھی، دکھی سارا سنسار''۔ وہ بولی۔ ''تمنائیں اور حسرتیں دل میں پالتے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی کسی کی آگ میں نہیں گرتا۔ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو اپنی راہِ حیات میں جو بھی سنگِ میل نظر آتے ہیں وہ سب دکھوں کے انبار ہیں، لہو میں لتھڑے ہوئے، شکوے ہیں، التجائیں ہیں اور مجبوریاں''۔ آپا مروت رو پڑی، آنسو اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے۔ ''گھوڑا گھاس سے آشنائی کرے تو بھوکا مرے''۔ اس نے چمپا کو جواب دیا۔

''میں تاریخ بدل سکتی ہوں آپا!'' چمپا نے التجا کی۔ ''آپ مجھے تعلیم دلوا دیں، میں ملازمت کر لوں گی۔ آپ عمر بھر میرے ساتھ رہیں، میری مدد کریں، میں آپ کو یاس نہیں دوں گی''۔

''مجھے پیشے کی غلامی میں ہی اپنی عافیت نظر آتی ہے۔ تیون (سالن) بن نہ روٹی سوہے، گوندھے بن نہ چوٹی سوہے''۔ آپا مروت نے حتمی بات کی۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ یہی بتاتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ کوٹھے کی لڑکیاں درس گاہوں میں قدم نہیں رکھ سکتیں۔ انہیں وہی لوگ مقام نہیں دے پاتے جو سروں پر کتابوں کی گٹھڑیاں لادے پھرتے ہیں۔

چمپا کا اصرار بڑھا تو آپا مروت نے اس کے لئے اتالیق ڈھونڈ لئے۔ دو اساتذہ اسے صبح کے وقت میٹرک کے مضامین پڑھاتے جبکہ تین اساتذہ اسے رات گئے تک رقص و موسیقی کی تعلیم دیا کرتے۔ رقص اور طبلے میں خصوصاً اس کی دلچسپی زیادہ تھی۔ چمپا مذہبی علوم میں بھی شد بد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آپا مروت نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کر دی مگر بہ حالتِ مجبوری۔

''کہیں سیتا نہ بن جانا''۔ وہ کہتی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑا کرتی۔

ترنگ میں گزرے یا تیر تنگ میں، وقت نہیں رکتا، ہر رنگ میں گزرتا ہے اور ہر کایوں کو اپنے آہنگ میں ڈھال دیتا ہے۔ نمو پائی حیات میں شعور بھی لاتا ہے۔

WWW.AURDUBOOKS.NET

حوادث نے دو چار کرتا ہے تو زخموں پر مرہم بھی رکھ دیتا ہے۔ چمپا نے پانچ برس شدہ شدہ رنگ و آہنگ کی مدھر سُروں میں گزار دیئے، بازار میں قیامت کا روپ دکھنے لگی۔ ہجولیاں اس پر رشک کرنے لگیں۔ دیکھنے والوں نے اسے القاب سے موسوم کر دیا۔ تعلیم اور رکھ رکھاؤ نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ اب وہ ایف اے پاس لڑکی تھی، نازک اندام مگر صاعقہ۔

آپا مروت جانتی تھی کہ نہ تو بازار حسن روایتی طور پر آباد رہے تھے اور نہ ہی شوقین مزاج وہاں مجروں کے دلدادہ نظر آتے تھے بلکہ جدید ٹیکنالوجی نے ان محلوں کے رسوم و رواج بدل ڈالے تھے۔ ہر قسم کا جنسی اشتہاری مواد اب انٹرنیٹ کی زینت بن چکا تھا اور متعلقہ معاملات سیل فونز پر ہی طے ہو جاتے تھے۔ آپا مروت کا فلیٹ پرانے بازار کی بیرونی حدود پر واقع تھا جس کے نیچے کشادہ اور بارونق دکانیں ایستادہ تھیں۔ اس کے ہاں روایتی محفلیں کبھی کبھار برپا ہوا کرتی تھیں مگر ان کے لئے مواقع متعین کئے جاتے تھے۔ عموماً رقاصہ ہی کو وسیع و عریض کوٹھیوں میں بلا لیا جاتا تھا جن کے خوبصورت لان حاضرین سے بھرے ہوتے تھے۔

آپا مروت وہاں نغمہ سرائی کیا کرتی تھی جبکہ چمپا محدود وقت کے لئے رقص کر لیا کرتی۔ ماحول جیسا بھی ہوتا دونوں کو معیار سے گرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے فن کا عوضانہ ضرور وصول کرتیں مگر زمین پر گری ہوئی نقدی وہیں چھوڑ دیتی تھیں۔ کبھی کوئی سازندہ یہ رقم اٹھا لے تو وہ معترض نہیں ہوتی تھیں۔

آپا مروت کے اسیر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان کے ہمراہ دوسرے شہروں میں بھی چلی جایا کرتی تھی۔ اس کے کئی تعلق دار اس کے سامنے ہی معتبر ہوئے تھے اور ان کی لغزشوں کی تاریخ آپا مروت کی کتاب زیست میں کندہ تھی۔ وہ ان کی ازدواج سے بھی غائبانہ تعارف رکھتی تھی۔

چمپا اپنی مہربان آپا کی تمام باتیں مان لینے کو تیار رہتی تھی مگر اسے اپنے کال گرل بنائے جانے پر شدید اعتراض تھا۔ اتنا ہی جتنا آپا مروت کو اس کے اسلامیات پڑھنے پر۔ دونوں ہر پہلو ایک دوسرے کی ضرورت تھیں، پھر بھی اک دوجے کو مخالف سمتوں میں کھینچ رہی تھیں۔

''مجھے گانے بجانے سے کوئی انکار نہیں، رقص بھی کرلوں گی مگر اپنی متعین کردہ حدود سے تجاوز نہیں کروں گی''۔ چمپا برملا کہہ دیا کرتی جبکہ یہ کلمات سن کر آپا مروت کا دل مندا ہو جاتا اور چہرے پر یاس چھا جاتی۔

''محض شرتی آنکھوں کی مدح سرائی کرانے سے گزارہ نہیں ہوتا''۔ وہ شربت کے سے گھونٹ پی کر کہتی۔ تب تلخی کی جھلک اس کے نقوش میں ابھر آتی۔

''کچھ عرصے سے تمہارا رقص بھی سدا سہاگن درویشوں جیسا دکھائی دینے لگا ہے۔ جان لو کہ ملبوس کا اصل سلیقہ اس کے اختصار میں ہے''۔ وہ کہتی۔ اس نے چمپا کے لئے متفرق لباس ڈیزائن بھی کئے تھے مگر وہ انہیں مرغوب نہیں جانتی تھی۔ آپا مروت برملا کہہ دیتی۔ ''میں ڈرتی ہوں کہ کل زمانہ ہمیں دیکھے تو یوں نہ کہے کہ سارس کی جوڑی، ایک اندھا، ایک کوڑی''۔ اس قسم کی تنقید سن کر چمپا کے دل پر گھونسا پڑتا۔

''ٹھیک ہے، کل میں دلہن بن کر آپ کے پہلو میں چلوں گی اور آپ کو دلق پوش بھی نظر نہیں آؤں گی''۔ چمپا چڑ کر جواب دیتی۔ ''ویسے میں دلی میں رہ کر بھاڑ نہیں جھونک رہی''۔ وہ منہ پر کہہ دیتی۔

کتنا انہونی سی دکھائی دے مگر پھول کھل کر مہکیں اور بھنورے ان پر طواف نہ کریں۔ ویسے بھی آپا مروت کے چاہنے والے اب تبدیلی کے طلبگار تھے۔ آپا خود بھی جانتی تھی کہ اس کے لمس میں حدت باقی نہیں رہی تھی اور پروانے اسی شمع کے گرد منڈلاتے ہیں، جس کی لو میں توانائی ہو، پھر ایک نئی پود پل کر جوان ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

سمیر احمد بھی باپ کے نقش قدم پر چل نکلا تھا۔ خاندانوں کی اپنی قدریں ہوتی ہیں، یا تربیت کاروں کی اخلاقی کوتاہیاں، جو کمزوریاں اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی جاتی ہیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ باپ شوقین مزاج ہو تو بیٹے کو نشہ کرنے سے نہیں روک پاتا اور مایا کی فراوانی اخلاقی گراوٹ کو ہوا دینے لگتی ہے۔ سمیر کا باپ عمر بھر آپا مروت پر دولت نچھاور کرتا رہا تھا۔ اب اس کے لخت جگر کی باری تھی جسے چمپا نے گھائل کر دیا تھا۔ چمپا کو بھی وہ اچھا لگا تھا کیونکہ وہ عمومی بگڑے ہوئے لنگاروں سے مختلف تھا۔ دونوں کے بیچ بارہا نظروں کا تبادلہ ہوا تھا، پھر بات چیت بھی شروع ہو گئی۔

وہ ایک سلونی سی شام تھی جو شب کی اور کھنچ رہی تھی۔ سمیر اور چمپا ایک پارک میں ملے۔ الگ تھلگ کونے میں بینچ پر بیٹھ کر چمپا نے سمیر کو اپنی جیون کہانی سنائی۔ سمیر نے واقعات سنے تو اس کے چہرے پر حیرت نقش ہو گئی۔

''یقین نہیں آتا''۔ وہ بولا۔ رسماً پھر ساتھ نبھانے کی یقین دہانیاں کرائی جانے لگیں۔ جب تک پورا چاند نکلا گفتگو سنجیدگی کی نہج پر پہنچ چکی تھی۔

''میری تمنائیں بھی تو قابل یقین نہیں ہیں''۔ چمپا نے کہا۔

''جان پاؤں تو کوئی رائے دوں گا''۔

''ہر انسان کے خواب ہوا کرتے ہیں''۔

''اپنے خوابوں کی نوعیت بتاؤ''۔

''اوپر چاند دیکھا آپ نے؟''

''اس کا دوسرا روپ مقابل آشکار ہے''۔

''آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟''

''تمہارے تصور سے بھی زیادہ''۔

''میں کسی کے آنگن میں چاند بن کر سجنا چاہتی ہوں، ایسے بندھن میں جس کو کبھی اندیشہ زوال نہ ہو''۔ بات سن کر سمیر چونک اٹھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ حیرت کا رنگ اس کے چہرے پر عود کر آیا جو تغیر کی صورت ماتھے کی شکنوں میں آشکار ہو گیا۔ وہ خاموش رہا۔ چمپا نے اس کے جذبوں کو مضطرب کر دیا تھا۔ جلد ہی خوف کے سائے دونوں کے چہروں پر لرزنے لگے۔

''میں دنیا کے سب سے شیر دل شخص کی تلاش میں ہوں جو مجھ جیسی کمتر کو اپنی پناہ دے سکے اور طوائف کی اس بیٹی کو گھر کی عزت بنا سکے، بجائے زینت بنانے کے''۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ آپا مروت تم پر کرم کرے گی اور تمہیں رہائی عطا کر دے گی؟''

''پہلے بھی زرخرید ہوں۔ کئی بار بک سکتی ہوں۔ ظاہر ہے، مجھے یہاں سے وہی نجات دلائے گا جو مجھ سے الفت رکھتا ہو گا''۔

''محلوں میں جھک مارنے والے بیشتر شادی شدہ ہوتے ہیں، جن کے آنگن پہلے ہی آباد ہوتے ہیں''۔

''اپنے چاند کو گرہن لگانے سے حاصل؟''

اگلے روز سمیر آپا مروت سے ہمکلام تھا۔

''آپ کی جانشین بائیس سالہ حسینہ نے چہرے پر بانکی سی نتھ سجا رکھی ہے۔ جسے عموماً آٹھ نو سال کی بچیاں بھی بار خیال کرتی ہیں۔ آپ کی مہ لقاء آخر کب جوبن پر آئے گی؟'' اس نے آپا مروت سے پوچھا۔

''میری ہی کمزوری ہے سمیر! اس کے لئے دل میں نرم گوشہ نہ ہوتا تو بھلا اس کی کیا مجال تھی کہ سیتا پری بن کر مجھ پر حکومت کرتی۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے نتھ بہت پیاری ہے، رقص میں اپنی تال میل کی

WWW.PAKURDUBOOKS.NET

طرح۔ جیسے وہ تال میل میں فالتو قدم نہیں اٹھانا چاہتی، اسی طرح اس نے سنہری لوازمات میں بھی اپنی حدیں مقرر کر رہی ہیں"۔

"تو گویا وہ زیورات بدلنا نہیں چاہتی؟"

"آپ عنایت کریں گے تو کیوں نہیں بدلے گی؟"

"حکم ہو تو جسارت کر لوں؟"

"جسارت مایا کا دوسرا نام ہے۔ زیورات انمول ہوئے تو پرانی تھکلی ضرور اتر جائے گی"۔

"آپ قدر شناس ہیں تو میں بھی کم نہیں"۔

"پھر جھگڑا کیسا، نہ ہڑ بڑ نہ کھڑ کھڑ"۔

"چند روز بعد میں کچھ مدت کے لئے بیرون ملک جانا چاہتا ہوں، چمپا کو اپنے ہمراہ رکھ سکتا ہوں۔ یوں میرے ہمرکاب رہے گی تو آپ کو مالا مال کرتی رہے گی"۔

"آپ کے خاندان پر ہم بھروسہ کر سکتے ہیں"۔

اسی دن چمپا اور آپا مروت کے بیچ سرد جنگ فساد کی گہری خلیج میں تبدیل ہو گئی۔

"میں زیورات نہیں چاہتی۔ رقص سے ہر کسی کو لبھا سکتی ہوں، اس سے زیادہ بالکل نہیں کر پاؤں گی"۔

"ناک چوٹی کا ڈر دل سے نکال دو، تمہیں میری جگہ لینی پڑے گی، ورنہ ہم محتاج ہو جائیں گے"۔

"سچ سچ بتائیں، کیا میں آپ کی بیٹی ہوں یا سونے کی چڑیا؟"

"سونے کی چڑیا بنو گی تو بیٹی بھی بنی جاؤ گی ورنہ......"

"ورنہ کیا؟"

"ناک مت پھلاؤ، میں تمہیں بنوں خان کے ہاتھ فروخت کر دوں گی، وہ تمہیں علاقہ غیر لے جائے گا اور ایسی صورت پیدا کرے گا کہ ہوس گیر تمہیں زندہ لاش جان کر بھنبھوڑ دیں گے اور تم موت کو بھی ترسنے لگو گی"۔

بنوں خان گوشت کا بڑا تاجر تھا اور اس ناطے حد درجہ سفاک جانا جاتا تھا۔ غصیلے لہجے میں دھمکی سن کر چمپا کا بدن لرز گیا۔ وہ بری طرح رو پڑی اور اجل کو صدائیں دیتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ رات اس پر بہت بھاری تھی، اس شمع کی مانند، جسے طوفان باد میں رکھ دیا گیا ہو۔ وہ شب بھر روتی رہی، بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ بے بسی میں چیختی رہی۔

دن چڑھے سمیر پہنچا تو چمپا کا چہرہ ستا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں لال سرخ تھیں، وہ پژمردہ دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ماجرا ہوا؟ ماتمی چہرہ بنانے کی وجہ؟ مجھے کیوں بلایا ہے؟" سمیر نے یوں پوچھا جیسے معاملہ پہلے ہی جانتا تھا۔

"جس طوفان کا خدشہ تھا، وہ آ چکا"۔ چمپا کے ہونٹ لرزنے لگے اور آنکھوں میں اشک امڈ آئے۔ اس نے سر جھکا لیا۔

"آخر تمہیں اپنی آپا کی جگہ لینا تھی"۔

"میری آپا، یعنی تمہاری اماں مروت...... بولو، کیا ایسا نہیں؟"

"میں تمہاری حقارت کی وجہ جان سکتا ہوں"۔

"دیکھیں سمیر! کسی ماں نے مجھے غلاظت کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا تاکہ میں درندوں کا کھاجا بن جاؤں۔ بدقسمت رہی، جو زندہ بچ گئی۔ اب جس گندگی کی طرف دھکیلی جا رہی ہوں، وہاں بدن زندہ لاشوں کی ہیئت پا لیتے ہیں۔ ان کی روحوں سے تعفن اٹھنے لگتا ہے۔ ان لاشوں کو درندے نہیں، انسان بھنبھوڑتے ہیں۔ ان قدردانوں کو ہجولیاں بھیڑیے کہا کرتی ہیں"۔

"دکھائی دیتا ہے کہ آپا مروت مزید انتظار نہیں کرنا چاہتی"۔

"زورق حیات (زندگی کی ناؤ) کے ناخدا گر خدا بن جائیں تو زندگی داؤ پر لگ جاتی ہے"۔ چمپا سسکیاں بھرنے لگی۔

"ہوا کیا ہے؟ مجھے تفصیل بتا دو"۔

"آپا مروت بیوپاری بن چکی ہیں۔ میری اکائی کے سودے کر رہی ہیں۔ بے اصولی ان کی زندگی کا اصول بن چکا ہے۔ اندازہ کریں سمیر! وہ میرے بندھن کا وعدہ کئی افراد سے کر چکی ہیں"۔ بات سن کر سمیر کا رنگ فق ہو گیا۔ چمپا بولتی رہی۔ "یہ سلسلہ پچھلے چند ہفتوں سے جاری ہے۔ میں نے اندھیر نگریوں کے کرتا دھرتا یہاں دیکھے ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے بھی ملوایا گیا جن کے اطوار سے گوشت کی سڑاند اٹھتی ہے"۔

"دوسرے لفظوں میں آپا مروت تمہاری فروخت تک پر آمادہ ہو چکی ہیں"۔

"ایک رقاصہ یہاں کئی بار آئی، مجھے اپنے ڈانس کلب میں ذمہ داری دینا چاہتی تھی مگر آپا مروت میرے عوض لکشمی کے انبار چاہتی ہیں"۔

"لگتا ہے کہ وہ تمہیں اپنا ورثہ عطا کر کے چھوڑیں گی"۔

"انہیں میری بہبود سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نے پچھلے رمضان میں بہت عبادت کی تھی۔ اپنے لئے دعائیں کیں مگر شاید میری آزمائشیں ابھی باقی ہیں۔ آپ چاہیں تو مجھے بچا سکتے ہیں۔ آپا مروت کو ڈھیر ساری دولت دے دیں اور میرے ساتھ بندھن باندھ لیں۔ بعدازاں بے شک مجھے آزاد کر دیں۔ میں وقتی طور پر عذاب اور برائی سے بچ جاؤں گی"۔ چمپا نے التجا کی۔

نہ صبر در دل عاشق، نہ آب در غربال

سمیر نے معاملہ فہمی سے کام لیا اور بغیر تاخیر کئے آپا مروت کو رام کر لیا۔ وہ اپنی بے پایاں مایا کی بدولت اس کے معاملات طے کر سکتا تھا۔ نکاح کا معاملہ بھی زیر غور آیا۔ آپا مروت سمیر پر بھروسہ رکھتی تھی، لہٰذا بادل نخواستہ منصوبے پر متفق ہو گئی۔ سمیر طویل مدت چمپا کو ہمراہ رکھنا چاہتا تھا جسے ہر کوئی اپنے ہی مفاد میں سمجھ رہا تھا۔ آپا مروت کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

معاشرتی رسومات انسانی اذہان کی اختراعیں ہیں، جو قلوب کو ملانے کا باعث بھی بنتی ہیں۔ چمپا کا سنجوگ بظاہر سوانگ تھا مگر شان میں کسی طور کم نہیں تھا۔ سمیر نے اس کے لئے خصوصی پوشاک بھجوائی تھی اور اسے سونے سے مالا مال کر دیا تھا۔ ہجولیوں نے اسے دلہن بنایا، اس کا بناؤ سنگھار کیا، پھر اسے پھولوں سے سجا دیا۔ رخصتی سے پہلے بزم رقص و موسیقی منعقد کی گئی۔ اس بیچ ضیافت کا دور بھی آیا، جو سمیر کے ذوق و شوق کی عکاسی کرتا تھا۔ اس تقریب کے باوجود وہ اپنا بندھن خفیہ رکھنے کا بندوبست کر چکا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ شادی شدہ عاشق تھا اور اس ناطے "ہزار آفتیں تھیں، ایک دل لگانے میں"۔

☆......☆......☆

چمپا چند روز ایک ہوٹل میں مقیم رہی، پھر آپا مروت کے پاس واپس آ گئی۔ بیرون ملک سفر کے لئے سمیر نے اس کے کاغذات مکمل کرائے۔ ملائشیا میں ایک نیا انٹرنیشنل ہوٹل بنا تھا، جسے آپریٹ کرانے کا ٹھیکہ سمیر کی فرم نے حاصل کیا تھا۔

چمپا سمجھا کرتی کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا تھا اور ایسا تھا بھی۔

ملائشیا میں قیام کا آغاز اس کی زندگی کا بہترین دور تھا، اتنا خوش آئند کہ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سمیر کے پاس پیسہ اتنا تھا کہ سمیٹے نہیں سمٹتا تھا، پھر وہ سیر و سیاحت کا شوقین بھی تھا۔ مزاجاً عیاش واقع ہوا تھا۔ دولت مقامی لڑکیوں پر بھی لٹا دیتا۔ شباب کے ساتھ

شراب کا بھی رسیا تھا۔ بظاہر وہ چمپا کو دل و جان سے چاہتا تھا۔

میل کے شوخ رنگ اترے تو وہ دور شروع ہو گیا جب چمپا پریشان رہنے لگی۔ وسوسے اسے ستانے لگے۔ ''جس شخص کے ساتھ میں جی رہی ہوں وہ تو کسی اور کی امانت ہے۔ یہ خوشیاں اور آسائشیں کسی دوسرے کا حصہ ہیں''۔ وہ سوچتی۔ ''میں نے کسی بے گناہ کے نصیب میں نقب زنی کی ہے۔ میں کس قدر گنہگار ہوں، جو کسی دوسرے کا رزق کھا رہی ہوں۔ مانگے کی محبت کا کیا بھروسہ، جس کی بنیادیں پکی زمین پر استوار نہ ہوں؟ کوئی متلون مزاج شخص کے ساتھ کتنا چل سکتا ہے؟ احمق ہوں، جو ہوا میں پاؤں اٹھائے کھڑی ہوں اور خوش بھی ہوں''۔ سوال اس کے ذہن میں ابھرتے روز وجود میں کلبلانے لگتے تو وہ بے چین ہو جاتی۔

کبھی اس کی کوئی ہمجولی اس کے تصور میں آتی اور بولنے لگتی۔ اسے اس کی اوقات یاد دلانے لگتی۔ اسے وہ باتیں ستانے لگتیں جو اس کی ہمجولیاں اپنی ''ستائش'' کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔ کہلانے کو تو میں بازار حسن کی شہزادی ہوں، مگر ہوں کیا؟ بے حیا عورت یا چالاک رنڈی، غیرت فروش۔ میری روح نے تو اس جسم کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے جو کسی ایک شخص کی کہانی میں ہے۔ میری ہستی پر ہر کوئی اپنی کتھا لکھ سکتا ہے۔ میں کئی اشخاص کی داستانوں کا مجموعہ ہوں، داستانیں، جو ہر نئے آنے والے کے لئے بے معنی ہیں۔ میری سسکیاں میری چیخیں، سب بے معنی ہیں۔ میں ایسی کتاب ہوں جسے کوئی پڑھنا نہیں چاہتا بلکہ ہر روز اس کا نیا صفحہ کھلتا ہے، خوشنما اور سادہ پھر اس پر آڑھی ترچھی لکیریں تحریر ہو جاتی ہیں۔ میں ایک تماشہ ہوں، میری بے سکونیاں اور علالتیں، سب بے معنی ہیں۔ مجھے ہمدردی سے بلانا، میرا خیال رکھنا اور مجھے انسان سمجھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں غلاظت کا ڈھیر ہوں۔ میرے تمام روپ جھوٹے ہیں۔ نہ میں کسی کی بیوی ہوں، نہ دوست، نہ محبوبہ، میرے تمام رشتے جعلی ہیں۔ میری اولاد کے بھی۔ اس ناطے میں ایک جالور ہوں، مجھے مقام سے گری ہوئی عورت کہہ سکتے ہیں۔ میں معاشرے کا ناسور ہوں، زندہ جہنم ہوں اور ایندھن ہوں، بھڑکتی ہوئی آگ کا۔ میں فاحشہ ہوں، مگر سوچو، غور کرو، کس کی بدولت ملا مجھے یہ مقام؟ کون ہے میرا مجرم؟'' کئی تلخ سوچیں چمپا کے ذہن میں جنم لیتیں اور اسے خون کے آنسو رلانے لگتیں مگر وہ راہِ حیات پر مجبورِ محض تھی، آہیں اور سسکیاں بھرتے ہوئے۔ وقت کے پہیئے کے ساتھ لڑھکتی رہی۔

نشیلی سی شام تھی۔ چمپا اور سمیر دیر تک سمندر کے کنارے چہل قدمی کرتے رہے پھر قریبی ریسٹوران چلے گئے۔ مقامی لوگ جس کے پُرمزہ کھانوں کے گن گاتے تھے۔ جیب میں پیسہ ہو تو ان جگہوں کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ سبزہ زار کی کشادگی انسانی ہجوم کا پتہ دیتی تھی۔ افراد خشکی کے آخر تک پھیل گئے تھے۔ کئی بجروں پر سمندر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ چمپا اور سمیر نے سی فوڈ کا انتخاب کیا۔ اسی بیچ پورا چاند فلک پر ابھر آیا اور سمندر کا سکوت مدوجزر میں ڈھلنے لگا۔ لہریں تلاطم خیز ہوئیں تو قلوب پر بھی ولولہ چھانے لگا۔ ایسے میں نسیم بحر نے اپنے لمس سے انسانی جسم گرما دیئے اور پیار کرنے والے اظہار کے اطوار تلاش کرنے لگے۔ چمپا اور سمیر کے بیچ ایک دوسرا معاملہ الجھ گیا۔

''مجھے بچے بہت پیارے لگتے ہیں''۔ چمپا نے نرم لہجے میں کہا اور پھر سمیر کی طرف کنکھیوں سے تاکتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سمیر کے بدن میں لرزش پیدا ہوئی جو ناگوار احساس میں ڈھل گئی جیسے کسی کنکھجورے نے اسے نرمی سے ڈس لیا تھا۔ اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اب تلخیاں اس کے دل میں سرایت کر

رہی تھیں، یک دم سختی اس کے چہرے پر نمودار ہو گئی۔ اسے چمپا کا ساتھ بوجھ دکھنے لگا۔ پل بھر میں وہ چمپا کی ہمراہی سے اکتا چکا تھا۔ سمندر کا مدوجزر اس کے اپنے قلب میں تلاطم خیز ہو چکا تھا۔

گھر کی طرف واپسی کا سفر چمپا پر بھاری بوجھ بن گیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے سمیر پر خاموشی طاری تھی۔ اس کے نقوش میں کرختگی اب منجمد ہو چکی تھی۔ دکھتا تھا کہ اس کے وجود میں طوفان بڑھ رہے تھے اور اپنی سوچوں کی کشمکش اسے بے چین کر رہی تھی۔ ذہنی ارتکاز میں اسے دقت کا سامنا تھا۔ گاڑی بارہا اس کی گرفت سے نکلتی دکھائی دی۔ چمپا اس کے پہلو میں سہم گئی تھی، نقش تماشہ رہی۔ سوچا کہ اس نے بحرِ حیات کے سکون میں پتھر دے مارا تھا۔

''مجھے ہر شخص کو اس کے مقام پر رکھنا چاہئے''۔ سمیر نے بالآخر تبصرہ کیا۔

سفر تمام ہوا تو چمپا گھر کے اندر چلی گئی مگر سمیر سبزہ زار پر ٹہلتا رہا۔ کبھی اس کی بے چینی بہت بڑھ جاتی۔ چمپا نے کئی بار کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سمیر اسے متواتر سوچوں میں غرق دکھائی دیا۔ شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ رات گئے اس نے چمپا سے بات کی۔

''تذبذب میں ہوں، کہوں کہ نہ کہوں، مگر بغیر کہے چارہ بھی نہیں''۔ اس نے کہا۔ چمپا خاموش رہی۔

''تشنگی بلند ہے، اپنے ساقی کو باور کرا دوں کہ اس کے میکدے میں اب خمار نہیں بکتا۔ پیمانے چھلکتے ہیں، مگر تشنگی نہیں ہو پاتی''۔

''میں تو من و تن آپ ہی کی امانت سمجھتی رہی ہوں۔ میرے خیالوں میں آپ ہی کا بسیرا ہے۔ آپ کی رفاقت نے مجھے پناہ دی ہے۔ آپ کی چاردیواری نے مجھے جینا سکھایا ہے۔ آپ کی اجازت تھی، جو میں نے آپ کو اپنایا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی ہستی آپ کی چاہ میں فنا کر چکی ہوں''۔

''میں حقیقت پسند شخص ہوں۔ جذباتی باتوں سے سروکار نہیں رکھتا۔ افراد کی پرکھ ان کے مقام پر کرتا ہوں۔ کسی کی قدر کرنے سے اس کا مقام تبدیل نہیں ہو جاتا''۔

''خاک سے نکلے ہوئے پتھر میں نے شیشہ گھروں میں دیکھے ہیں''۔

''میں افسانوی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ سچائی صرف یہ ہے کہ میں نے تم پر زر کی بارش کی ہے۔ تمہیں کرائے پر لے کر اپنے ساتھ رکھا ہے''۔

''تو گویا آپ مجھے باندی کی حیثیت دیتے ہیں؟''

''ایسے معاملات اب مفقود ہیں۔ تم جو رشتہ بھی بنا لو، میں اس میں شامل نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے تقدس سے کوئی سروکار نہیں ہے''۔

چمپا کی آنکھیں اشکوں سے بھیگ چکی تھیں۔ قطرے گالوں پر بھی تیر رہے تھے، جن میں سسکیوں کی لرزش متواتر نظر آتی تھی۔ سمیر مسلسل بول رہا تھا۔

''میں زندگی کی دوڑ میں تیزی سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں، اتنا کہ حریف کاروباری میری خاک پا بھی نہ پا سکیں۔ میرا مطمع نظر صرف معاشی ترقی ہے، امارت، اس قدر زیادہ کہ سوچوں سے بھی بڑھ جائے۔ تم اگر میری ہمدرد ہو تو لکشمی کو میرے گھر کی لونڈی بنا دو، یوں میرے ہمرکاب چلتی بھی رہو گی۔ میری زیست میں تمہارے لئے یہی واحد راستہ ہے''۔

''آپ میرا کون سا روپ چاہتے ہیں؟ کیا آپ میرا استحصال کر کے کمائی گئی دولت پر فخر کر سکیں گے؟''

''میری زندگی میں اپنا کردار تم جان چکی ہو۔ اس ضمن میں آپا مروت تمہاری تربیت بھی کر چکی ہیں''۔

چمپا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ اس

کا دامن اشکوں سے بھیگ گیا۔ روتے میں کبھی بے قابو بھی ہو جاتی۔ سمیر دوبارہ بول پڑا۔

"مجھے گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا بھی آتا ہے مگر شاید اس کی نوبت نہ آئے۔ دیکھو چمپا، بڑے پراجیکٹ آسانی سے نہیں ملتے۔ ہر جگہ رشوت کا دور دورہ ہے۔ میں نے وہی کامران دیکھا ہے جو کرتا دھرتا عناصر سے روابط رکھتا ہے اور ان کی کمزوریوں سے کھیلنا سیکھ لیتا ہے۔ رشوت کی کئی اور بھی انواع ہیں مگر عورت کا حُسن اُس سب پر حاوی ہے"۔

چمپا نے سمیر کی طرف دیکھا تو اس دم وہ اسے مجازی خدا کی بجائے پتھر کا صنم دکھائی دیا جس کا سینہ سنگلاخ چٹانوں سے اٹا ہوا تھا۔ اٹل حقائق مقابل پا کر اس کی تمناؤں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ "کوئی کسی پر بلا جواز احسان نہیں کرتا"۔ اس کے بدن کا رواں رواں چیخ پڑا۔ "اصلیت آخر سامنے آ کر رہتی ہے"۔ اس کے ذہن میں ابھرا۔ دکھ اس کی اکائی میں زہر کی طرح پھیل گیا زندگی میں ایک بار پھر وہ اپنے دل کی کرچیاں سمیٹنے لگی۔ سمیر اور آپا مروت اسے ایک ہی سکے کے دو رخ دکھائی دیے۔ "نہ جانے انسان کب اپنا پینترا بدل لے اور نیا روپ دھارے نظر آنے لگے"۔ اس نے خود کلامی کی۔ چمپا کو اپنا احتجاج طوفان کے مقابل خس و خاشاک کی مانند دکھائی دیا جس کے بعد اس نے اپنے آپ کو تلخ حالات کے سپرد کر دیا۔

اب ایک گھر میں دو اجانب مقیم تھے، جن کے بیچ لفظوں کا تبادلہ زہر بجھے تیروں کی صورت ہوا کرتا۔ زندگی وہاں سسک رہی تھی۔ سمیر جان چکا تھا کہ چمپا حد درجہ مایوس ہو چکی تھی اور زیست سے بمشکل نبھاہ کر رہی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کچل دینا چاہتا تھا۔ اس نے راہوں کا انتخاب کر لیا تھا۔

زمین شور سنبل بر نیارد

"اگر ہمرکاب رہنا ہے تو مے نوشی بھی اپنانی پڑے گی"۔ اس نے چمپا کو بتا دیا۔

"میں تمہارے نام کی شراب زمین پر چھڑک چکا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے مے کا جام چمپا کو پکڑا دیا۔ چمپا نے ساغر زمین پر پٹخ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے زوردار تھپڑ اس کے رخسار پر ثبت ہو چکا تھا۔ چیخ سسکتے ہوئے سکون میں گونج گئی۔ اس سے پہلے کہ فساد میں طوالت جنم پاتی، چمپا ساغر کے ریزوں سے قطرے لب آشنا کر چکی تھی۔ شروع میں جبراً پلا دی جاتی، مگر رفتہ رفتہ وہ مائع کی پُرسکون لذت سے آشنا ہو گئی اور گھنٹوں کے حساب مدہوش رہنے لگی۔ کبھی ضمیر جاگتا تو اسے اپنی زندگی سڑاند کا سفر دکھائی دینے لگتی۔

سمیر اپنی من چاہی منزل پا چکا تھا۔ اب وہ اس صورتِ حال کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس مقام پر کھڑا تھا، جہاں اسے آپا مروت کو ماہانہ ادائیگی بھی بار لگ رہی تھی۔ اسے گھاٹے کے سودوں سے شدید نفرت تھی۔

بکم اکثر سمیر کے ساتھ نظر آیا کرتا تھا مگر اب وہ متواتر اس کے گھر آنے لگا تھا۔ چمپا کو اس کے رویے بھی بدلے بدلے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے چہرے پر وہ ایسے پیغام کندہ پاتی جو اسے غیر مناسب بھائی دیتے۔ اس نے سمیر سے بکم کی شکایت بھی کی تھی مگر کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ پا سکی بلکہ بکم ڈھٹائی میں کچھ اور بڑھ گیا۔ ایک روز یہی شخص میزبانوں کے بیچ تو تکار کا باعث بن گیا۔ تُو تُو مَیں مَیں میں تلخی اس قدر بڑھی کہ سمیر نے چمپا کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ پھر اسے وہ گھر میں روتا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ بعض سورما یہ پہلو مردانگی کا کمال سمجھتے ہیں۔ بکم نے اس کی مرہم پٹی کی اور اپنی زبان میں دلاسے بھی دیے۔ سمیر کو برا کہا اس دم دکھائی دیا کہ وہ شیطان کے کان کاٹتا تھا۔

یکدم چمپا کے سر میں درد کی لہر اٹھی اور وہ بُری طرح کراہنے لگی۔

بکم نے مہلت دیے بغیر انجکشن اس کے بازو میں گاڑ دیا۔ یہی اس کا مطمعِ نظر تھا۔ دوا بدن میں گئی تو چمپا کے الم میں جسمانی لرزش کا اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے لب لرز رہے تھے مگر صدا ناپید تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ بکم نے اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈال دیا۔

رات کے سناٹے میں وقت کے ساتھ چمپا کی بے ہوشی بھی گہری ہو گئی۔ اس بیچ وقتاً فوقتاً اسے احساس ہوا کہ اس کے بیڈ روم میں شیطانی میلہ برپا تھا۔

صبح دم وہ بیدار ہوئی تو اس کا سر بھاری تھا اور بدن کے جوڑ جوڑ سے درد کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ لباسوں کے انبار میں ساغر و مینا الجھے ہوئے تھے۔ دن بھر وہ قالین پر بے سدھ پڑی رہی، جیسے بے جان پتھر وقت کی سواری پر لاد دیا گیا تھا، زندہ لاش کی طرح، تمام جذبوں سے محروم، سوچوں سے بے بہرہ، شکست خوردہ اور مضمحل شام کے وقت سمیر نے کمرے کی بتیاں روشن کر دیں۔ چمپا نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

"اگر تم میری صورت دیکھنے کی روادار نہیں تو مجھے بھی خیراتی پالنے کا شوق نہیں"۔ سمیر بولا۔

"خیرات تو میں اپنے بدن سے بانٹ رہی ہوں، شہر کے تمام بھوکے لوگ گدھوں کی طرح میری لاش کے درپے ہیں"۔ وہ کراہتی ہوئی سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس زعم میں نہ رہنا کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاؤں گا"۔

"میری فکر نہ کریں، میں آپ کی ہمدردی سے آگاہ ہوں"۔

"تمہاری چھوٹی چھوٹی کاوشوں سے میرے بزنس کو کس قدر بڑھوتری ملے گی، تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اگر تم میرا نقطۂ نظر سمجھ جاؤ اور میرے ساتھ مناسب تعاون کرو تو میں تمہیں وہی مقام واپس لوٹا دوں گا جس کی تم عادی ہو چکی ہو"۔

"اس جنگ سے کیا لینا جس میں شیطان ناچتے ہوں"۔

طنز گہرا تھا مگر لفظوں کا چناؤ ایسا تھا کہ سمیر صورتِ حال کے برعکس کھلکھلا کر ہنس پڑا جبکہ چمپا اپنا آئندہ کردار جان کر بُری طرح رو پڑی۔

"لفظ تمہارے استعمال کر کے، میں تمہیں اپنا مدعا بتا دیتا ہوں، ہم دو میں سے کوئی ایک خاک میں رُلے گا تو دوسرے کی دنیا میں گلزار مہکیں گے"۔ سمیر نے چمپا کا مقام اس پر واضح کر دیا۔

ایک ٹیلی فون کال سمیر کو کمرے سے باہر لے گئی۔ چمپا جان گئی کہ خفیہ بات چیت اس کے خلاف نئی سازش کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں وہ سمیر سے صرف شر کی توقع کر سکتی تھی۔ بالآخر اسے حکم مل گیا۔

"میک اپ کر لو اور ہاں، مختصر لباس کا دھیان رکھنا، کہیں جانا ہے"۔ سمیر نے نظریں چراتے ہوئے اسے حکما کہا۔

"لاش پر سنگھار سے فائدہ؟"

"فضول گفتگو سے کسی کو کچھ نہیں ملے گا"۔

"مجھے کہاں قربان ہونا ہے؟ سوال کرنے پر معذرت، جانتی ہوں کہ یہ پوچھنا میرا حق نہیں"۔

"ایک شخص کو ہماری مدد چاہیے، ہم وطن ہے، یہاں قدم جما چکا ہے۔ اعلیٰ رتبے پر فائز ہے۔ احمد جنید کے نام سے مشہور ہے۔ مجھے درمیانے درجے کے منصوبے دلا سکتا ہے۔ آج کل خود بھی مشکلات کا شکار ہے بلکہ حالات کی چکی میں پس رہا ہے۔ اس کی بیوی ٹریفک حادثے میں انتقال کر گئی ہے، جس کے صدمے سے

نجات اسے محال دکھائی دیتی ہے۔ معاملہ اس کی ننھی بچی کا ہے، جس کی نگہداشت کا مسئلہ گھمبیر صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہم بیٹی کی مدد کر سکتے ہیں۔ میں جنید کو شیشے میں اتار چکا ہوں۔ اس نے مجھے خادمہ مہیا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس دم میرے ذہن میں تمہارا خیال آیا تھا۔ تم بطور خادمہ اس کے ہاں قیام کرو گی اور بچی کو سنبھال لو گی۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کی بہن یہاں پہنچ جائے گی اور تم واپس آ جاؤ گی"۔

سمیر نے جملے سپاٹ لہجے میں بیان کر دیئے۔

لالچی روش کے زیر اثر وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ چمپا الم کے کن مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس کا نئے منصوبے کا انکشاف کر دینا مکدر فضا میں نہ صرف بے محل دکھائی دیتا تھا بلکہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ چمپا کی ذہنی ابتری سے قطعاً ہم آہنگ نہیں تھا۔

"بچی کی نگہداشت میں مختصر لباسی کیوں؟ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے گھٹیا افکار پر بہانہ سازی کی قلعی نہ چڑھائیں۔ اپنے ذہن کے کوڑھ کو تسلیم کر لیں"۔ بات سن کر سمیر کے چہرے پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔

"ظاہر ہے کہ تم بچی کے باپ کو لبھاؤ گی اور میرے لئے پراجیکٹ حاصل کرو گی"۔

"نہ کر سکی تو؟ ہو سکتا ہے کہ آپ کے مہربان میں انسانیت کی کوئی رمق موجود ہو"۔

"دعا کرو کہ ایسا وقت کبھی نہ آئے"۔

سمیر نے لیپ ٹاپ آن کیا اور چمپا کو چند ایسی تصویریں دکھائیں جنہیں حقیقی پا کر چمپا کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ اس قیامت سے بھی آشنا ہوگئی جس کی دہائی اس کا بدن دے رہا تھا۔ تمام تصویریں نہ صرف فحش تھیں بلکہ چمپا کو بدکردار ثابت کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ وہ سمیر کی دوست لڑکیوں کی سرغنہ نظر آتی تھی اور بے حیائی میں دیگر کو مات دیتی تھی جبکہ سمیر خود تصویروں کا کردار نہیں تھا۔

اس کا ایک طرف رہنا بھی بھونڈی چال کا حصہ تھا۔ چمپا پر سمیر کی اصلیت واضح ہوگئی۔ اب وہ اسے بلیک میل کر سکتا تھا۔

"فن کے یہ نادر نمونے کسی تیسرے نے نہیں دیکھے"۔ سمیر نے شیطانی مسکان کے لبادے میں لفظ ادا کئے۔

"یقین ہے کہ تمام مناظر خالق تقدیر نے دیکھے ہوں گے"۔ بات سن کر سمیر سکتے میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چمپا کا دل لہولہو ہو چکا تھا۔ متاع، جو اسے عزیز از جان تھی، ضیاع کی نذر ہوگئی تھی۔ اس کی پاکبازی کا بھرم دم توڑ چکا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ آپا مروت کی جانشین کا روپ دھار رہی تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھی تو اس کے چہرے پر درد کا تسلط گہرا تھا۔

"میں تمہاری اداکاریوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی حیثیت کی خبر رکھو"۔ سمیر نے اسے متنبہ کیا۔ چمپا خاموش رہی پھر مندے دل کے ساتھ اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف ہوگئی۔ "میک اپ میں نفاست کا دھیان رکھنا، میرا یار بڑا خوش ذوق شخص ہے"۔ سمیر نے گفتگو کا انداز برقرار رکھا۔

"کاش! مجھے زندگی میں کوئی ایسا شخص بھی ملتا جو میری ملمع کاری کے لبادے تلے، میری لاش کا احوال بھی پڑھ سکتا"۔ چمپا سنگلاخ پتھر سے سر ٹکراتی رہی۔

سمیر کا خوف تھا یا وہ پتھر دل کو احساس دلانے کی آخری سعی کرنا چاہتی تھی، چمپا نے بلاخیز بناؤ سنگھار کیا اور انتہائی عریاں لباس پہنا، پھر اپنی نقاہت پر قابو پاتے ہوئے چال ڈھال میں ایسی دلکشی پیدا کی کہ منظر سمیر پر گہرا تاثر چھوڑ گیا۔

"آج تو دیواروں کا بھی جی للچایا ہوگا کہ تم ان کی پناہ میں قیام کرتیں"۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

"گوہر کا کیا ہے، کبھی ایک ہاتھ کی زینت تو کبھی دوسرے کی۔ جس کی تجوری بھاری ہو اسے وہی اٹھا لیتا ہے"۔ چمپا نے جواب دیا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "آج میں اپنی تمناؤں اور وابستہ سرابوں کو الوداع کر رہی ہوں جو آپ کے فریب نے میرے من میں سجائے تھے۔ میں ہار مان چکی ہوں۔ مروت کبھی باعزت نہیں ہو سکتی۔ نجاست کچرے کے ڈھیر پر ہی اچھی لگتی ہے"۔ یہ کہتے ہوئے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جذبات کی انتہا تھی کہ ناتوانی کی حد، اسے شدید چکر آیا اور اگر کار کا ڈرائیور پھرتی سے اسے تھام نہ لیتا تو وہ زمین پر گر پڑتی۔

"جوس کا گلاس پی لو"۔ سمیر نے جاتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"پینے کی ہوس سلامت رہی تو ساقی بہتیرے مل جائیں گے"۔

چمپا نے بددلی سے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

کار کا ڈرائیور چمپا کو دیکھ کر بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس کے حلق سے لرزیدہ سی آواز ابھری تھی، آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئی تھیں اور ماتھے پر پسینہ جھلکنے لگا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے بھی اس نے بارہا چمپا کی طرف دیکھا تھا اور اپنی کیفیت سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی تھی۔ چمپا بھی اس دم جذبوں کی انتہائی حالت سے دوچار تھی۔ ڈرائیور کی پریشانی پر غور نہ کر سکی۔ وہ انہی راستوں پر انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھی، جو اس کی راہوں کے گرد پھیلی کھائیوں سے بڑھ کر مہیب دکھتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی پہاڑی پر ایستادہ عظیم الشان بنگلے میں داخل ہوگئی جسے محل کا نام دیا جا سکتا تھا۔

"کاش! مکینوں کے دل ان خوبصورت پتھروں کی طرح سنگلاخ نہ ہوں"۔ اس نے آرزو کی مگر ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس برتاؤ کے لئے بھی تیار کرنے لگی، جس کا وہ شکار ہو چکی تھی۔

انہی خیالوں میں غلطاں وہ عمارت کے اندر داخل ہوگئی۔ ڈرائیور نے اس کا بیگ ایک کشادہ کمرے میں رکھ دیا۔ کمرے کی آرائش نے اسے متوجہ کر لیا۔ عمارت سے ہر پہلو امارت ٹپکتی تھی۔ یک دم اس کے پاؤں ٹھٹک گئے اور وہ حیران کھڑی رہ گئی۔ سامنے دیوار پر اس کی قدِ آدم تصویر آویزاں تھی۔ یہ کیونکر ممکن ہوا؟ معاملہ اسے سمجھ سے بالا دکھائی دیا، پھر اس کی حیرانی میں پریشانی بھی شامل ہوگئی۔ اس کی تصویر یہاں کیسے پہنچ گئی؟ وہ سوچنے لگی۔ اچانک عقب سے بھاری آواز نے اسے چونکا دیا۔ "ویلکم!" کسی نے کہا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو مقابل ایک پُروقار شخص کھڑا تھا، گورا چٹا اور خوش وضع، نفیس لباس میں ملبوس۔ لمحہ بھر میں وہ شخص بھی حیرانی کی تصویر بن کر رکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھیل کر ساکت ہوگئیں اور چہرے پر نقوش منجمد ہو گئے۔ رنگ زرد پڑ گیا۔ ہونٹوں پر لرزش ابھری مگر سکوت میں مدغم ہوگئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے شرابور ہوگیا۔

"میرے خدا! اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہ دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا"۔ وہ متواتر چمپا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "بخدا، ہو بہو وہی چہرہ، وہی ناک نقشہ، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، ویسی ہی آواز، وہی بدن، کشمیری زلفیں، حقیقت ہے یا کوئی خواب؟" وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ چمپا ساکت کھڑی رہی، ادراک سے عاری قدرے بدحواس صورتِ حال میں کھوئی ہوئی، نا آشنا کہ لمحوں کا سفر کیا رنگ دکھائے گا؟ بظاہر افسردہ بھی تھی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"میرا نام احمد جنید ہے"۔ خوش وضع شخص نے کہا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹ بری طرح کپکپانے لگے، آنکھوں میں سرخی ابھر آئی۔ اس نے چہرے پر سے پسینہ پونچھا۔ کھڑے رہنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ دھڑام سے صوفے کے نرم گدوں میں دھنس گیا اور چہرہ بازو پر ٹکا دیا۔ اس کی ابتر حالت دیکھ کر چمپا اور بھی پریشان ہو گئی۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور جنید کو تھما دیا۔

"کیا آپ پریشان ہیں؟" اس نے پوچھا پھر ہمدردی سے جنید کی طرف دیکھا۔

"تم کون ہو؟" جنید نے اس سے سوال کر دیا۔ چمپا دگرگوں ہوتے ہوئے حالات میں قدرے سنبھل چکی تھی، پس منظر سے کوئی لمحہ اس کے دماغ میں ابھرا اور اس کے وجود کو مسلسل ڈسنے لگا۔

"غلاظت!" اس نے اپنا تعارف کروادیا۔

"براہ مہربانی گاؤن اتار دو"۔ جنید بولا۔ چمپا نے سنا تو یک دم اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ چند لمحے سکوت میں گزر گئے، پھر جنید نے مدعا دہرا دیا۔ چمپا نے التجا بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر جنید صرف حکم کی تعمیل چاہتا تھا۔

چمپا نے دھیرے سے گاؤن اتار دیا۔ مختصر لباسی اس کے بدن کی چغلی کھانے لگی۔ جنید نے آگے بڑھ کر اس کے دائیں کندھے پر نظر دوڑائی۔ بازو کی اوپری سمت سات تلوں کا ہلال موجود تھا۔ اب اس کے وجود پر مسلط حیرانی اور پریشانی میں تجسس کا عنصر بھی شامل ہو چکا تھا۔

"تم اپنے بدن پر گاؤن آراستہ کر سکتی ہو"۔ جنید نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جذبوں کے طوفان میں بری طرح گھر چکا تھا۔

"تم نے اپنے وجود کو غلیظ کیوں کہا؟" جنید نے اس سے پوچھ لیا۔

"اپنی بے بسی کی وجہ سے"۔ چمپا نے جواب دے کر نظریں جھکا لیں۔

"بے بسی یا بے چارگی؟"

"جو سمجھ لیں"۔

"کیا تمہیں جبراً یہاں بھیجا گیا ہے؟"

"جی ہاں"۔

"کیا واقعی تم غلیظ لڑکی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ تم مجھے اعصابی دباؤ کا شکار نظر آتی ہو۔ تمہیں سمیر نے میرے پاس بھیجا ہے، کسی مقصد کے تحت۔ مجھے اپنی بچی کے لئے خاتون کی ضرورت تھی مگر تم نے اپنی شخصیت کے ساتھ غلاظت کا لفظ کیسے جوڑ لیا؟ بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے بات کرو"۔

"یہ لفظ میری کتھا کا جزو ہے۔ سادہ سی کہانی ہے۔ کسی کو غلاظت کے ڈھیر سے نومولود بچی ملی تھی جو اس نے پال لی، کتھا جنم دینے کی خاطر، پھر معاشرے نے فیصلہ کر لیا کہ اس مجبور کو غلیظ ترین بن کر رہنا چاہئے۔ لڑکی نے حتی الوسع حالات کا مقابلہ کیا مگر اب وہ اس راہ پر محوِ سفر ہو چکی ہے جو معاشرے کی مراد پوری کر دے گی"۔

"حیرت ہے، کیا تم اپنی ماں کو جانتی ہو؟"

"اصل ماں کو نہیں جانتی، نقلی مائیں محض دھوکہ ثابت ہوئی ہیں"۔

"تو گویا تم اپنے آپ کو بھی نہیں جانتیں"۔

"آپ کس بناء پر کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے اب ائرپورٹ جانا ہے۔ رات گئے بیرون شہر روانگی ہے۔ کام نمٹا کر لوٹ آؤں گا۔ کہنا یہ ہے کہ قرینہ میری بیٹی ہے۔ اس کی عمر ڈیڑھ برس ہے۔ اسے بہتر نگہداشت کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی خاتون یہ ذمہ داری سہار لے، جس کے دل میں ہمدردی ہو اور وہ بچی کو اپنے اوپر بار محسوس نہ کر لے"۔ جنید نے مدعا بیان کر دیا۔

"میں یہ کام بطریق احسن کر لوں گی اور بصد شوق کروں گی بلکہ دیگر گھریلو امور......" چمپا نے فوری جواب دیا۔

"نہیں، تم صرف قرینہ کی ذمہ داری نبھاؤ گی اور اسی پر توجہ مرکوز رکھو گی۔ دوسرے امور کے لئے میرے پاس ملازمین موجود ہیں"۔ جنید نے گردن کھجاتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"سمیر تمہاری تنخواہ کا بڑا حصہ پیشگی وصول کر چکا ہے۔ باقی رقم تمہیں مل جائے گی"۔

"میری حرمت کو فقط پناہ کی ضرورت ہے"۔ بات سن کر جنید دم بخود رہ گیا۔

"میں تم سے تفصیلاً بات کروں گا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم مجھے دل شکستہ دکھائی دیتی ہو۔ میری حیات میں بھی سکون ناپید رہا ہے اور تمہارے تعارف نے میری بے سکونی میں ازحد اضافہ کر دیا ہے۔ میں اس دم پوری طرح حواس میں نہیں ہوں۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ وجود میں ایسی سوچیں بھی نمو پا رہی ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی"۔

"اگر میرے واپس چلے جانے سے آپ کا سکون لوٹ سکتا ہے تو......"

"ہرگز نہیں، اس صورت میں میں اور بھی مضطرب ہو جاؤں گا۔ تمہیں فی الحال اسی گھر میں رہنا ہے اور قرینہ پر دستِ شفقت رکھنا ہے اور ہاں، میں نے رخشندہ خالہ کو بتا دیا ہے۔ وہ تمہیں کمرہ آراستہ کر دے گی اور بچی بھی تمہارے حوالے کرے گی جو اس وقت غالباً سو رہی ہے۔ تمہاری حالت سے لگتا ہے کہ تم نے شاید کھانا نہیں کھایا، وہ تمہیں کچن میں لے جائے گی اور تمہارا خیال رکھے گی"۔ ہمدردی کے کلمات سن کر چمپا یک دم بہتر محسوس کرنے لگی۔

"سر! آپ کا شکریہ۔ اگر برا نہ مانیں تو براہ کرم یہ بھی بتا دیں کہ میری ذات نے کس وجہ سے آپ کا ذہنی سکون تہ و بالا کر دیا ہے؟" چمپا نے نرمی سے سوال کیا۔

جنید سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"سامنے آویزاں قدِ آدم تصویر پر غور کرو، کیا بازو کی اوپری سمت تمہیں سات تلوں پر مشتمل ہلال نظر آتا ہے؟"

"جی، مجھے اپنی یہ تصویر دکھائی دے رہی ہے اور اپنے وجود کا جزو لاینفک بھی مگر معاملہ آپ کی پریشانی کیسے ثابت کرتا ہے؟"

"یہ تصویر تمہاری نہیں ہے"۔

"پھر کس کی ہے؟" چمپا نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ تصویر میری مرحومہ بیوی نفیسہ کی ہے۔ مماثلت پر غور کیا تم نے؟"

"میرے خدا!" چمپا کے منہ سے نکلا۔ حیرت اب اس کے چہرے پر بھی رقصاں ہو چکی تھی۔ وہ چکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی، یکدم جنید کے گھر پیش آنے والے تمام واقعات مناظر کی صورت اس کے ذہن پر برسنے لگے۔ پھر تمام مناظر جنید کے ایک جملے پر مرکوز ہو گئے۔ یہ جملہ اس کے دماغ پر بار بار ٹکرانے لگا۔ "تم اپنے آپ سے بھی ناواقف ہو"۔ جنید نے اسے کہا تھا۔ جذبوں کی ہلچل میں بے چینی اس پر عود کر آئی پھر یاس و بیم کی نئی صورتوں نے اسے گھیر لیا۔

عالم رنگ و بو میں بھی اب وہ اس روح کی طرح تھی، جو عالم برزخ میں معلق کر دی گئی تھی، کردہ و ناکردہ خطاؤں کی بناء پر اور اپنے حتمی انجام کو ترس رہی تھی۔ کیا میں سرابوں کے فریب سے کبھی نکل پاؤں گی؟ وہ سوچنے لگی۔ کوئی ستارہ اگر بنیاد سے ٹوٹ جائے تو خلا میں تماشہ بن جاتا ہے پھر انجام کی صورت فنا ہو کر بکھر

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جاتا ہے۔ کیا میں بھی مزید تباہی کی طرف بڑھ رہی ہوں؟ خیال اس کے ذہن میں آیا تو اس نے جھرجھری لی اور اس کا بدن لرز اٹھا۔ جنید جا چکا تھا مگر شاید وہ اپنے آپ کو مزید خوش فہمیوں میں جکڑنا نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

اگلے روز خالہ رخشندہ اس کی زندگی میں آ گئی۔ یوں تو وہ اسے ایک رات قبل بھی ملی تھی مگر تعارف صبح دم ہی ہوا۔ وہ عظیم الشان گھر کی مسٹرس تھی اور تمام گھریلو عملے کی ناظمہ بھی۔ چمپا کو وہ گاڑی پر بازار لے گئی۔ دونوں نے مل کر بچی کے لئے خریداری کی، پھر چمپا کو اپنے لباس منتخب کرنے کا موقع ملا۔

''کیا مجھے ایسے لباس خریدنا پڑیں گے جو جنید صاحب کے من پسند سمجھے جاتے ہیں؟'' چمپا نے معصومیت سے سوال کیا مگر خالہ کو بات کی گہرائی سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

''نہیں''۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ ''جنید آقا لنگوٹ کے سچے ہیں، تم ان کے بارے میں غلط نہ سوچنا''۔ خالہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ چمپا کو سمیر کے منصوبے ناکام دکھائی دینے لگے۔ اسے اچھا لگا۔

''یہ سات تلوں کے ہلال سے کیا مراد ہے؟'' چمپا نے دوسرا سوال کر دیا۔

''تم نے کہاں دیکھے ہیں؟'' خالہ یک دم چونک پڑی۔

''میرے بدن پر موجود ہیں، بازو کی اوپری طرف۔ جنید آقا نے دیکھے تو پریشان ہو گئے تھے''۔

''اکٹھے تل ایک مشہدی خاندان کی نشانی ہیں۔ جنید آقا اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ مذکورہ تل صرف مخصوص مشہدی خواتین کے بازو پر ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں ہلال کی صورت میں ثبت کر دیتی ہے۔ یہ کالے نقطے انتہائی مبہم بھی ہو سکتے ہیں اور کبھی بالکل موجود نہیں ہوتے۔ اگر واضح نظر آتے ہوں تو لازم ہے کہ خاتون جنید آقا کے خاندان کی فرد ہو گی۔ مجھے تمہاری صورت بھی مشہدی لڑکیوں جیسی دکھائی دیتی ہے''۔

''غیر معمولی سراب ہمیشہ میری زندگی کا حصہ رہے ہیں''۔ چمپا نے غیر یقینی انداز میں معاملہ نمٹانے کی کوشش کی۔ روز و شب کا سفر آگے بڑھا تو اس نے ننھی قرینہ کو سنبھال لیا اور اپنی تمام توجہ اس کی پرداخت پر مرکوز کر دی۔

جنید کو گھر واپس لوٹنے میں پورا ایک ہفتہ لگ گیا۔ جس رات لوٹا وہ شب بے حد طوفانی تھی۔ دن بھر باراں برستی رہی تھی۔ کچھ دیر سے اولے بھی گر رہے تھے۔ آندھیوں کا زور بارش میں شامل ہو گیا تھا۔ قرینہ متواتر رو رہی تھی۔ وہ گھن گرج سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی نیند بھی اکارت ہو چکی تھی۔ چمپا اس کے ساتھ جاگ رہی تھی۔ تھک ہار کر اس نے نرالا بہروپ دھار لیا۔ اس نے اپنے بال کھلے چھوڑ دیئے اور خوش رنگ دوپٹہ بدن پر سجا لیا۔ اس سجاوٹ کے ساتھ وہ رقص کر رہی تھی جو تتلی کی اڑان سے مشابہت رکھتا تھا۔ قرینہ کو حرکات خوش کن دکھائی دینے لگی تھیں اور وہ ان کا لطف اٹھا رہی تھی بلکہ اپنی مہین سی صدا میں قہقہے بھی لگا رہی تھی۔

جنید یک دم کمرے میں داخل ہوا تو اچھوتے منظر میں کھو کر رہ گیا۔ وہ چمپا کی طرف مسلسل دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ چمپا صورتِ حال سے آگاہ ہو گئی۔ وہ جنید کو کمرے میں پا کر بری طرح شرمائی۔ لمحہ بھر اس کی آنکھیں لجاؤ سے جگمگا اٹھیں، پھر چہرہ لال سرخ ہو گیا اور وہ اپنے وجود میں سمٹ کر رہ گئی۔ جنید کے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔ اسے چمپا کے روپ میں بیوی کی جھلک دکھائی دی اور یادوں کے مناظر اس کے ذہن میں گھوم گئے۔ دونوں میں کس قدر مماثلت تھی، وہ حیرانی میں حدیں چھو

گیا۔ رفاقت پلک جھپکتے تمام ہو گئی۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اگلے لمحے قرینہ کی پکار اسے تلخ حقائق میں واپس لے آئی۔ اس نے بیٹی کو بانہوں میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ بچی صرف اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ بظاہر وہ بے حد اداس تھی۔ سکون پاتے ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ چمپا بچی کو کاٹ میں ڈالنے کے لئے مڑی تو جنید کو اس کی مختصر لباسی یاد آ گئی، تتلی والا رقص بھی۔

''کتنی بھرپور لڑکی ہے''۔ اس نے سوچا۔

''بچی سو جائے تو ملحقہ ہال میں چلی آنا۔ میں وہیں تمہارا انتظار کروں گا''۔ جنید نے اسے کہا۔ چمپا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں چار ہونے پر چمپا نے نظریں جھکا لیں، پھر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہال میں کافی بھجوا دو''۔ جنید نے انٹرکام پر ہدایت کی۔ موسم کی ابتری قائم تھی۔ گھن گرج بدستور جاری تھی۔ کبھی ہوا شوریدگی میں پڑ جاتی اور بارش کا شور بڑھ جاتا، برفانی گولے در و دیوار پر ٹکرانے لگتے۔

چمپا نے قرینہ کے کمرے میں روشنی مدھم کی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ہال میں داخل ہو گئی۔ وہاں بھی روشنیاں مدھم تھیں جنید صوفے پر دراز تھا اور انہماک سے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ چمپا کو کمرے میں پا کر اس نے اخبار سمیٹ دیا اور اسے قریبی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''قصور میرا نہیں ہے چمپا۔ تم میری مرحومہ بیوی کا زندہ عکس ہو، اس پس منظر میں تمہاری مشکلات بڑھ گئی ہیں، میرے رویوں میں تمہاری بابت جھجک معدوم دکھتی ہے، پھر اعتماد بھی کچھ بڑھ گیا ہے کہ تم میری غلطیوں پر مجھے معاف کر دو گی اور میری نادانستہ چیرہ دستیوں کو قابلِ گرفت نہیں سمجھو گی''۔

www.aiourdubooks.net

"سر! آپ بات کریں"۔

"میں آج ائیرپورٹ سے گھر آتے ہوئے قبرستان گیا تھا، وہاں بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھی، پھر گور کا بغور جائزہ لیا۔ دل نے کہا کہ وہ یہاں سے رہا نہیں ہو پائی ہوگی"۔

چمپا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، جو بپھرے ہوئے طوفان میں کہیں کھو گیا۔

"میں وہ نہیں ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

"پھر تم کون ہو؟"

"میں زمانے کے تھپیڑوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی عورت ہوں جو ہار کر گرنا نہیں چاہتی"۔

"معاملہ یہ ہے کہ تم میری مرحومہ بیوی کی ہمزاد دکھتی ہو، اتنی ہم شکل کہ یہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا"۔

"حیران تو میں بھی ہوں"۔

ویٹر کافی کے لوازمات لے آیا، پھر بڑی ٹیبل کے کنارے جھک کر مشروب کو حتمی شکل دینے لگا۔

"بلیک"۔ جنید نے اسے کہا۔ وہ کڑوی کافی پینے کا عادی تھا۔

"میری زندگی میں تلخیاں پہلے ہی زیادہ ہیں"۔ چمپا نے بلیک کافی پر تبصرہ کیا۔

"تمام سفیدی لڑکی کی کافی میں ملا دو اور مٹھاس میں بھی کمی نہ رکھنا"۔ جنید نے ویٹر سے کہا۔

"مٹھاس میں خود کفیل ہوں"۔ چمپا نے شرارت کی اور نگاہ نیچی رکھتے ہوئے کافی کا کپ تھام لیا۔ ہلکا سا طوفان جنید کے دل میں برپا ہوا مگر اس کی توجہ بیرونی طوفان پر مرکوز رہی۔

"سر! میری حیات طوفانی دور کی طرح گزری ہے، ناؤ ہمیشہ ڈگمگاتی رہی اور کنارہ کبھی ہاتھ نہ آسکا"۔

جنید نے چمپا کی جیون کہانی بہت غور سے سنی۔ تمام وقت اس کے چہرے پر دکھ چھایا رہا، حالات کی تلخیاں اس کی تلخ کافی میں ادغام پاتی رہیں۔ طوفان بپھرتا رہا، شب گزرتی رہی۔ آخر میں اس نے اپنے ہاتھوں سے چمپا کے آنسو پونچھ دیئے۔

"دیکھو لڑکی! تمہاری کہانی کی ابتدا میں بہت ابہام ہے۔ ایک دوسری کہانی کے بغیر تمہاری کہانی مکمل نہیں ہوسکتی۔ دوسری کہانی تمہاری اصل داستان ہے۔ اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ اس کے بنا تمہارا نام گمنام رہے گا۔ تم بھی نہیں جانتیں کہ تم کون ہو؟"

"درست سوچ ہے، آپ کی۔ اہم کردار جو میری کہانی سے ہمیشہ منہا رہے ہیں وہ میرے والدین ہیں"۔

"ہم لوگ اسی شہر میں مقیم رہے ہیں جس میں تمہاری کہانی نے جنم پایا ہے۔ میں اور چھوٹی ہمشیرہ ننھے بچے تھے، جب ہم نے وہ شہر چھوڑ دیا، پھر آبائی ملک بھی چھوٹ گیا لیکن اتنا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے رشتہ داروں میں کوئی بچہ کبھی گم نہیں ہوا تھا"۔

"میں آپ کے خاندان سے وابستہ کسی شخص کا گناہ بھی تو ہوسکتی ہوں"۔

"میری ساس خالہ سطوت اٹلی میں مقیم ہے، دو روز میں یہاں آرہی ہیں۔ تم اس کی نظر میں ضرور آؤ گی"۔

"کیا آپ میری کہانی تلاش کرسکیں گے؟"

"ہاں، مگر کرداروں کو سزا دلوانے میں بہت سارے الجھاؤ ہیں۔ سمیر نے تم سے نکاح کر رکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ بندھن رجسٹر بھی کروالیا ہو اور اپنی شادی خفیہ رکھنے میں کامیاب رہا ہو۔ ظاہر ہے، وہ تمہیں بیرون ملک لایا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کاغذات بھی بنوائے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہیں یہاں بیوی کے طور پر لایا ہو لیکن مانے گا نہیں۔ اگر اس نے مذکورہ نکاح رجسٹر نہیں کروایا تو بھی معاملہ کھلنے پر ضرور ایسا کر

لے گا، چاہے اس کے لئے اسے ناجائز ہتھکنڈے ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑیں۔ مجھے یقین ہے کہ اپنی اصل شادی بچانے کے لئے وہ حقیقی بیوی کی منت بھی کرلے گا کیونکہ وہ صاحب اولاد ہے۔ اماں سردار کو بھی قانون کے نرغے میں لانا بہت مشکل ہوگا۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ اس نے ایک لاوارث بچی کو پالا اور بعد ازاں اسے اپنی ایک سہیلی کے حوالے کردیا جس نے اس کی شادی کر دی۔ دونوں کے بیچ ہونے والا بیوپار ثابت کرنا تقریباً ناممکن ہوگا۔ کیونکہ اس قسم کے سودے ہر پہلو سے خفیہ رکھے جاتے ہیں لیکن تم فکر نہ کرو میں خالہ سطوت سے مشورہ کروں گا پھر ہم مل کر کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔ دیکھیں گے کہ تمہاری مدد کس طور کی جاسکتی ہے؟" جنید نے کہا۔

رات بھیگ چکی تھی، پناہ گاہوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ شہر کی زندگی پر خاموشی کا غلبہ تھا۔ طوفانِ باد و باراں اپنی نہج پر جاری تھا۔ جنید پر تھکاوٹ کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ کافی کی تلچھٹ سیاہ رنگ دھار چکی تھی۔ اب آلودہ دکھنے لگی تھی۔ چمپا نے برتن سمیٹے تو بے چین ہوگئی۔ جنید کی طرف دیکھا، آنکھوں کے واسطے سے وہاں پیغام پڑھنے کی کوشش کی مگر اچنبھے کی کیفیت میں اٹک گئی۔ صاحب اختیار مرد کی آنکھوں میں اس کے لئے شفقت تھی مگر اس نے دل بہلاوے کے لئے کتاب کا سہارا لے لیا تھا۔ چمپا کو اپنے معاملات کے حل میں وہ قطعاً پُرجوش دکھائی نہ دیا۔ شاید وہ سمندر کی طرح گہرا تھا۔

☆......☆......☆

قرینہ کی تمام ذمہ داری چمپا پر آچکی تھی۔

"بچے کو ہسپتال لے جاؤ، اسے حفاظتی ٹیکہ لگنا ہے"۔ خالہ سطوت نے چمپا کو بتایا۔ "بعد میں اسے بخار بھی آئے گا۔ ڈاکٹرز سے ادویہ کے بارے میں جان

لینا"۔ خالہ نے ہدایت کی پھر چمپا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تمہارے ذاتی حالات تم پر حاوی ہو چکے ہیں اور تمہیں پچھاڑ رہے ہیں"۔ چمپا خاموش رہی۔

"ذہن پر بوجھ ہو تو انسان ان امور میں بھی تھک جاتا ہے جو عام حالات میں وہ ہنستے کھیلتے سرانجام دے دیتا ہے"۔ خالہ نے اسے سمجھایا۔

سمیر اپنا کھیل انتہائی چالاکی سے کھیل رہا تھا۔ وہ ہسپتال میں پہلے ہی سے موجود تھا۔

"احساس ہوا کہ میں تمہارا عادی ہو چکا ہوں، اسی لئے تمہیں دیکھنے چلا آیا"۔ وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"ان اقارب کی مدد لے لیتے جن کی تمنائیں آپ پوری کرتے ہیں"۔

"اپنی مالا کسی دوسرے کے گلے میں ڈال دینا آسان نہیں ہوتا"۔ سمیر نے دائیں بائیں دیکھا، پھر گفتگو جاری رکھی۔

"جسے آپ زیور سے تشبیہ دے رہے ہیں، اس کی حیثیت آپ کے نوادرات میں سگریٹ کیس سے زیادہ نہیں تھی"۔

"اچھا پکڑو، یہ تحفہ تمہارے لئے ہے"۔ سمیر نے بند ڈبہ چمپا کو تھما دیا۔

"بظاہر اس میں عمدہ قسم کا پرفیوم ہے، جس کا نام گرینڈ ہے مگر اس کی بوتل گرینڈ کی طرح کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی پچھلی طرف ایک مائیکرو کیمرہ نصب کیا گیا ہے جو خفیہ انداز میں نفیس تصویر کشی کر سکتا ہے۔ یہ ڈیوائس یوں تو اعلیٰ اور پیچیدہ ہے مگر اس سے شوخ اور رنگین تصاویر بنانے کے لئے چابکدستی سے کام لینا پڑتا ہے، خصوصاً جبکہ لی گئی تصویروں کا مقصد آقاؤں کو کمتر افراد کے قدموں میں جھکانا ہو"۔

"میری ذمہ داریاں سختی سے قرینہ تک محدود ہیں"۔

"یقین نہیں آ سکتا"۔

"آپ نے احمد جنید سے کیا معاہدہ کیا تھا؟"

"بچی کو حصول مقصد کے لئے بطور سنگ میل استعمال کرنا ہو گا"۔

اس روز چمپا بے حد پریشان نظر آئی۔ یوں بڑھی ہوئی پریشانی کبھی اکھیوں کو اشکوں سے محروم کر دیتی ہے۔ دل روتا ہے مگر چشم تر بے بہرہ رہتی ہے۔ من کی بے چینی جسم پر حاوی ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں چمپا بوجھل قدموں سے جنید کے بیڈ روم میں چلی گئی۔

"آپ سمیر کی طرف میری واپسی ممکن بنا دیں"۔ وہ چھوٹتے ہی بول پڑی۔ شب کے لمحوں میں لرزش بکھر گئی۔ گہری سوچ جنید کے چہرے پر عیاں ہو گئی۔ پھر تاسف کا تاثر ابھر کر انہی نقوش میں کہیں کھو گیا۔

"جس کا نہیں کوئی، اس کا خدا ہے"۔ اس نے کامل اعتماد سے کہا اور اپنے ہاتھوں سے دوپٹہ چمپا کے سر پر اوڑھا دیا۔

☆......☆......☆

لمبی سی کار مسز فراز کو لئے مین گیٹ میں داخل ہوئی تو چمپا لان میں کھڑی تھی، جسے دیکھ کر مسز فراز کی چیخ نکل گئی اور وہ بدحواس ہو کر پچھلی نشست پر جھک گئی۔

"یہ کون ہے؟" اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ چمپا کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

"جی، میڈم! یہ قرینہ کی آیا ہیں"۔ ڈرائیور نے جواب دینے کی کوشش کی۔

"مگر......"

"جی، ان کی صورت نفیسہ باجی سے مشابہت رکھتی ہے"۔

"میرے خدا! اگر یہ اتفاق ہے تو میرے دل پر گراں گزرا ہے"۔

بیٹی کی ناگہانی وفات کے بعد وہ پہلی بار جنید کے

گھر آئی تھی۔ اس کا تمام سفر دکھ اور یاس میں گزرا تھا اور اب اس کی آنکھوں سے آنسو برکھا کی طرح برس رہے تھے۔

"قرینہ ان کے ساتھ مانوس ہو گئی ہے، اس کی صحت بھی بہتر ہو رہی ہے"۔

ڈرائیور نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

دریں اثنا جنید بھی لان میں پہنچ چکا تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اپنی ساس کو سہارا دیا پھر صبر کے چند کلمات ادا کئے۔ عمارت میں داخل ہونا مسز فراز کے لئے آزمائش بن گیا۔ دن بھر جتنی بار بھی چمپا غمزدہ ماں کے مقابل آئی، اس نے اسے اپنی مرحوم بیٹی نفیسہ کے طور پر لیا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ تا دیر دل کو تھامے رہی۔ شام ڈھلے، اس نے نفیسہ کو پاس بٹھا لیا اور اپنی مرحومہ بیٹی کے قصے دہراتی رہی۔ چمپا نے اس کی حتی القدور دلجوئی کی مگر دکھی ماں کا غم بہت گہرا تھا۔ رات گئے اس کے لئے ڈاکٹر کی مدد طلب کرنا پڑ گئی۔ ایک آدھ روز میں بات سات نکوں کے ہلال میں آ گئی۔ جنید اس پہلو زیادہ متجسس تھا۔ مسز فراز ان کالے نقطوں پر حقائق جانتی تھی۔ جنید کے اصرار پر اس نے بتایا کہ "کبھی یہ چاند یا نیم دائرہ ہمارے خاندان کا امتیازی نشان سمجھا جاتا تھا جو عموماً لڑکیوں کے دائیں بازو پر اوپری سمت پیدائشی طور پر نمودار ہوا کرتا تھا اور لڑکیاں اسے خوش بختی کی علامت جانا کرتی تھیں۔ یہ نیم دائرہ سات نکوں کا ہلال کہلاتا تھا۔ کبھی یہ لڑکوں میں بھی ظاہر ہوتا مگر بہت کم۔ ایسی لڑکیاں بھی پیدا ہوتی تھیں جن کے بازو پر نشان موجود نہیں ہوتا تھا۔ ادوار نو میں شادیوں کے سلسلے میں رجحانات تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب بندھن دوسرے خاندانوں سے بھی باندھ لئے جاتے ہیں۔ لہٰذا جسمانی نشانوں کی کتھائیں بھی معدوم ہو چکی ہیں۔ ماضی میں ہمارے خاندانی افراد اپنے کردار پر فخر کیا کرتے تھے مگر گردش زمانہ نے ان کی یہ حیثیت اب چھین لی ہے۔ نتیجتاً ہمارا امتیازی نشان خاندان کے باہر بھی دکھائی دینے لگا ہے مگر بہت کم۔ بنیادی طور پر ہم لوگ ایرانی تھے اور ہماری خاندانی تاریخ آتش پرستوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ میری نانی کے بدن پر یہ امتیازی نشان آب و تاب سے نقش تھا، پھر میری میں ماں کے بازو پر بھی ثبت دکھا۔ میرے بازو پر مدھم تھا جبکہ میری مرحومہ بیٹی کے وجود پر یہ فاصلے سے بھی نظر آتا تھا"۔ مسز فراز نے بتایا۔

"چمپا! تم اپنا بازو آنٹی کو دکھاؤ"۔ جنید نے ملائم لہجے میں حکم دیا پھر اسے آنٹی کے پاس چھوڑ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

سمیر اور جنید کے درمیان ملاقات طے شدہ تھی۔ بات چیت ایک مقامی ریسٹوران میں ہوئی، جس میں ڈنر کا اہتمام جنید نے کیا تھا۔ دونوں کو موضوع گفتگو کا کسی حد تک علم تھا۔

"اندازہ نہیں تھا کہ اس دور میں بھی انسان مول بکتے ہیں"۔ جنید نے گفتگو کہیں بیچ میں سے اچک لی۔

"ہاں، ضمیر بھی بکتے ہیں اور انسان بھی"۔

"میں چاہتا ہوں کہ دونوں کی قیمت لگانے میں آپ میری مدد کریں"۔

"جانتا تھا کہ کمتر پر بھروسے کی بنا غیر معمولی نہیں ہو گی، پھر بھی صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ مدعا سادہ لفظوں میں بیان فرما دیں"۔

"میری آنٹی چمپا کو اپنانا چاہتی ہے"۔

"حیرت ہے، ڈر تھا کہ زندگی میں کہیں یہ موڑ نہ آ جائے"۔

"آپ کے خوف کو حقیقی جاننا مشکل ہے"۔

"یہ لڑکی میرے ہمرکاب بھی مستعار تھی"۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

''مستعار لڑکی رکھنا کئی ملکوں میں قانوناً غلط ہے''۔

''وہ میری منکوحہ ہے''۔

''جہاں تک میرا علم ہے، اس کی آپا کا کوٹھا محض اس کے عوضانے پر آباد رہا ہے''۔

''بلا منافع اصل زر کسی کھاتے میں لوٹا دینا گھاٹے کا سودا ہوگا''۔

''اس کی آپا کے ساتھ معاملات آگے بڑھائیں، سودا گھاٹے میں نہیں رہے گا''۔

سمیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بعدازاں ڈنر کے دوران چند دیگر موضوع بھی زیرِ بحث رہے جو خوشگوار تھے۔

جنید گھر لوٹا تو مسز فراز کو تھکا ماندا، بے سکون اور پریشان پایا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور بدن لرز رہا تھا۔ کمرے میں مناسب حدت کے باوجود اس کے اعضاء شل ہو گئے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب نے میڈم کا معائنہ کیا ہے۔ ان کا بلڈ پریشر معمول سے خاصا کم تھا۔ انہوں نے میڈم کو سکون آور ادویہ کھلائی ہیں۔ علاوہ ازیں چند ہدایات اور بھی دی ہیں جن پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے''۔ خالہ سطوت نے معاملہ بیانی کی۔

رات گئے مسز فراز نے جنید سے بات کی کہ اس نے لڑکی کی سرگزشت سنی تھی جو اس کے دل پر قہر بن کر ٹوٹی ہے۔ تم نے لڑکی کو سنبھال کر کارِ خیر کیا ہے''۔

جنید خاموش رہا۔ مسز فراز نے بات جاری رکھی۔

''اس لڑکی کا تعلق وطنِ عزیز کے اسی علاقے سے رہا ہے جہاں ہمارے گھرانے آباد تھے۔ یہ لڑکی نفیسہ کی ہم عمر ہے۔ اس وقت مذکورہ علاقے میں ہمارے تین گھرانے رہائش پذیر تھے۔ ایک میرا کنبہ تھا، دوسرا تمہارے والدین کا، تیسرا گھرانہ میرے ماموں زاد بختیار کا تھا۔

میں نے ایک بچی کو جنم دیا۔ تمہارے والدین کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ تم تھے، پھر تمہاری بہن نے جنم لیا۔ بختیار البتہ بے اولاد رہا۔ ان بچوں کے علاوہ اس دور میں کسی اور ولادت کا علم نہیں رکھتی۔ بعد میں تمام گھرانے وہاں سے نقل مکانی کر گئے۔ تمہاری اور نفیسہ کی عمروں میں دس برس کا فرق تھا''۔ مسز فراز نے کہا۔

''ماموں بختیار کے تعلقات کئی عورتوں سے قائم تھے۔ وہ پرکے درجے کے عیاش سمجھے جاتے تھے اور اصول پسندی سے ہمیشہ بے بہرہ رہے''۔ جنید نے اندھیرے میں گھوڑے دوڑائے۔

''تمہاری سوچوں میں وزن ہے''۔ مسز فراز نے اندازہ کیا۔

''طویل مدت گزر چکی ہے، تعلق کے ثبوت ڈھونڈنا بہت مشکل ہوگا''۔

''جمشید سے مدد کے لئے کہوں گی، سنا ہے وہ ایس ایس پی ہو چکا ہے''۔

جنید کا خیال تھا کہ مسز فراز آبائی وطن جانے سے پہلے کچھ روز انتظار کر لیں۔

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ چمپا کو ملکیتی بندھنوں سے آزاد کرا لوں تاکہ اس سے متعلقہ پیچیدگیاں کم ہو سکیں''۔ جنید نے رائے دی۔

''سمیر بہت کایاں شخص ہے''۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

کوشش درست انداز میں کی جائے تو حالات سلجھاؤ کی طرف ضرور بڑھتے ہیں۔ جنید سمجھتا تھا کہ وہ ایک بے کس لڑکی کو بچانے کے لئے مایا صرف کر رہا تھا۔ وہ اس کا صلہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اصلاحِ معاشرہ کے بے شمار رخ ہوا کرتے ہیں۔ کسی مظلوم کی دادرسی بھی انہی جہتوں کا ایک پہلو ہو سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

مسز فراز بھی ایک سوشل ورکر تھی اور پرایا درد بانٹنا

اس کی سرشت میں شامل تھا۔

''تمام عمر میں نے یہ کڑی عبادت کی ہے''۔ وہ بتایا کرتی۔ ''میں نے کئی دکھی انسانوں کا الم بانٹا ہے مگر چمپا کا دکھ میرے دل میں اس طرح جاگزیں ہوا ہے کہ جیسے یہ عذاب میرے اپنے وجود کا حصہ ہو''۔ وہ کہتی تو اس کی آنکھوں میں اشک تیرنے لگتے۔

☆......☆......☆

مسز فراز آبائی وطن پہنچی تو احباب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چمپا بھی اس کے ہمراہ تھی۔ چند روزہ سیر و سیاحت کے بعد وہ اپنے فرائض کی طرف متوجہ ہو گئی۔ چمپا ہی کا معاملہ تھا جو اس کی بھرپور سعی کا متقاضی تھا۔

جمشید نے چمپا کی سرگزشت سنی تو سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

''باعثِ اطمینان یہ ہے کہ میں آپ کی مدد بلا واسطہ کر سکتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''شکل و صورت سے یہ لڑکی مجھے آپ ہی کی بھانجی، بھتیجی لگتی ہے''۔ اس نے فوراً قرار دے دیا۔

''میں اسے اپنے دامن میں سمیٹ چکی ہوں، یہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس کی شناخت چاہئے''۔ مسز فراز نے زور دیا۔

تفتیشی مراحل شروع ہو گئے۔ تمنائیں اور خدشے ہمرکاب لئے وقت اپنی ڈگر چلتا رہا۔ شب و روز کا سفر چمپا کو البتہ گراں اور رفتار میں سست محسوس ہوا۔

''کڑے وقت زندگی پر بوجھ بن جاتے ہیں، کبھی لگتا ہے کہ جیون نہیں، انسان خود گزر جائے گا''۔ وہ آنٹی فراز سے کہتی۔ ''میری زندگی میں ایسے ادوار بار بار آئے ہیں جب میں نے اپنے آپ کو وقت کے دھاروں پر بہتا چھوڑ دیا، اس دم جیون کی ناؤ کا نہ تو کوئی ناخدا دکھا اور نہ ہی تن و من میں ہاتھ پاؤں مارنے کا

حوصلہ قائم رہ سکا، حتیٰ کہ وقت کے سمندر نے کسی نئے جزیرے پر پھینک دیا''۔

وہ دکھ بھرے لہجے میں بیان کرتی لیکن زندگی کے اس موڑ پر پہلی بار اسے اپنے مددگار دکھائی دینے لگے تھے، جس کے باعث اسے حوصلہ نصیب ہو جاتا تھا۔

جمشید مسز فراز سے ملنے آیا تھا جو خود بھی چند بار اس کے آفس گئی تھی۔ دونوں کے بیچ ٹیلی فون پر بھی رابطہ استوار تھا۔

''مجھے کچھ علم ہوا تو تمہیں بھی بتا دوں گی''۔ مسز فراز چمپا کو تسلی دیتی، جو فقط اتنا جان سکی تھی کہ پولیس نے آپا مروت کے کوٹھے پر چھاپہ مارا تھا اور وہ زیرِ حراست آ چکی تھی۔ کہانی سمت جانے کے لوازمات پیدا ہو چکے تھے۔ جلد ہی بڑا انکشاف منظرِ عام پر آ گیا۔ جمشید کا ٹیلی فون موصول ہوا تو چمپا کے دل میں ہلچل مچ گئی۔ پولیس نے مسز فراز کو فوری طور پر دفتر بلایا تھا۔

سرد سی شام تھی، دھرتی پر پھیلے سائے مدھم شمسی لو کی غمازی کرتے تھے۔ ان کی پھیکی طوالت سرد ہوا کے طلسم میں سسکتے ہوئے جیون کا تاثر دیتی تھی جس کا دلوں پر غلبہ درد جگا دیتا تھا۔ چمپا کی جان گسل کیفیت اس کے احوال کے باعث نمو پا رہی تھی۔

وسیع کمرے میں تین خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ جمشید ایس ایس پی کی وردی میں ملبوس اپنی نشست پر براجمان تھا۔ ایک لیڈی پولیس افسر نجمہ مسز فراز اور چمپا کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوئی تھی، اپنے باس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''آپ ان میں سے کتنی خواتین کو پہچان سکتی ہیں؟'' جمشید نے تحکمانہ انداز میں چمپا سے دریافت کیا۔

چمپا نے خواتین کی طرف بغور دیکھا تو اس کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ تمام ہی اسے اپنے خون کی پیاسی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دکھائی دیں۔

''جی دو کو، اماں سردار اور آپا مروت کو پہچانتی ہوں۔ دونوں نے باری باری میرے وجود کی قیمت وصول کی''۔

لمحہ بھر اماں سردار نے چمپا کو گھورا، جبکہ آپا مروت نگاہ نیچی کیے زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ جمشید مسز فراز سے مخاطب ہوا۔

''میڈم! چمپا کی کہانی مکمل ہو چکی ہے''۔ مسز فراز کے چہرے پر تجسس رقصاں نظر آنے لگا۔ جمشید نے اپنی بات جاری رکھی۔

''دھرتی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر شخص کی حیات کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قدرت اپنے طریقے سے کہانیاں مرتب کرتی ہے۔ ہم سب کہانیوں کے کردار ہیں۔ کبھی معمولی لوازمات کہانیوں کی تقدیر بدل دیتے ہیں''۔ اس نے تمہیداً کہا۔ ''میں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ''۔ اس نے رائے دی۔

''میں جال کے پیچیدہ الجھاؤ سے نکلنا چاہتی ہوں''۔ مسز سرفراز نے بے صبری کے عالم میں کلام کیا۔ جمشید نے پہلو بدلا، پھر سونے کا چمکتا ہوا بھاری کڑا دراز سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔

''چمپا کی تباہی کا ذمہ دار یہی سنہری کڑا ہے''۔ اس نے کہا اور باری باری موجود خواتین پر نگاہ دوڑائی، جن کے چہروں پر خوف اور شکست کے بادل منڈلانے لگے تھے۔

''چمپا کی کہانی سالہا سال پرانی ہے۔ ہم نے بڑی جستجو کے بعد اسے تلاش کیا ہے''۔ نجمہ نے داستان سرائی شروع کی۔

''یہاں اس کمرے میں تین ملزم عورتیں موجود ہیں۔ دو کے نام چمپا لے چکی ہے، تیسری خاتون کا نام وہ نہیں جانتی جبکہ وہ ملزمہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔ میں تیسری شخصیت کا تعارف کروا دیتی ہوں۔ حاجرہ نامی یہ عورت ایک گہری سازش کا مرکزی کردار ہے۔ سازش کس انداز میں عمل پذیر ہوئی، یہ میں آپ کو بتاتی ہوں''۔ نجمہ نے کہانی آگے بڑھائی۔

''سردار بے اولاد عورت تھی، یہ محرومی اس کی زندگی کا روگ بن چکی تھی۔ اسے خطرہ لاحق تھا کہ گر اس کی گود ہری نہ ہوئی تو اس کا ظالم شوہر قریشی اسے طلاق دے دے گا۔ حاجرہ اس کی کزن تھی اور اس ناطے اس کے گھریلو بھید جانتی تھی۔ دونوں نے مل کر سنجیدہ مسئلے کا حل تلاش کیا۔ سردار نے قریشی کو باور کرایا کہ انہیں کوئی بچہ گود لے لینا چاہئے تاکہ ان کی محرومی ختم ہو جائے۔ قریشی بادل نخواستہ مان گیا۔ اس مرحلے پر حاجرہ کو اپنی قیمت لگانے کا موقع مل گیا۔ اس نے سردار کو اپنے ہاتھوں عروسہ بنایا تھا اور اسی وقت سے اس کے سنہری کڑے پر ریجھ گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ نومولود کے عوض وہ یہ زیور ہتھیا سکتی تھی۔ ادھر سردار جو انتہائی مجبور ہو چکی تھی، تکمیلِ تمنا کے عوض سنہری کڑا دینے پر آمادہ ہو گئی۔

انہی دنوں ایک حاملہ خاتون نرسنگ ہوم آئی اور ڈلیوری کے لئے داخل ہوئی۔ حاجرہ نرسنگ ہوم میں سینئر مڈ وائف تھی۔ اسے مشکل کیس سنبھالنے کا خاطر خواہ تجربہ حاصل تھا۔ حاجرہ ہی نے حاملہ خاتون کی ڈلیوری کرائی۔ ایسا وقت بھی آیا کہ وہ تنہا مصروف کار رہی۔ خاتون نے دو بچیوں کو جنم دیا۔ چونکہ پیدائش کے مراحل پیچیدہ تھے، اس لئے خاتون نیم بے ہوش بھی رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نرسنگ ہومز میں سہولیات محدود ہوا کرتی تھیں۔ ٹیکنالوجیز بھی موجود نہیں تھیں۔

جڑواں بچیاں پا کر حاجرہ کے ذہن میں سازش تیار ہو گئی۔ سونے کی ہوس نے اس کا ضمیر گہنا دیا۔ اس نے کمال عیاری سے ایک بچی کو چھپا دیا اور ماں کے

حوالے وہ بچی کی، جو کم وزن اور قدرے کمزور تھی۔ بعد ازاں اس نے چھپائی گئی بچی اپنے گھر پہنچا دی۔ تاخیر سے پہنچنے والی ڈاکٹر یہ بھید نہ پا سکی۔

اسی شام وہ گھناؤنا کھیل کھیلا گیا جس نے ایک ذی روح کی حیات جہنم رو بنا دی۔ نرسنگ ہوم سے ملحقہ کچرے کے ڈھیر پر حاجرہ نے مظلوم بچی جب سردار کے حوالے کی تو دونوں کے ہاتھ بری طرح لرزاں تھے۔ بچی ہاتھوں سے پھسل کر کچرے میں گر پڑی اور اس کا بدن غلاظت سے لتھڑ گیا جسے وہ آج تک اتارنے کی کوشش کر رہی ہے۔

حاجرہ نے سنہری کڑا وصول کر لیا۔ انہی دنوں سردار نے ایک دوسرا کھیل بھی چالاکی سے کھیلا۔ کڑا چوری کرنے کا الزام خاوند کے رشتہ داروں پر لگا دیا جو اس کے مہمان تھے۔ اس طرح اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ سردار کو دی گئی بچی متواتر آزمائشوں میں مبتلا رہی۔ یہی بچی آج چمپا کے نام سے موسوم ہے اور اپنی شناخت ڈھونڈ رہی ہے۔'' نجمہ نے سازش کا احوال بیان کیا اور باری باری حاضرین کی طرف دیکھا۔ حاجرہ اور اماں سردار کی نگاہیں جھک گئیں اور چہروں پر پسینہ جھلکنے لگا۔ آپا مروت کی کیفیت بھی مختلف نہ تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ کاٹیں تو جسموں میں خون نہیں۔ مزید براں حاجرہ کا بدن اب خوف کے مارے لرز رہا تھا جبکہ چمپا مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کٹھن کرب و اندوہ طاری ہو چکا تھا۔

''نوعِ آدم کی ہوس نے مجھے خاک میں ملا دیا''۔ اس نے بمشکل لفظ ادا کیے۔ مسز فراز سکتے کے عالم میں تھی، لگتا اس کی روح کو جیسے رعد نے فنا کر دیا تھا۔

''وہ بدنصیب ماں کون تھی؟'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ اس سوال نے سب کو چونکا دیا۔ نجمہ نے یک دم اس کی طرف دیکھا پھر خاموشی سادھ لی جبکہ جمشید نے اس سوال کا جواب دھیمے لہجے میں دیا۔

''میڈم! وہ بدقسمت ماں آپ ہیں''۔

مسز فراز کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس کے حلق سے دھیمی سی چیخ نکلی۔ چہرہ الم رخ ہو کر منجمد ہو گیا۔ چمپا اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔ ''میں حاجرہ نامی عورت کو پہچان چکی ہوں''۔ مسز فراز نے کانپتی ہوئی صدا میں کہا، پھر اونچی آواز میں رو پڑی۔ جمشید ان حالات کے لئے تیار تھا، نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھٹنوں کے بل دکھی ماں کے مقابل جھک گیا۔ نجمہ نے پانی کا گلاس تیار کیا۔

''میڈم! آپ معاملے کا دوسرا رخ دیکھیں۔ آپ کو ایک دوسری نغیسہ مل گئی ہے''۔ جمشید نے تشفی آمیز بات کی۔ مسز فراز نے اس کی طرف دیکھا، پھر آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس نے چمپا کو بدن کے ساتھ لگا لیا۔ جمشید نے مسز فراز کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں درد کا طوفان امڈ آیا تھا۔

''ملزم خواتین کو فی الحال حوالات میں بند کر دیں''۔ جمشید نے نجمہ سے کہا پھر وہ چمپا سے مخاطب ہوا۔ ''حاجرہ کے اعتراف جرم کا احوال محکمہ صحت کے علم میں آ چکا ہے۔ ہم نے انہیں ضروری تفاصیل بہم پہنچا دی ہیں۔ اس کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق اس کی نوکری خطرے میں ہے۔ شاید اسے پینشن بھی نہ ملے''۔

''یہ لوگ خدا کے انصاف سے کیسے بچ سکتے ہیں؟'' چمپا نے روتے ہوئے فلک کی طرف دیکھا۔ آسمان پر موسم بدل چکا تھا۔ بادلوں کی گھن گرج بڑھ گئی تھی جبکہ رعد آنکھیں خیرہ کر دیتی تھی۔ سرد ہوا طوفانی روپ دھار رہی تھی۔ فضا یخ بستگی کے رخ مائل تھی۔ تارِ شب بڑھ چکی تھی۔ تلاطم خیز جذبوں کے الاؤ عمارت کے گوشے میں فرزواں تھے جو پناہ لئے انسانوں پر مسلط ہو

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

چکے تھے۔

☆......☆......☆

چمپا اماں سردار اور آپا مروت کے مقابل کھڑی تھی جنہیں حوالات کی سلاخوں نے مقید کر رکھا تھا۔ تینوں خواتین اشک بہا رہی تھیں۔

"خطائیں اپنی جگہ بیٹی! سوچو، میں نے تمہیں پروان چڑھایا تھا۔ یقین مانو، قریشی صاحب کی نیت میں فتور تھا، ورنہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی"۔ اماں سردار نے چمپا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بولنے کے قابل ہوئی تو کہنے لگی۔

"خدا نے قریشی صاحب کو فالج میں مبتلا کر دیا ہے، وہ شخص زندہ لاش دکھائی دیتا ہے۔ میں یہاں قید رہی تو دنوں میں مر جائے گا"۔ چمپا خاموش کھڑی اپنے اشک پونچھتی رہی۔

"تم نہیں جانتیں، چمپا! سمیر مجھے بلیک میل کر رہا تھا مجبوراً مجھے......" آپا مروت اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر چمپا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ناگواری اس کے چہرے پر طاری ہو گئی۔ وہ بکھر جاتی مگر کسی طور اپنے اوپر قابو رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔

"ہو سکے تو انہیں رہا کر دیں۔ قدرت نے مجھے سرخرو کر دیا۔ میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتی ہوں"۔ اس نے قریب کھڑے اہلکار سے کہا، جو اس کا فیصلہ سن کر حیران ہو۔

"جی، میں میڈم نجمہ کو بتا دوں گا، ضروری کارروائی کے لئے"۔ اہلکار نے اسے جواب دیا۔ چمپا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی عمارت سے باہر نکل گئی۔ اسے لگا کہ وہ منوں بوجھ حوالات کے در پر پھینک آئی تھی۔ اب وہ آزاد فضاؤں میں سانس لے سکتی تھی۔ باراں اور طوفانی موسم چھٹنے میں چند دن مزید لگ گئے مگر خزاں کا عروج قائم رہا۔ "خزاں حسن قدرت کا دوسرا رخ ہے"۔ چمپا سوچا کی۔ اسے ایسے ہی موسم نے آسودگی عطا کی تھی۔ اجل کی طرح اس کے بعد حساب اور جزا و سزا کا پہلو بھی برحق ہے، پھر بھی انسان اپنے سکھوں پر شکر ادا کرنے کی بجائے دوسروں کا استحصال کیوں کرتا ہے؟

چمپا اور مسز فراز نے چند روز پہاڑی علاقے میں گزار دیئے۔ برفانی موسموں کی تاثیر نے چمپا کے وجود میں ماضی سے وابستہ اندوہناک بھڑکتے الاؤ پر ٹھنڈے گالوں کے پھاہے رکھ دیئے۔ پھر سوچیں ابھریں تو قلب میں ایسی لو کو تقویت بخشی جس میں سے ہمدردی اور رواداری کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ زندگی کے فیصلہ کن ادوار میں کبھی اس نوع کی تنہائیاں مستقبل کا لائحہ عمل متعین کرنے میں نعمت ثابت ہوتی ہیں۔ چمپا نے محسوس کیا کہ ماں اور اولاد کا رشتہ لاثانی ہے جس میں جدائیوں کے سال معنی نہیں رکھتے بلکہ قدرت نے اسے سدا بہار بنا دیا ہے۔

مسز فراز شہر واپس آئی تو اس نے چمپا کے کاغذات بنوائے، پھر اسے اپنے ساتھ اٹلی لے جانے کے انتظامات کئے۔ دونوں نے پہلی منزل البتہ ملائشیا رکھی۔ چمپا اپنی زندگی میں جنید کا کردار فراموش نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے ہاں واپس پہنچی تو سابقہ حیثیت میں لوٹ آئی۔ اس نے قرینہ کو سنبھال لیا۔ جنید کی بہن، آسیہ بھی وہاں آ چکی تھی۔ اس ناطے گھریلو ماحول بہت بدل گیا تھا اور ملازمین کی روک ٹوک کے آثار واضح نظر آتے تھے۔ گھریلو خواتین کے درمیان بدمزگیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ چمپا تنقیدی نظروں میں رہنے لگی۔ قرینہ بیمار ہوئی تو آسیہ نے چمپا کو برا بھلا کہا۔ اسی قسم کے واقعات اور بھی پیش آئے، جن کے باعث غلط فہمیاں بڑھتی رہیں۔ قرینہ البتہ صرف چمپا سے مانوس تھی، جس کے بناء بچی کی دیکھ بھال مشکل دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے رام

کر لیتی تھی اور بہلائے کھلائے رکھتی۔ اسے مشکل حالات میں بھی سنبھال لیتی۔ اُڑتے پرندوں کی طرح رقصاں اسے دوائیں تک کھلا دیتی۔ آسیہ نے ناچ گانے کے اس پہلو پر بھی اعتراض کیا اور ایک شب اپنے بھائی سے دل کی بات کہی۔

"چمپا کا یہاں آنا کیا ضروری تھا؟" اس نے گلہ کیا۔ جنید اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ یہ دھچکا اسے کھڑے پانی میں گرتے پتھر کی طرح دکھا، جس کے بعد طوفان ابھر سکتے تھے۔

"میں نے بچی کی خاطر اسے خود یہاں بلایا تھا"۔ اس نے معاملہ سنبھالا۔

"ایک رقاصہ بچی کی کیا تربیت کرے گی؟"

"آسیہ! وہ لڑکی پہلے بھی میرے ساتھ یہاں مقیم رہی ہے۔ اس کی روح بہت پاک صاف ہے"۔

"کتنے لوگوں کی زبان بند کی جا سکتی ہے؟"

"اپنے ہی خاندان کی لڑکی ہے جس کا استحصال ہوا ہے۔ ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے"۔

"مجھے تو اس کی ماں پر بھی حیرت ہوتی ہے۔ نفیسہ مر گئی، پھر بھی یہاں شان سے براجمان ہے"۔

"وہ ہماری خالہ بھی تو ہے"۔

"مجھے لگتا ہے کہ دونوں مل کر تمہارے گھر پر قبضہ جمانا چاہتی ہیں۔ چمپا تم پر ڈورے ڈال رہی ہے"۔

"الامان، آسیہ! خالہ کی مالی حیثیت ہم سے کسی طور کم نہیں ہے"۔

"میں نے تمہارے لئے چند لڑکیاں دیکھی ہیں، جو نہ صرف تمہارا گھر سنبھال سکتی ہیں بلکہ تمہارے ہم قدم چل بھی سکتی ہیں"۔

"تم ٹھیک سوچتی ہو آسیہ! میرے لئے یہ گھر بسانا ضروری ہے، نوکر اسے کب تک سنبھالیں گے؟ قرینہ کو بھی ماں کی ضرورت ہوگی"۔

"دنیا بڑی دھوکہ باز ہے"۔

"آسیہ! میں بھی اسی چیز سے ڈرتا ہوں۔ مجھے بیٹی کے لئے سوچنا ہے۔ میرے ساتھ تو کئی لڑکیاں چلنا چاہیں گی مگر دیکھنا یہ ہے کہ کون سی خاتون قرینہ کو اپنا سکے گی؟ ہمیں، زندہ حقائق کے مطابق فیصلے کرنا ہوں گے"۔

"چمپا سے وابستہ افسانوں کا کیا ہوگا؟"

"ڈانسر ہونا دنیا بھر میں ایک پیشہ ہے، گو معیوب ہے۔ تم فکر نہ کرو میں جو بھی کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا"۔

"شادی میں کردار سے اہم اور کچھ نہیں ہوتا"۔

"اس لڑکی نے میری پناہ صرف اپنا چلن محفوظ بنانے کے لئے حاصل کی تھی، پھر بھی میں اس سے وابستہ ماضی پر غور و خوض کروں گا اور اس بابت قریبی احباب سے سنجیدہ صلاح مشورہ کروں گا۔ اپنے خاندان کی لڑکی کو دربدر ٹھوکروں سے بچانا بھی کم اہم نہیں ہے"۔

آسیہ کو احساس ہوا کہ کوئی تیسرا فرد بھی بہن بھائی کے مابین ہونے والی گفتگو سن رہا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ چمپا بات چیت کا بیشتر حصہ سن چکی تھی۔ اگلے روز ماں بیٹی نے اٹلی جانے کا پروگرام بنا لیا اور شام سے پہلے جنید کا گھر چھوڑ دیا۔ آسیہ نے فوراً مغالطے کا نوٹس لیا اور خبر دفتر میں بھائی کو پہنچائی۔

بادِ سبک خرام شوریدگی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں شام کی خنکی غالب دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں ہوا میں شامل ہو گئی تھیں۔ رات گئے طوفانِ باراں کا خدشہ تھا۔ ہوائی اڈے پر پروازیں اس دم جاری تھیں۔ مسز فراز اور چمپا کا ٹکٹ چانس سے وابستہ تھا۔

ماں بیٹی گاڑی سے نکلیں تو دم بخود رہ گئیں۔ ان کے سامنے جنید کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

طاری تھی۔ نہ تو وہ باتوں کے سلسلے میں تمہید کا عادی رہا تھا، نہ ہی اس پہلو اس روز کوئی موقع تھا۔

''آنٹی! نفیسہ کل شب سے میرے ساتھ خیالوں میں ہمکلام رہی ہے۔ میں نے اپنے مستقبل کے تمام پہلوؤں پر سوچ بچار کی ہے پھر کسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔ میں چمپا کو اپنے ساتھ بندھن کی ردا اوڑھانا چاہتا ہوں، اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو''۔ اس نے کہا۔

چمپا کا دل شدت سے دھڑکا، جیسے ابھی سینے سے باہر نکل آئے گا۔ پھر اس کے بدن کا لہو چہرے کی سرخی میں سمٹ آیا اور وہ اپنے ہی وجود کی حدت میں پگھلنے لگی۔ جنید کا روپ اسے فرشتۂ رحمت دکھائی دینے لگا جو اس کا بازو تھام رہا تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ نفیسہ کی بیٹی کو ہمدرد ماں کی ضرورت ہے اور جو الفت اسے چمپا عنایت کرسکتی ہے وہ کوئی اجنبی عورت نہیں کرے گی۔ میں چمپا کے روپ میں نفیسہ کو پانا چاہتا ہوں''۔ اس نے بات جاری رکھی۔ مسز فراز نے بیٹی کی طرف دیکھا۔

''باجی شاید زیادہ ہمہ گیر تھی۔ میں بہت کمتر ہوں۔ اگر وہ سب کچھ نہ کر سکی تو......'' جنید نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں کم پر سمجھوتہ کرلوں گا''۔ وہ بولا، پھر ہنس پڑا۔

چمپا آہستہ سے قدم اٹھا کر اس کے قریب آ گئی۔ مسز فراز ڈرائیور اور اپنے لگیج کی طرف متوجہ ہوئی تو جنید نے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھی۔

''چمپا، بہنوں کے رکھ رکھاؤ اور ان کی عادات میں بھی نمایاں فرق ہوتے ہیں۔ ہر ہستی کی ذات اپنی مخصوص ہوتی ہیں۔ مضبوط اور کمزور شخصی پہلو بھی ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی اکائی کو پرکھنے کے لئے ہمیں اسے بہ حیثیت مجموعی دیکھنا ہوتا ہے''۔ اس نے کہا پھر شریر لہجہ

اپنا لیا۔ ''مثلاً نفیسہ کو لباس کی پہچان ذرا کم تھی، اسے کپڑوں کے ساتھ گاؤن ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا''۔

چمپا کا دھیان یک دم پلٹا اور ذہن میں جنید کے ساتھ پہلی ملاقات کا سماں گھوم گیا، جب سمیر نے اسے مختصر لباسی پر قائل کر کے جنید کے گھر بھیجا تھا اور جنید نے اس کا گاؤن بازو پر خاندانی نشان جانچنے کے لئے اتروا دیا تھا۔

اس خیال کے ناطے چمپا کی نگاہیں بے اختیار اٹھیں اور جنید کی آنکھوں میں کہیں کھو گئیں۔ وہ لجا گئی۔

''جنید، میں نے چمپا کی طلاق قواعد کے مطابق رجسٹر کروائی ہے۔ ابھی عدت مکمل ہونے میں وقت باقی ہے۔ اس لڑکی پر صدمے بھی گہرے ہیں۔ میں اسے اپنے ساتھ اٹلی لے جاؤں گی، یہ وہاں میرے ساتھ رہ کر دنیا میں واپس آ جائے گی۔ مجھے اس کی کچھ تربیت بھی کرنا ہو گی۔ تم تھوڑا سا انتظار کرلو''۔ مسز فراز نے جنید کی طرف دیکھا۔

''میں جلد از جلد قرینہ کے پاس لوٹ آؤں گی''۔ چمپا نے بھی اسے تسلی دے دی۔ چمپا کا ہاتھ بازو پر اس جگہ ٹکا ہوا تھا جہاں سات نکوں کا ہلال نظر آیا کرتا تھا۔ جنید کو وہ انتہائی اپنی اپنی سی دکھائی دی۔

''رابطہ قائم رکھنا''۔ اس نے کہا۔

جدائی کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ جنید نے جیب سے خوبصورت ڈبیا نکالی اور چمپا کو پیش کر دی۔ ڈبیا میں ہیروں سے مرصع بیش قیمت انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس دم اٹلی کے لئے پرواز کا اعلان دہرایا جا رہا تھا۔ برکھا زور پکڑ رہی تھی۔ بہت ساری بوندیں چمپا کے بالوں میں الجھ گئی تھیں، پھر نسوانی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلکے اور برتی بوندوں میں گم ہو گئے۔ یہی عورت کا روپ ہے، افسردہ ہو تو بھی اشک، پھر اظہار تشکر میں بھی آبگینے۔

طنز و مزاح

رن-OUT

شادی کے محاذ پر لشکر کشی کے بعد کئی ماہ کی سرتوڑ کوششوں اور محاصرے کے باوجود ''منگنی'' نامی قلعہ فتح نہ ہو سکا تو میر جعفر اور میر صادق کی تلاش شروع ہوئی

☆ خادم حسین مجاہد

بیسویں صدی اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں کئی خوفناک واقعات ہوئے مثلاً ہیروشیما کی تباہی، کوئٹہ کا زلزلہ اور ہماری شادی وغیرہ۔ یوں تو تقریباً ہر نوجوان کو نکاح کا ذائقہ ایک نہ ایک دن چکھنا ہی ہوتا ہے لیکن سولہ سترہ سال قبل ہمیں یہ ذائقہ چکھنے کی خواہش شدت سے اس لئے پیدا ہوئی کہ ہمارے عزیز دوست یکا یک شادی شدہ کیا ہوئے ہیں رنگین و سنگین حالات و واقعات سنا کر شادی کے لئے مشتعل کرنے میں مصروف ہو گئے پھر شادیوں کا سیزن جو شروع ہوا تو بس اللہ دے اور بندہ لے بس یوں سمجھیں کہ ع ''رہا ہو گا کوئی بندہ خدا کا'' اور وہ بندہ شاید ہم ہی تھے۔ انتہا یہ ہوئی اسی دوران ہمارے ایک ماموں تیسری شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے وسیع تجربات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہم ان کے گوڈوں گٹوں میں بیٹھ گئے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے والدین کو بھی خوابِ غفلت سے بیدار کریں تا کہ ازدواجی جہاد شروع کیا جا سکے۔

ماموں کی تحریک پر خاندان کے طول و عرض میں ہلچل مچ گئی اور مقصد کے حصول کے لئے خاندانی میرج بیورو تشکیل دی گئی اور سن گن کے لئے چاروں طرف ہرکارے دوڑا دیئے گئے۔ رشتوں کی تو کمی نہ تھی مگر کسی بھی رشتے پر خاندان بھر کا اتفاق ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی کیونکہ ہر ایک کا معیار اپنا تھا جس سے دوسروں کا اتفاق ممکن ہی نہ تھا اور جیسا کہ معمول ہے کہ اس معاملے کے مرکزی کردار یعنی ہم سے کوئی رائے لینے کی زحمت کسی نے کی ہی نہیں جیسے شادی ہماری نہیں ان کی ہو۔ ویسے بھی عموماً ہوتا یہی ہے کہ والدین اپنی شادی پسند سے نہ ہونے کا بدلہ اولاد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر کے لیتے ہیں اور جوں جوں شادی لیٹ ہوتی ہے تو لڑکے اور لڑکی کی ڈیمانڈ محدود ہوتے ہوئے بس صرف یہ رہ جاتی ہے کہ ''لڑکی ہونی چاہئے'' اور ''لڑکا ہونا چاہئے''۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سرپھرا مجاہد

سرگودھا کے ایک قصبے میں بیٹھا ہوا انسان دوست اور محب وطن ادیب خادم حسین مجاہد کسی بھی انعام اور ایوارڈ کے لالچ کے بغیر اپنے حصے کا کام کئے جا رہا ہے۔ سچے لکھاری کا کام اپنے اردگرد نظر آنے والی خامیوں کی نشاندہی کرنا ہوتا ہے۔ انہیں دور یا درست کرنا صاحبانِ اختیار کا کام ہے۔ یہ P.R. اور میڈیا سے بہت دور ہے اور اس فاصلے کو کم کرنے کے لئے اس نے درمیان میں بڑے لوگوں سے بنائے ہوئے نقلی رشتوں کو جگہ نہیں دی ہے۔ ویسے بھی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ تخلیق کی بے پایاں قوت سے نوازتا ہے وہ تعلقات کے ناپائیدار سہارے تلاش نہیں کرتے اور خادم حسین مجاہد حیرت انگیز تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس میں اتنی تخلیقی قوت کہاں سے آ گئی ہے۔ شاید اللہ کا خصوصی کرم ہے کہ وہ بیک وقت اتنی مختلف اصناف میں کام کرتا ہے اور کامیاب بھی رہتا ہے۔ شاعری، افسانہ نگاری، بچوں کا ادب، تنقید، طنز و مزاح، تحقیق اور کہانی نہ صرف بہت لکھتا بلکہ بہت اچھا لکھتا بھی اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ مجھے اس کے ہاں جس چیز نے متاثر کیا وہ اس کا گہرا مشاہدہ ہے۔ ہمارے اردگرد بکھری عام سی چیزیں اس کی تحریروں میں بہت خاص زاویے سے آتی ہیں وہ طنز کے چرکے بھی لگاتا ہے اور مرہم بھی رکھتا ہے۔ کہیں کہیں اس کے شریر جملے گدگدی کرتے ہیں تو ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی ہے اور کہیں قاری بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اصلاحی مزاح کو عصری ضرورت سمجھتا ہے۔ وہ ہر سچے پاکستانی کی طرح اپنے معاشرے کو صاف ستھرا معتدل اور آزاد دیکھنے کا خواہش مند ہے مگر جب اسے ہر طرف گندگی، کمینگی، کرپشن اور بے انصافی نظر آتی ہے تو اس کا حساس دل خون کے آنسو روتا ہے مگر آپ اس کی ہمت کی داد دیجیے کہ وہ خونِ دل کی بوند بوند جمع کر کے لفظ بُنتا ہے اور طنز و مزاح لکھتا ہے۔ اپنی آنکھ میں آنسو بھر کے دوسروں کو ہنسانا بہت مشکل کام ہے۔ سچ لکھنا اس کے نزدیک جہاد ہے۔ وہ اپنے قلم سے برائی کی جڑیں کاٹنا چاہتا ہے۔ فائیو سٹار ہوٹلوں، جگمگ کرتی سڑکوں اور عالی شان پلازوں کی چکا چوند سے دور بیٹھا یہ سچا لکھاری کتنا ہی چیخے چلائے اس کی آواز شاید وہاں تک نہ پہنچ پائے جہاں پہنچنی چاہئے کیونکہ اس کے آگے بہت اونچی دیوار ہے، قصیدہ نگاروں کی چیختی ہوئی دیوار۔ ایسے ماحول میں قلم کو تلوار بنا کر جہاد کی کوشش کرنے والا کوئی سرپھرا ہی ہو سکتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایسے بہت سارے سرپھرے موجود ہیں انہی میں سے ایک سرپھرا مجاہد ''خادم حسین مجاہد'' بھی ہے۔

☆......سیّد کامی شاہ

شادی کے محاذ پر لشکر کشی کے بعد کئی ماہ کی سرتوڑ کوششوں اور محاصرے کے باوجود ''منگنی'' نامی قلعہ فتح نہ ہو سکا تو میر جعفر اور میر صادق کی تلاش شروع ہوئی اور مخبری پر کھلے حملے سے قبل ایک خاندان سے انفرادی جھڑپوں کے بعد جب انہیں دعوتِ مبارزت دی گئی تو انہوں نے جوابی حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان کا واسطہ ہمارے خاندانی آثار قدیمہ سے پڑ گیا کیونکہ باقی لوگ تو دسترخوان سجانے میں مصروف تھے۔ ہماری نانی صاحبہ نے پہلا رجز ہی غلط پڑھ دیا کہ ''ہمیں تو رشتوں کی کوئی کمی نہیں ابھی ابھی میں نے تیسری بار اپنے بیٹے کی شادی کی ہے''۔ بس یہیں سے ''فنی خرابی'' پیدا ہو گئی اور معاہدۂ صلح یعنی منگنی کھٹائی میں پڑ گیا دراصل وہ ڈر گئے تھے کہ ان کے ہاں بار بار شادیاں کرنے اور طلاقیں دینے کا رواج ہے بڑی مشکلوں سے اور کئی سفارتوں کے بعد انہیں یقین دلایا جا سکا کہ یہ ہماری ننھیالی روایت ہے۔ ددھیالی تاریخ ایسی نہیں اس لئے آپ پریشان نہ ہوں یوں خدا خدا کر کے معاہدۂ صلح طے پایا۔

منگنی نامی قلعہ روند کر پیش قدمی کرتے ہوئے شادی نامی قلعے کو محاصرے میں لیا گیا لیکن مخالفین کی لمبی رسد کے ساتھ قلعہ بندی کے باعث محاصرہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ شدید گرمی اور حبس کے باعث سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا۔ جرنیلوں نے امن و امان کے ڈھول پیٹنے شروع کر دیے اور ساتھ ہی ''بڑے حملے'' کے لئے مزید نفری کی بھرتی کا اعلان کر دیا جس کے لئے دور و نزدیک اطلاعات بھجوا دی گئیں۔ اس کا ردِ عمل بھی جلد ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا ایک دوست نے لکھا۔ ''ٹھہرو، میں آ رہا ہوں''۔

دوسرے نے لکھا۔ ''جو بلا اب تم پر نازل ہونے والی ہے اس کے بعد تم ریموٹ کنٹرول سے چلا کرو گے اور ریموٹ کنٹرول اس بلا کے ہاتھ میں ہو گا''۔

تیسرے نے گل افشانی کی۔ ''ہمارا تو خیال تھا کہ تم اکیسویں صدی میں کنوارپن کو سینے سے لگائے داخل ہو گے مگر تمہارے بڑوں نے اس سے قبل ہی تمہارے کنوارپن کا جنازہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم اسے کندھا دینے اور آخری رسومات میں شریک ہونے ضرور آئیں گے بس یہ خیال رہے کہ کنوارپن کا جنازہ ہے ذرا دھوم دھام سے نکلے''۔

ایک اور دوست نے ماہرانہ رائے دی۔ ''شادی کے مرض سے بچا جا سکتا ہے کسی شوہر کے پاس بیٹھ کر اس کا رونا دھونا سننے سے اور اس کے حالات سے آگاہ ہونے سے لیکن یہ مرض کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے اگر دولہے کے پاس بیٹھا جائے یا اس کے ولیمے کے چاول کھا لئے جائیں اور دلہن کی سہیلیوں کو میک اپ میں دیکھ لیا جائے اس مرض کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جو بغیر شادی کرائے دور نہیں ہو سکتیں لیکن شادی کے بعد غلط فہمی دور ہو بھی جائے تو کیا فائدہ''۔ (اصلی اور ازلی تنہا)

ایک دوست نے از راہ عنایت ''آبادی کی منصوبہ بندی (Population Planning)'' کے عنوان سے نمونے کا شادی کارڈ تیار کر کے بھجوا دیا:

''مکرمی و محترمی...... السلام علیکم! ہمارے خودسر، ناخلف الرشید، دو چشمی ہمراہ چشمہ خادم حسین مجاہد (اللہ اس کے شر سے ہر ایک کو محفوظ رکھے) مدیر آف فلاں اینڈ فلاں کی شادی خانہ آبادی غیر متوقع طور پر نہ جانے کیسے طے پا گئی ہے آپ سے گزارش ہے کہ تشریف لائیں تاکہ دو چار بندے بارات کے لئے جمع ہو سکیں تمام اوقات کا کھانا ہمراہ لائیں تاکہ کسی سے مانگنا نہ پڑے ورنہ شہادت اور شرمندگی نصیب ہو گی۔ بچے کو اپنی دعاؤں میں رخصت کریں۔

پروگرام (اگر برادری مان گئی تو)

رسم حنا: رات بارہ بجے زبردستی ہو گی (کیونکہ دولہا ہندوانہ رسوم و رواج کے سخت خلاف ہے)

سہرا بندی: بارات والے دن نو بجے ''صبح'' کو بستر سے کھینچ کر نکالا جائے گا اور ٹھنڈے پانی سے غسل دے کر سہرا باندھ کر گیارہ بجے دھوپ میں رکھ کر اس کے نام پر سلامیاں لوٹنا شروع کی جائیں گی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

دولنگی بارات: اگر کسی گاڑی والے سے بھاؤ تاؤ ہو گیا تو دن بارہ بجے روانگی ہو گی۔

نکاح مسنونہ: قاضی کے آنے پر شروع ہو گا اور لڑکی کے مان جانے تک جاری رہے گا۔

دعوتِ طعام: حکومتی پابندی کے باعث چائے پانی پر ٹرخایا جائے گا کیونکہ دلہن والوں کے پاس حکومتی پابندی کا معقول جواز ہے۔

رخصتی: جب دلہن تمام رشتہ داروں سے گلے مل کر رونا دھونا ختم کر لے گی تو میک اپ دوبارہ درست کیا جائے گا اس دوران کچھ فتنہ جو رشتہ داروں کی وجہ سے لڑائی کا امکان بھی ہے لہٰذا دولہا دلہن ان رشتہ داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جلد فرار ہونے کی کوشش کریں گے۔ گزارش ہے کہ اس موقع پر باراتی بھی کھسک لیں ورنہ سر پھٹول کا اندیشہ موجود ہے۔

منجانب: شرکت پر زبردستی تیار۔ میرزا رقیب

نمونے کا یہ کارڈ لے کر ہم ڈیزائن پوائنٹ پر پہنچے اور اپنے ڈیزائنر دوست کو مواد دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا اعلامی کارڈ تیار کرنے کی سعادت آپ حاصل کریں تاکہ مستقبل کا مؤرخ اس تاریخ ساز واقعے کے حوالے سے ہمارے ساتھ ساتھ آپ کا نام بھی سنہرے لفظوں میں درج کرلے''۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ مؤرخ اس کارنامے پر ہمارا نام سنہری لفظوں میں لکھتا ہے یا سیاہ حرفوں میں'' ڈیزائنر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ شادی سے ایک دن قبل ملک بھر سے کئی نوجوان شاعر ادیب ہمارا تماشا دیکھنے پہنچ گئے حالانکہ ہم تک پہنچنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ ہمارا علاقہ ہی نہیں ٹرانسپورٹ بھی نہایت خطرناک تھی اسی سے دوستوں کی مہم جویانہ فطرت کا اندازہ لگالیں۔

مہندی والی رات مہندی کی رسم سے بھاگ کر میں دوستوں کی محفل میں پہنچا جہاں ضعیف رضا تمام مقامی و غیر مقامی شعراء و ادباء کو گھیر کر اپنا دیوان کھولے بیٹھے تھے اور ان بیچاروں کے پاس کوئی راہِ فرار بھی نہ تھی۔ مجھے محفل میں شامل ہوتا دیکھ کر انہوں نے پینترا بدل کر کہنا شروع کیا۔ عام طور پر لوگ شادی بیاہ میں کھسرے نچاتے ہیں لیکن چوں کہ خادم حسین مجاہد شاعر اور ادیب ہیں اس لئے ان کی شادی کے موقع پر بھی شعراء و ادباء کو ہی زحمت دی گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میرا خصوصی سہرا پڑھنا شروع کیا۔

اے دوست تجھے شادی سو بار مبارک
جیون کی یہ بربادی سو بار مبارک
اک سابقہ محبوبہ کی یہ آہ جگر سوز
بیوی سے پڑے روز تجھے مار مبارک
بیگم زدہ اک دوست کا پیغام کہ الحمد
مل بیٹھ کے روئیں گے میرے یار مبارک
اب شوق سے اس حاصلِ ارماں کو بجنگو
ڈولی میں سجا لائے جو آزار مبارک
لے آئے ہو نوخیز سی اک نار عقد میں
لے جائے گی یہ کھینچ کے ''فی النار'' مبارک
وہ کار جو آ جاتی تو کیا کار نہ کرتی
اس دور میں ہو بیوی بے کار مبارک
سہرے میں چھپے چہرے کو سالی نے جو دیکھا
دلہن سے کہا شوہر دم دار مبارک
شادی شدہ روتے ہیں کنوارے بھی پریشاں
یہ جیت ہے یا ہار میرے یار مبارک
لکھا ہے بڑے چاؤ سے رضا میں نے یہ سہرا
چہرے پہ برستی ہوئی پھٹکار مبارک

دوسرے دن تقریباً سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا اپنے تجربات کی روشنی میں مرزا رقیب نے خدشات کی صورت نمونے کے کارڈ میں ظاہر کیا تھا چونکہ تمام معاملات تقریباً پہلے ہی طے ہو چکے تھے اس لئے مقررہ تاریخ کو قاضی نے

نکاح نامی دروازہ کھول کر فوجوں کو شہر میں داخل ہونے دیا اور شہر کے مرکز میں ہمارے کنوارپن کو تہ تیغ کر کے رخصتی کی زنجیروں سے جکڑ دیا یوں اس طویل اور صبر آزما محاصرے کا اختتام ہوا اور خانگی جنگوں کے نئے سلسلے کی بنیاد رکھی گئی۔

مولوی صاحب نکاح پڑھا رہے تھے کہ ہمارے ایک شادی شدہ دوست نے سرگوشی کی۔

''اب بھی وقت ہے ہم سے عبرت حاصل کرو اور راہِ فرار اختیار کر سکتے ہو تو کرلو''۔

مگر اس وقت...... وقت کہاں تھا کہ نہ ہی فرار کا کوئی چانس تھا۔ پھر کچھ دوستوں نے جو سبز باغ شادی شدہ زندگی کے دکھا رکھے تھے ان کی وجہ سے ہم نے بخوشی اپنے پروانہ غلامی پر دستخط کر دیئے۔ ریفرشمنٹ کے بعد آخری رسومات کے لئے بلاوا آ گیا۔ لیڈیز سیشن میں رنگ و نور کے سیلاب میں ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔

بڑی سالی بجی ہوئی پلیٹ والے گلاس میں دودھ لائی گلاس پر ڈھکن اور اندر سٹرا تھا کئی دوستوں کی شادیوں میں ہمیں بطور رشہ بالا اس دودھ سے واسطہ پڑ چکا تھا جس میں عام طور پر کوئی نہ کوئی واردات ہوتی تھی یا تو سرے سے دودھ ہی نہ ہوتا بلکہ پانی ہوتا یا دودھ میں چینی کی جگہ ڈھیر سارا نمک مرچ ہوتا اور اگر دودھ ٹھیک ہوتا تو سٹرا ایلفی سے بند ہوتا۔ جب ہم نے سٹرا سے دودھ پینے کی کوشش کی تو حسب توقع وہ بند تھا لہٰذا ہم نے ڈھکن اتار کر سٹرا نکال کے دودھ منہ سے لگا دیا۔ مگر بمشکل ایک گھونٹ ہی پیا ہو گا کہ چیٹنگ کہہ کر واپس لے لیا گیا اور پھر پانچ ہزار مانگ لئے گئے۔ ہم نے ہزار کے نوٹ کے اوپر پانچ کا نوٹ رکھ کے دینے کی بڑی کوشش کی کہ یہ پانچ ہزار ہی ہیں مگر بے سود، پورے ہی دینے پڑے یوں ایک گھونٹ دودھ پانچ ہزار میں پڑا۔ مگر یہ تو صرف آغاز تھا۔

رخصتی کے بعد رات کو گھر پہنچے اور دلہن کو حجلے دار

دست وگریباں کے بعد معروف مزاح نگار خادم حسین مجاہد کی
طنز و مزاح پر مشتمل دوسری کتاب

قلم آرائیاں
شائع ہو گئی ہے
صفحات 160
قیمت 120 روپے
مضامین، کہانیاں
رازدارِ حیوانات
پرچہ جات
ازلو ابلی تا قصابی
آنجہانی شاعری
ادبی اجلاس
چوہدری کی ڈائری
ملنے کا پتہ: حق پبلشرز A-2 سید پلازہ چیٹرجی روڈ اُردو بازار، لاہور
Ph: 042-7220631, Mob: 0300-9422434

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

عورتوں اور رشتہ داروں کے دیدار کے لئے بٹھا دیا گیا ان دنوں آج کی طرح دولہے کو ساتھ نہیں بٹھایا جاتا تھا لہٰذا ہمیں رات بارہ بجے تخلیہ میسر آیا۔ ہم حسب عادت بولنا شروع ہوئے تو پتا ہی نہ چلا کہ دلہن کب سوگئی جبکہ ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ سن رہی ہے اور جھجک کی وجہ سے ہوں ہاں نہیں کر رہی اس لئے جگا کر سلسلہ وہیں سے شروع کر دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

ولیمے کے بعد ہنی مون کے لئے مری گئے اور سلامی کی رقم ٹھکانے لگا کر واپس آ گئے تو بذریعہ ڈاک مبارکبادوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گل نو خیز اختر نے لکھا۔ ''بھابی مبارک، امید ہے مقامی تھانے میں رپورٹ درج کرادی ہوگی''۔

بابا شوقی نے شرانگیزی کی۔ ''مبارکباد، جب ہماری شادی ہوئی تھی تو محلے کی لڑکیوں اور ان کے والدین نے ''یوم نجات'' منایا تھا تمہاری شادی پر کس کس نے یوم نجات منایا۔

سعید رضا نے ارشاد فرمایا۔

اے دوست تجھے شادی صد بار مبارک
اک جیتی ہوئی بازی کی یہ ہار مبارک
کہتے ہیں یہ روتے ہوئے کچھ دوست کنوارے
یہ مقطع . آزادی صد بار مبارک

آخری درویش نے پھلجھڑی چھوڑی۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت- انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

ابن عاصی نے شرانگیزی کی۔ ''مبارکباد بھابی کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی بنا بنایا خادم بطور خاوند مل گیا۔

محسن احسان نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر تم نے بھی سیر پادر سے ٹکر لے لی سمجھو کہ اب تمہاری مجاہدانہ زندگی کا End آ گیا میری طرف سے تمہیں اپنی زندگی کی آخری حقیقی خوشی مبارک ہو''۔

سعید انجم نے لکھا۔ ''میں آپ کو زندگی کے نئے Suffer کے آغاز پر مبارکباد پیش کرتا ہوں''۔

خالد یوسفی نے ارشاد کیا۔

وصل کی رات کس طرح گزری
ہنستے روتے یا منتیں کرتے
بیویاں جن کی اک سے زیادہ ہوں
آپ کہتے تھے شہزادہ ہے
ایک بیوی تو آپ لے آئے
تین کا کب تلک ارادہ ہے

ڈاکٹر شفقت علی نے یوں پرسہ دیا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ مبارک باد دوں یا اگر پہلے پتا چل جاتا تو میڈیکل سرٹیفکیٹ ہی دے دیتا کہ بخشو بی مجاہد کنوارا ہی بھلا۔ بہتر یہ ہے کہ اب تم اپنا نام مجاہد سے اسیر رکھ لو''۔

دراصل شادی انسان کی نشاۃ الثانیہ ہے۔ شادی کرنا بہت آسان ہے مگر بیگم نبھانا بہت مشکل۔ شادی کے بعد آؤٹ ڈور گیمز کم ہو جاتی ہیں کیونکہ شادی بذات خود ان ڈور گیم ہے۔ بقول آخری درویش میری بہت سی بیویاں ہیں پھر میں امیر کیسے ہو سکتا ہوں دراصل ایک بیوی ہی اتنا خرچ کر دیتی ہے کہ مرد دوسری کا سوچ ہی نہیں خود ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ بیویاں کم از کم دو ہونی چاہئیں تا کہ اوقات میں رہیں لیکن اب یہی خیال ہے کہ ایک بھی زیادہ ہے حالانکہ شرع میں بھی گنجائش موجود ہے اور دل میں بھی۔ ویسے دنیا میں عورتوں کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے کیونکہ مردوں کی شرح اموات زیادہ ہے اور اس کی وجہ بھی عام طور پر عورتیں ہی ہیں۔ عورتیں اس لئے طویل عمر پاتی ہیں کہ ان کی کوئی بیوی نہیں ہوتی۔ ان زائد عورتوں کے لئے صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے کچھ مجاہد آگے بڑھ کر عقد ثانی کی قربانی دیں ہم تو توبہ تائب ہو چکے۔

❁❁❁

علم و تحقیق

دستور کامل

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟ (سورہ محمد)

☆ محمد عادل ولیجہ مظاہری

علماء نے اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کی بے شمار تفسیریں لکھیں اور تالیف کی ہیں۔ اسلامی کتب خانے ان نفیس اور ضخیم تفسیروں سے بھرے پڑے ہیں اور علماء نے اللہ کی اس جلیل القدر کتاب کی بہت ہی خدمت کی ہے۔ پھر بھی قرآن کریم میں ابھی بھی بے شمار موتی اور جواہرات پوشیدہ ہیں جو ہم پر کبھی کبھار ظاہر بھی ہو جاتے ہیں۔ جو عقل کو حیران کر دیتے ہیں اور دانائی مبہوت ہو جاتی ہے۔ ان عجائبات میں نورِ الٰہی کی چمک دمک، پاکیزہ فیض اور نورانی مہک ہے۔ ان میں انسانی زندگی کی سختیوں اور دہکتی آگ سے چھٹکارے کا سبق ہے۔ تمام علوم جل کر ختم ہو جائیں گے مگر قرآن جو کہ حکمت کا ایک بحرِ ذخار اور بیکراں سمندر ہے، ہمیشہ باقی رہے گا اور علماء اس سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر اس سے صاف اور شفاف علم کے چشمے جاری کرتے رہیں گے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عجائبات کے اس بیکراں سمندر میں غوطے لگا کر اس میں موجود بیش بہا خزانوں کو باہر نکالا جائے اور کون ہے جو اللہ رب العزت کے کلام اور اس کے اسرار، اس کی باریکیوں اور اعجاز کا ادراک کر سکے کوئی کچھ خدمت انجام دے کر یہ خیال کر لے کہ اس نے کام پورا کر دیا اور درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ (ہرگز نہیں)

وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ علمه الا بماشاء (البقرہ:2:255)۔

(ترجمہ: اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکے، ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے۔)

یہ قرآن کریم معجزہ خالدہ ہے جو انسانیت کو علوم و معارف عطا کرتا ہے جس سے اس کا ایمان بڑھتا ہے اور یقین کامل ہوتا ہے۔ یہ معجزہ خالدہ نبی امی رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابن عبداللہ پر حکمت اور خوبیوں کے مالک پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس جہان رنگ و بو کے حالات ایسے ہیں کہ نفسا نفسی نے ایک مردِ مومن کو اس کی معاش کی فکر نے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ حیران ہے، پریشان ہے۔ اس سرگردانی اور حیرانی میں اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اس مقدس اور جلیل القدر کتاب کی قدر کر سکے، پڑھ سکے اور اس پر عمل کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے اس کتاب کو اتنا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تعارف

جناب محمد عادل ولیجہ مظاہری سابق ریاست سوات کے بنج نامی ایک گاؤں میں 1939ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حفظ وقرأت، فارسی اور عربی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) میں حاصل کی۔ ان دنوں جامعہ میں مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا عبدالرب، مولانا محمد مالک کاندھلوی، مولانا اسماعیل بھائیلا اور قاری بندہ الٰہی میرٹھی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر علمائے کرام تدریس میں مشغول تھے۔ جامعہ کے مہتمم اور دارافتاء کے سربراہ مولانا مفتی بسم اللہ رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ تقسیم کے بعد ان میں سے اکثر علمائے کرام پاکستان تشریف لے گئے۔ بعدازاں موصوف نے حضرت تھانویؒ کے خلیفہ مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمتہ اللہ علیہ کے قائم کردہ مدرسہ بیت العلوم واقع سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ میں درس نظامی کی بعض کتب پڑھیں اور مظاہر علوم، سہارن پور (یو پی) سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اور اپنے آبائی گاؤں کے مدرسے میں تدریس میں مشغول ہوئے۔ لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد حسب توفیق الٰہی علمی، وتحقیقی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

عام کیا جائے کہ مومن کے رگ رگ میں خون کی طرح دوڑتا رہے اور قلب و جگر میں راسخ ہو جائے۔ لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے حفظ قرآن، درسِ قرآ نکے مراکز بند کئے جا رہے ہیں۔ معصوم بچے جو قرآن کریم حفظ کر رہے ہیں ان کی لعنت اور تحقیر اسلامیہ جمہوریہ پاکستان میں عام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی آیتوں کی تفصیل، توضیح، بلاغت و فصاحت اور اس کی حقانیت کا اظہار کر دیا ہے اور اس کی سچائی ثابت کر دی ہے اور جو کچھ اس کتاب مجید میں تشریعی، تہذیبی، معاشی اور تمدنی قوانین ہیں اسے بنی نوع انسان کے لئے پیش کر دیا ہے۔ اب باقی ہے تو صرف یہ کہ انسان اٹھ کھڑا ہو اور اس پر عمل کر کے اپنی دنیا و دین کو بہتر سے بہتر بنا دے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

اسے پڑھا جائے اسے پڑھایا جائے اسے نافذ کیا جائے۔

اے قرآن سے منہ موڑنے والو! کب تک جیو گے۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔

قرآن تعارف

قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے جو اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مقرب فرشتے جبرائیل امین کے ذریعے نازل فرمائی۔ قرآن کریم برخلاف دوسری آسمانی تحریف شدہ کتابوں کے خود تفصیل سے اپنا پتا بتاتا ہے۔

یہ (قرآن اللہ) پروردگار عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ (یعنی اس نے) تمہارے دل پر القا کیا ہے) تاکہ تم (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔ (اور القا بھی) فصیح عربی زبان میں کیا ہے)(سورۃ الشعراء)

قرآن رمضان میں نازل ہوا اور ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا جو لوگوں کا راہنما ہے اور جس میں کھلی نشانیاں ہیں اور جو (حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے۔ (البقرۃ:185)

لفظ قرآن کے معانی اور مفہوم

یہ لفظ مصدر ہے یعنی پڑھنا۔ اللہ کی کتاب کا خاص نام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ کسی بھی دوسری آسمانی کتاب کا نام قرآن نہیں ہے۔ جس طرح جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے گردن سے ذات انسانی اسی طرح رکوع سجود، قیام اور قرآن بول کر مجازاً پوری نماز مراد لی جاتی ہے۔ قرآن کی وجہ تسمیہ کے متعلق علماء کے متعدد اقوال ہیں۔ کسی نے کہا قرء کا معنی جمع کرنا ہے۔

قرآن کتب سابقہ الٰہیہ کا حاصل اور مجموعہ ہے۔

امام راغب اصفہانی نے اتنا اور بڑھا دیا کہ قرآن تمام علوم کا مجموعہ ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا سورتوں کا مجموعہ ہے۔ بہرحال سب نے قرآن کی وجہ تسمیہ بیان کرنے میں جمع کا مفہوم پیش نظر رکھا ہے۔

پروفیسر عبدالرؤف نے کہا یہ وجہ تسمیہ غلط ہے۔ قرآن کا نام سب سے پہلے سورۂ مزمل میں آیا ہے جو ترتیب نزول کے اعتبار سے تیسری سورت ہے۔ اس وقت نہ صورتوں کا مجموعہ تھا نہ کتب سابقہ کا نچوڑ اور خلاصہ بلکہ نماز میں دینی محافل میں، مدارس میں اور دوسری تقریبات میں (ابتدا) میں پڑھی جاتی ہے۔

قرآن کریم کا کچھ حصہ مکی ہے کچھ حصہ مدنی ہے، 17 رمضان 14ھ میلاد نبوی سے لے کر 54ھ تک نازل شدہ حصہ مکی کہلاتا ہے جس کی مقدار مجموعہ کے لحاظ سے 19/30 کی ہے اور باقی حصہ 11/30 مدنی جو آخر عمر تک نازل ہوا۔ کل آیات (قطع نظر از اختلاف روایات) 6236 ہیں۔

یہ قرآن کریم لوگوں کی ہدایت، رہنمائی اور ایک بہتر زندگی گزارنے کے لئے راہنما ہے۔ "ھُدًی للنّاس"

ایک فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔

یہ قرآن بار بار دہرانے سے نہ تو پرانا ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔ لفظ قرآن قراء یقراء سے اسم مبالغہ کا صیغہ ہے۔ جیسے غفران، طوفان فعلان کے وزن پر۔ تو اس کے معنی ہوں گے بہت زیادہ پڑھا جانے والا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام میں عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) کے اوقات سورج کے طلوع وغروب سے منسلک ہیں۔ تو دنیا میں سورج کا طلوع وغروب اس طرح سرانجام پاتا ہے کہ دنیا کے ایک سرے جہاں سے طلوع ہوتا ہے وہیں سے عبادت نماز کی ادائیگی ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ وقت چلتا جاتا ہے اور اس عبادت نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے۔ فجر سے شروع ہوتا ہے اور تا آخر غروب۔ لوگ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ اس کی تلاوت مسلسل ہو رہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک منٹ کے لئے بھی قرآن کا پڑھنا بند نہیں ہوتا تو بے جا نہ ہوگا۔

قرآن کے نام

کتاب ومبین حٰمٓ وَالکِتٰبِ المبین

اَلکِتٰب: لکھنا، لکھی ہوئی تحریر، خط وہ عبارت مع مضمون جو لکھی ہوئی نہ ہو۔ آئندہ لکھی جانے والی ہو، آسمانی صحیفے، تورات، انجیل، قرآن مجید لوح محفوظ، صحیفہ فطرت، تجویز الٰہی، علم الٰہی، حکم ازلی، اعمالنامے، فریضہ، خداداد دلیل واضح، غلام کو مکاتب بنانا۔

قرآن کریم میں قرآن پاک کے مختلف نام درج کئے گئے ہیں۔

صاحب الاتقان فی علوم القرآن" نے تقریباً اٹھاون نام شمار کئے ہیں اور ہر نام کے لئے قرآن کریم

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی آیتوں سے ثبوت پیش کیا ہے۔

(لغات القرآن، عبدالدائم جلالی)

اَلْفُرْقَانُ: فرقان مصدر بھی ہے یعنی الگ الگ کرنا، حق کو باطل سے جدا کرنا اور یہ صیغۂ صفت یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی شے۔ قرآن مجید، تورات، دلیل و حجت، وہ نور جس سے حق و باطل میں امتیاز ہو جائے۔

ایک اور جگہ الفرقان سے وہ دلائل مراد ہیں جو حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہیں۔

اَلنُّوْرُ: یہ لفظ قرآن کریم میں 24 مرتبہ آیا ہے۔ نورٌ، نورًا نُورٍ اور اس شکل میں قرآن کریم میں مختلف جگہ وارد ہے۔ اعراب کے لحاظ سے سب کا معنی روشنی، قرآن میں روشنی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک احکام الٰہیہ کی روشنی، قرآن مجید کی روشنی، شریعت و براہین الٰہیہ کی روشنی، اللہ کی تجلی توحید اور اعمال صالحہ کی روشنی مراد ہیں نور بمعنی منور بھی ہے روشن کرنے والا دوسروں کو روشنی عطا کرنے والا۔ روز قیامت میں نور جس کی وجہ سے پل صراط پر چلنا آسان ہو جائے گا۔

ھُدٰی: یہ لفظ اسم اور مصدر ہے۔

اَلْھُدٰی: ھدًی لِلْمُتَّقِین

یہ دونوں الفاظ قرآن کریم میں دیئے گئے شکل میں (79) اناسی مرتبہ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ہدایت کرنا، انبیاء علیہم السلام، اللہ کی کتابیں اور صحیفے دلائل فطریہ، براہین عقلیہ، ایمان یہ سب چیزیں بجائے خود ہدایت بھی ہیں اور ہادی بھی مختلف قرائن مختلف معانی کی تعین کی جاسکتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیت یعنی البقرہ کی دوسری رکعت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ "ھدًی لِلْمُتَّقِیْنَ" اگرچہ قرآن کریم خود ہدایت ہے اور محض ہدایت ہے اور سب کے لئے ہے لیکن اس ہدایت سے نفع اٹھانے والے صرف نیک بخت لوگ ہیں جیسے کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

(ترجمہ: تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور سینے کی بیماریوں کی شفا آ چکی جو مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے۔)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں متقین وہ جو ایمان لاکر شرک سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لاتے ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کی امید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اسے سچا جانتے ہیں۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض بجا لائے۔ اعمشؒ حضرت ابو بکر بن عیاشؒ سے سوال کرتے ہیں کہ متقی کون ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں کہ متقی وہ ہے جو کبیرہ گناہ سے بچے۔ اس پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب لوگ ایک میدان میں قیامت کے دن اس وقت ایک پکارنے والا پکارے گا کہ متقی کہاں ہیں؟ اس آواز پر وہ کھڑے ہوں گے اور اللہ انہیں اپنے بازو میں لے لگا اور بے حجاب انہیں اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔

جنت سے نکالتے ہوئے جو خبر حضرت آدم حضرت حوا علیہا السلام اور ابلیس کو دی گئی کہ کتابیں، انبیاء اور رسول بھیجے جائیں گے راہِ حق واضح کر دی جائے گی۔ کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے اس کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف و غم نہیں۔

(ابن کثیر)

الغرض یہ کتاب ہے تو سر بسر ہدایت و رہنمائی مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے

اولین صفت یہ ہے کہ آدمی "پرہیزگار ہو" بھلائی اور برائی میں تمیز کرتا ہو، برائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہشمند ہو۔ رہے وہ لوگ جو دنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہوں جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہ ہوتی ہو کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ صحیح بھی ہے یا نہیں، بس جدھر دنیا چل رہی ہو یا جدھر خواہش نفس دھکیل دے یا جدھر قدم اٹھ جائیں اس طرف چل پڑتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لئے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی)

قرآن کریم کی تمام آیتوں میں ہدایت ہے۔ دنیاوی زندگی گزارنے کے آداب ہیں۔ اس قرآن میں ایسی پُر حکمت باتیں ہیں کہ ایک عام آدمی اور ایک امور مملکت کا سربراہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر گزار سکتا ہے۔ قرآن سے منحرف ہو کر یہاں تو یہ حال ہے کہ ایک بے مایہ جس طرح اللہ سے بے خبر اسی طرح سربراہ مملکت بھی اللہ سے اور قرآن سے بے خبر اور بے پروا ہے۔

جمہوریت کا راگ الاپنے والے بادشاہی کر رہے ہیں اور سارا زور اپنی بادشاہی کو بچانے میں لگے ہوئے اور یہ سوچتے اور سمجھتے ہیں کہ کہیں ہماری بادشاہی نہ جاتی رہے۔

جب صاف واضح اور ظاہر ہے کہ قرآن حکمت و دانائی سے پُر ہے تو اس کے احکام کو کیوں نافذ نہیں کر رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر قرآن کے احکام نافذ کئے تو یہ بادشاہی جاتی رہے گی۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

معاشرت

درز

دُنیا کی بہوؤں کے ایسے ہی سسر ہو جائیں تو یوں چاندی بہوئیں جہیز کے لالچی گھروں میں آگ کے شعلے نہ پہنچیں۔

☆ شازیہ محسن

نورا دھوبی سر پر کپڑوں کی بھاری بھرکم گٹھڑی لئے دروازے پر سانکل کھٹکھٹا رہا تھا جب کھلنے میں کچھ دیر ہوئی تو اس نے گٹھڑی نیچے رکھ دی۔ بھوکے پیٹ ہارا تھکا جسم اتنے بوجھ کو لادے بھی کب تک کھڑا رہتا۔ اس نے گٹھڑی پر بیٹھ کر کچھ دیر دروازہ کھلنے کا انتظار کیا۔ سوچا دوپہر ہے۔ راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔ بہو بیٹے سو بھی سکتے ہیں اسی وقت اسے کانوں میں چوڑیوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوئی کھن کھناہٹ سنائی دی۔ اس نے کواڑوں کی درز سے اندر جھانک کر حقیقت کا جائزہ لیا۔ دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ گیا۔ صفیہ نل پر بیٹھی نہا رہی تھی۔

"یا اللہ، معاف کرنا"۔ ایک دم اس کے منہ سے نکلا۔ "بیٹے کی بیوی سسر کے لئے بیٹی جیسی ہوتی ہے حالانکہ میری نظر اور میرا خیال ناپاک نہیں ہے۔ مگر یہ بات گھر گرہستی کے اصول کے خلاف ہے"۔

اتنا بدبدا کے اس نے دروازے کی طرف پیٹھ پھیر لی تبھی نورا کے اندر کا مرد بولا جب تیری بیوی مر گئی تھی تو تُو نے اپنی بیٹی کی پرورش اور دیکھ بھال سب کچھ اپنے ہاتھوں سے تُو کی تھی تو اس کے کپڑے اتارتا تھا، نہلاتا تھا تو کیا اس وقت کے تیرے خیال اور نظروں میں کوئی فرق تھا؟

"کچھ بھی نہیں!" اس کے دل کی گہرائی سے آواز آئی۔

"پھر اتنا کیوں پچھتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں تو تُو بے خطا اور پاک دل انسان ہے، یونہی کسی پر بے ارادہ نظر پڑ جانے سے کوئی گناہگار تھوڑی ہی ہو جاتا ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہونا چاہیے کہ ان درزوں سے سڑک پر آنے جانے والے نہ جانے کتنے اور لوگ باآسانی تاک جھانک کرتے رہے ہوں گے۔ تُو نے تو بیٹی سمجھ کر نظریں بچالیں، غیر ایسا کیوں کرنے بیٹھا

ہے"۔

دل سے آنے والی اس آواز پر نورا بدبدانے لگا۔ "اگر میں نے پہلے کبھی اس بات پر دھیان دیا ہوتا تو ان کواڑوں کی مرمت کر کے درزیں بند ہو گئی ہوتیں۔ مگر میں تو کمانے کھانے ہی میں لگا رہتا ہوں۔ آج کی طرح کبھی ادھر خیال ہی نہیں گیا۔ مگر اب نہیں چوکوں گا اور کل دن نکلتے ہی بڑھئی کو بلا کر نئے سرے سے کواڑیں ٹھیک کرا کے ٹنگوا دوں گا اور ابھی کچھ نہیں تو بل پہ سے لکڑی کا برادہ لا کر ببول کے گوند کے پانی میں اس کو ملا کر لگدی سی بنا کر ان کواڑوں کی ہر درز بند کر دوں گا۔ کوئی درز ایسی نہیں چھوڑوں گا۔ جس سے باہر کا کوئی آدمی اندر جھانک کر کچھ بھی دیکھ سکے"۔

گٹھڑی پر بیٹھا نورا منصوبے بنا رہا تھا کہ صفیہ نے کواڑیں کھول دیں۔ اس نے حیرت۔ اور مسکراہٹ ملے سے نورا سے کہا۔

"ارے ابا آپ اتنی تیز گرمی اور دھوپ میں یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سمجھا راشد کے ابا نے زنجیر کھٹکھٹائی تھی"۔

صفیہ کی اس بات سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ اللہ دتہ گھر میں نہیں تھا اور اس نے زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز بھی سن لی تھی۔

"ہاں بیٹی!" نورا نے صفیہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کپڑے دھونے والوں کی قسمت میں سردی گرمی سبھی کچھ لکھا ہے۔ گھنٹوں گھاٹ پر دھوپ میں کھڑے کھڑے تپتے رہتے ہیں، گھڑی دو گھڑی یہاں بھی سہی"۔ پھر وہ گٹھڑی کو گھسیٹ کر اندر لے جانے لگا۔

"ابا! گٹھڑی بھاری ہے"۔ صفیہ نے اس سے کہا۔ "اس طرح گھسیٹنے سے کپڑے پھٹ جائیں گے، میں اٹھوائے دیتی ہوں"۔

"نہیں نہیں بیٹی!" نورا نے فوراً کہا۔ "تم کس حال سے ہو...... ایسی عورتوں کو بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اوپر کا کپڑا مضبوط ہے پھٹے گا نہیں...... اللہ دتہ کہیں باہر گیا ہے کیا؟"

"واجد کے ہاں عقیقہ ہے"۔ صفیہ نے کہا۔ "وہ صبح آپ کے پیچھے دعوت کر کے گئے تھے، وہیں گئے ہوئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے"۔

"تم نے کھانا کھا لیا؟"

گٹھڑی صحن میں لے جا کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے نورا نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ تیرے لئے کھانا لے کر آؤں گا، کھانا مت بنانا۔ اسی میں سے آپ بھی کھا لیں گے اور میں بھی، اس لئے کھانا بھی نہیں بنایا"۔ گھونگھٹ سنبھالتے ہوئے صفیہ نے کہا۔

"اچھا!" لفظ پر زور دیتے ہوئے کہہ کر نورا نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ صفیہ آگے بڑھ کر پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔

"نہیں بیٹی! تُو پنکھا مجھے دے دے"۔ نورا نے کہا۔ "میں اپنی ہوا خود کر لوں گا ورنہ میرا پسینہ تو سوکھ جائے گا اور تُو پسینے میں تر ہو جائے گی۔ ابھی ابھی نہائی ہے جا برآمدے میں ہوا کھا...... صفیہ کیا تُو روز نل ہی پر بیٹھ کر نہاتی ہے؟" ایک خیال کے ساتھ نورا نے سوال داغا۔

"نہیں ابا! بالٹی میں پانی لے جا کر اندر نہایا کرتی ہوں چونکہ آج گھر میں کوئی بھی نہیں تھا اس لئے یہیں بیٹھ کر نہائی تھی"۔ صفیہ نے بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

یہ سن کر نورا کو خوشی ہوئی اور اس کے دل میں جو شک تھا وہ نکل گیا۔ اب وہ مطمئن تھا کہ دوسروں کی نظروں سے گھر کی بے پردگی ہونے سے بچ گئی۔ اس

WWW.URDUBOOKS.NET

نے بیڑی سلگائی اور لمبا کش مارا۔ صفیہ اتنی دیر میں نل پر سے ٹھنڈا پانی لے آئی اور نورا کے آگے گلاس بڑھا دیا۔ جب اس نے پانی پی لیا تو حقیقت کو سمجھنے کے لئے صفیہ نے نورا سے سوال کیا۔ ''ابا! آپ کو کیسے پتا ہے کہ میں نل پر نہا رہی تھی؟''

''بیٹی! نہاتے وقت آدمی کے منہ سے طرح طرح کے سُر نکلتے ہیں۔ جسم پر پانی انڈیلنے اور اس کے بکھر کر چاروں طرف زمین پر گرنے کی آوازوں سے ایک اندھے کو بھی کسی کے نہانے کا اندازہ ہو جائے گا''۔ نورا نے اس طرح بات بنائی کہ صفیہ کو جھینپنے اور جھجکنے کا موقع نہ رہا۔ اس کے دل سے بھی یہ ڈر نکل گیا کہ ابا نے اس کو کواڑوں کی درزوں میں سے دیکھ لیا ہے۔

''ابا! آپ کو بھوک لگی ہو تو کھانا بنا دوں، ذرا سی دیر لگے گی؟ گھر میں سب کچھ ہے اور ایندھن بھی سوکھا ہے۔ ویسے وہ بھی آتے ہی ہوں گے''۔ چنی کی سلوٹ نکالتے ہوئے صفیہ نے کہا۔

''وہ کھانا لائے گا بھی تو ایک ہی کا لائے گا''۔ حقیقت سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے نورا نے کہا۔

''میں نے سنا تو نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ دعوت میں آپ کو بھی بلاوا آیا ہوگا''۔ صفیہ نے کہا۔

''دو کی دعوت کرنے والا ایک کو کیوں نظر انداز کر دے گا۔ جو گھر نہیں ہے ان کو چھوڑو اور مان بھی لو اگر آپ کی دعوت نہ بھی کی ہو تو ایک کا کھانا باندھنے والا اتنا ضرور باندھ دیتا ہے کہ دو کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ دیہات میں تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ شہروں کی بات دوسری ہے جو جائے گا وہ کھائے گا جو رہ گیا وہ پچھتائے گا''۔

''یہ تم ٹھیک کہتی ہو، صفیہ! مگر تم میرے لئے کھانا مت بناؤ بہت ہی گرمی ہے، آرام کرو۔ میں کھانا کھائے ہوئے ہوں۔ ایسا ہوا کہ میں ساجد کے گھر سے کپڑے لے کر آ رہا تھا، کھانے کا وقت تھا وہ کھانا کھا رہا تھا زبردستی سر ہو گیا اور کھانا کھانا پڑا۔ پیار کے ساتھ کسی کا اصرار ٹھکرایا بھی تو نہیں جاتا۔ وہ ایک ہوٹل میں ملازم ہے۔ تم جانتی ہو ایسے لوگوں کے کھاتے پلانے کے ڈھنگ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں''۔ نورا نے اس طرح بات بنائی کہ صفیہ کو یقین ہو گیا اور وہ نورا کے کھانے کی فکر سے بری ہو گئی۔

ڈنڈا اٹھا کر باہر جاتے ہوئے نورا نے کہا جو کپڑے رہ گئے ہیں انہیں بھی لے آؤں تم کواڑیں بند کر کے آرام کرو۔ ایسے موقع پر تمہاری ساس یاد آتی ہے وہ ہوتی تو تمہیں اکیلا پن نہ کھولتا۔ تینوں بہوئیں بھی ایک ہی ساتھ میکے چلی گئیں۔ ماں باپ سے ملنے کی ہمک میں بہوئیں گھر بار کی سب بھول جاتی ہیں۔ چلتی بار کسی نے بھی یہ نہیں سوچا کہ صفیہ کس حال سے ہے۔ ایسی حالت میں ایک نہ ایک کو یہاں رہنا ہی چاہئے تھا''۔ فکر مندی سے کہتا ہوا نورا گھر سے باہر چلا گیا۔

وہ ایک ہوٹل میں جس میں ساجد کام کرتا تھا، کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اس وقت ساجد بھی ڈیوٹی پر آ چکا تھا۔ نورا کو ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھاتے دیکھ کر ساجد نے حیرت سے کچھ کہا تو نہیں مگر اس کا ماتھا ٹھنکا کہ آج گھر میں کوئی ناقابل برداشت بات ضرور ہو گئی ہے ورنہ نورا ہوٹل میں کھانا کھانے والا آدمی کہاں تھا۔ بے چارے کی بیوی مر گئی ہے۔ بہو بیٹے اس زمانے میں کہاں اتنی دیکھ بھال کر پاتے ہیں۔ ساجد نے کام تو شام تک کیا مگر اس کے دل میں ایک سوال برابر کروٹیں بدلتا رہا۔ آخر وہ اس کا خاندانی دھوبی تھا۔ اس کے لئے وہ ہمدردی کیوں نہ کرتا۔ جب نورا کھانا کھا چکا تو اس نے نورا کا بل خود ادا کر دیا۔

''نورا! میں نے تمہارے کھانے کا بل ادا کر دیا ہے''۔ اس نے نورا سے کہا۔ ''یہ پیسے کپڑوں کی دھلائی سے کٹ جائیں گے''۔ ساجد نے جان بوجھ کر بل اس لئے ادا کر دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ گھر سے روٹھ کر آیا ہو اور اس کے پاس روپے پیسے نہ ہوں۔ دھلائی میں وضع ہونے کی بات اس لئے کہی تھی کہ وہ خوددار بہت تھا۔ مفت کھانا کھانے کو پسند نہ کرتا۔ نورا بھی ساجد کا منشا سمجھ گیا تھا اور مسکراتا ہوا کپڑے لینے چلا گیا۔

ساجد ایک سوال کے جواب کے لئے اتنا بے چین تھا کہ وہ ہر روز کی طرح اپنے گھر جانے کی بجائے کمان سے چھوٹے تیر کی طرح سیدھا نورا کے گھر پہنچا۔ اس وقت صفیہ اور اللہ دتہ دونوں ہی گھر میں موجود تھے۔ اللہ دتہ دیکھتے ہی بولا۔ ''کیسے تکلیف کی، ساجد بھائی؟''

''آج تمہارے گھر میں کوئی جھگڑا ہو گیا ہے جو نورا دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا؟'' ساجد نے سوال کیا۔

''دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے؟'' اللہ دتہ سے پہلے صفیہ نے سوالیہ انداز میں ساجد کے الفاظ دہرائے۔ پھر سوال کا جواب دیئے بغیر اس نے آگے کہنا شروع کیا۔ ''یہاں تو مجھے کہہ رہے تھے کہ میں ساجد کے گھر سے کھانا کھا کر آ رہا ہوں''۔

''وہ میرے گھر کپڑے لینے ضرور گئے تھے مگر کھانا وانا کچھ نہیں کھایا تھا''۔ ساجد نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔

ساجد کو اب بھی اس کے سوال کا جواب نہیں ملا تھا۔ مگر وہ سمجھ گیا کہ ضرور دال میں کالا ہے کسی کے گھریلو معاملات میں گہرائی تک جانا اسے مناسب نہ لگا اور وہ الجھا الجھا سا دل لئے اپنے گھر چلا آیا۔ شام بھی ہو رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں نورا گھر پہنچا تو کپڑوں کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بھاری بھرکم بوتلی صحن میں پٹک دی اور اس پر رکھے پانچ دس گتے کے ٹکڑے نیچے گر پڑے۔ ابھی کسی نے دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھانے والی بات نہیں چھیڑی تھی۔ وہ دونوں اس کے مزاج کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے۔

''ابا! یہ بھی دھلنے آئے ہیں کیا؟'' اللہ دتہ نے گتے کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کر کے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''نہیں بیٹے!'' نورا نے سنجیدگی سے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ان کو اندر کی طرف سے کواڑوں پر اس طرح چوبوں سے ٹھونکوں گا کہ کوئی باہر سے اندر درزوں میں سے تاک نہ سکے۔ جب ہاتھ میں پیسہ ہوگا تو ان کی مرمت کرا لوں گا۔ کم از کم صدر کی کواڑیں اور برقعہ کا نقاب تو صحیح سلامت ہونا چاہیے''۔

''ابا! آپ کے دماغ میں یہ بات آج ہی کیوں آئی؟'' اللہ دتہ نے پوچھا۔ ''ان کواڑوں میں درزیں تو برسوں سے تھیں؟''

نورا کے جواب دینے سے پہلے ہی صفیہ کے ہونٹ ہلے جیسے کہ اس کے سوال کا جواب نورا سے بہتر وہ دینا چاہتی تھی مگر فوراً اس اظہار خیال کے انجام سے خوفزدہ ہوگئی اور کچھ نہ کہا۔

''بیٹے! ہر کام کی کوئی گھڑی ہوتی ہے''۔ نورا بولا۔ ''وقت سے پہلے کچھ نہیں ہوتا اور اب اس کام کا وقت آ گیا ہے''۔

''ابا! آج آپ نے ہوٹل میں کھانا کیوں کھایا تھا؟'' اللہ دتہ نے سوال ٹونکا۔

''یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟'' نورا نے پوچھا۔

''ساجد نے بتایا تھا؟''

''اچھا وہ میرے گھر آنے سے پہلے یہاں ہو کر گیا ہے''۔ نورا نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات چھپی نہیں رہتی ہے جیسے دامن میں انگارہ اور گلشن میں فوارہ نہیں چھپتا''۔

''ہاں اور وہ یہ بھی کہہ کر گیا ہے کہ اس نے تمہیں اپنے گھر کھانا نہیں کھلایا تھا پھر اس کے گھر کھانا کھا کر آنے کا جھوٹا بہانہ صفیہ سے کیوں بنایا تھا؟'' اللہ دتہ نے پوچھا۔

''بیٹے! ایسے نہ کہتا تو کیا یہ مجھے ہوٹل میں کھانا کھانے جانے دیتی؟'' نورا نے رسانیت سے کہا۔ ''مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی، گرمی بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ صفیہ کو اس وقت آرام کی ضرورت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنی گرمی میں میرے لئے کھانا بنانے کو رسوئی میں جائے اور تمہارے کھانا لانے کے وقت کا انتظار میرے بس کا نہیں تھا۔ بہوئیں بڑے بھاگ سے ملتی ہیں بیٹا! انہیں جتنا بھی سکھ دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیٹیاں ماں باپ کی لاڈلی ہوتی ہیں اور ماں باپ کا لاڈ پیار چھوڑ کر آتی ہیں۔ کم از کم ان سے آدھا پیار تو یہاں بھی مل جانا چاہیے ورنہ ہمیں کیا یاد کریں گی''۔

''ابا! بہوئیں تو بڑے بھاگ سے ملتی ہیں اور بیٹے؟''

''بیٹے بھی بھاگ سے ملتے ہیں، کم و بیش بیٹے تو سبھی کو مل جاتے ہیں مگر بہوئیں سبھی کو نہیں ملتی ہیں۔ بیٹے کے بڑے ہونے پر ہی تو گھر میں بہو آتی ہے۔ نہ ہوا کسی کا بیٹا بڑا اور جوان تو بہو کہاں سے آ جائے گی؟ اس لئے بیٹے بھی بھاگ سے ملتے ہیں۔ مگر بہوئیں بڑے بھاگ سے ملتی ہیں''۔ یوں کہہ کر نورا نے بیڑی سلگائی۔

تبھی صفیہ منہ پھیر کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک نمازی کی طرح کھڑی ہوگئی شاید وہ فرشتہ سیرت، نیک دل سسر کی درازیٔ عمر کی دعا کر رہی تھی یا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہی تھی دنیا کی بہوؤں کے ایسے ہی سسر ہو جائیں تو یوں چاندی سی بہوئیں جہیز کے لالچی گھروں میں آگ کے شعلے نہ پہنیں۔

زیرِ نظر کہانی برِصغیر کی تقسیم کے دوران اخلاقیات، مذہب اور انسانیت جس طور اُجڑے اس کی داستان ہے۔ وہ دور جب برِصغیر کے درمیان خون کی ایک لکیر نے جنم لیا، کب کا تاریخ کے صفحات میں منتقل ہو چکا ہے مگر آج بھی اس عظیم سانحے کی کسک باقی ہے۔ شہزادہ علیم نے نہایت چابکدستی اور فنی صلاحیت کے ساتھ اس رُوداد کو قلم بند کیا ہے۔

کالو

ایک حقیقت ایک افسانہ

☆ پیر شہزادہ علیم معصومی

www.aiourdubooks.net

کالو جو اپنی ماں کی شرافت اور آباؤ اجداد کی دیانت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ خالص دراوڑ نقوش اور بناوٹ کا مجسمہ۔ اپنی اس خوبی سے بے بہرہ مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں ''جینے خاں'' میں رہتی ہے۔

ہاڑ کا مہینہ گرمی کا زور ایسے میں دو گھڑے پانی سے بھرے سر پر لادے کالو عین دوپہر کے وقت کھیت کی پگڈنڈی پر چلتی اپنے گھر کو جا رہی ہے۔ ایک تو کالو کا برسات کی گھنی گھٹا کی طرح سیاہ رنگ سورج کی روشنی کو اپنے اندر جذب ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ دوسرے اس سال کی گرمی کالو کے عہدِ شباب میں قدم رکھتے ہی آن ٹپکی تھی۔

پہلے کی نسبت امسال گرمی برداشت کرنا کالو کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دو گھڑوں کے اندر جتنا پانی تھا اس سے زیادہ پسینہ کالو کے بدن نے چھوڑا تھا اور اس کا لباس اس طرح تر ہو کر بدن کے ساتھ لپٹ گیا تھا گویا وہ پانی بھر کر نہیں آئی بلکہ کنوے میں ڈبکی لگا کر آئی ہے۔

یوں تو کالو سر پر گھڑے اٹھا کر چلنے میں مہارت رکھتی تھی مگر اب کے گھڑے سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ کالو کو بار بار اپنا لباس درست کرنا پڑتا مگر کہاں؟

یوں تو کالو صبح ہی یہ کام نمٹا لیتی مگر آج وہ دیر تک سوتی رہی اور اس کا انجام بھگتنا پڑا اور دیر تک سونا بھی بے وجہ نہیں تھا، ساری رات تو وہ سو نہ سکی۔ وہ تو سرگی جب اس کا ابا ''چیتا'' چودھریوں کے مویشی کھرلیوں پر باندھ کر گوہا اکٹھا کرنے کے لیے پھاوڑا لے کر نکلا اس کے بعد جانے کب جا کر کالو کی آنکھ لگی۔ اس کے خیال تو پہلے بھی آتے تھے پر اس جنم اشٹھمی کے میلے میں اس نے بھگوان کرشن اور رادھا کی کتھا سنی تو جیسے دل و دماغ پر ''وہ'' چھا گیا۔ شاید اس کے لاشعور نے اس کو ''کرشن بھگوان'' اور خود کو ''رادھا'' تصور کر لیا۔

یہ سارا اس میلے کا قصور تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ نہ بچپن میں اس کی ماں مرتی، نہ باپ لاڈ پیار کی وجہ سے اسے ڈھیل دیتا، نہ میلے پر جانے کی اجازت دیتا، نہ وہ رادھا کرشن کی کتھا سنتی جو جلتی پر تیل پڑتا اور نہ اس کی نیندیں حرام ہوتیں۔

بھلا ہو دن کا جو نکل آیا اور کاموں کاجوں میں کالو کا دھیان بٹا اور اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے کہ اب شام ہونے لگی۔ سوریہ دیو کا رتھ واپس سوریہ بھون کے پھاٹک میں داخل ہونے لگا، کالو کا دل ڈوبنے لگا، پہاڑ سی رات اور بے چینی۔ پھر اسے کسی نشئی کی طرح سرور آنے لگا کہ اب وہ اپنی چارپائی پر لیٹ کر مکمل سکون کے ساتھ تاروں بھری چھت کو گھورتے ہوئے چاند کی جگہ ''اس'' کا چہرہ دیکھے گی۔ اسی خیال سے پہاڑ سی رات گزرنے کی ڈھارس بندھی اور رات ہو گئی۔ ابے کو روٹی دے کر خود بھوک پیاس کے احساس سے مبرہ کالو چارپائی پر جا پڑی اور شفاف سرمئی آسمان کو گھورنے لگی۔

چارپائی پر لیٹتے ہی اسے احساس ہوا جیسے وہ سیج عروسی پر آن لیٹی ہے۔ اس احساس نے اسے مدہوش کر دیا، سکون کے ساتھ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور جذبات کے ابھرنے سے سانسوں میں تلاطم آ گیا مگر وہ کس کی سیج پر لیٹی ہے؟ اچانک جیسے اسے کسی نے جھنجھوڑا اور یکدم اس کی آنکھیں کھلیں اسے چوہدری حسین بخش خاں کے بیٹے علی احمد خاں کی صورت..... وہ موہنی صورت نظر آنے لگی۔ پھر اس نے خود کو دھتکارہ کہ آسمان اور زمین کا ملن ممکن نہیں۔

اسی بے خیالی میں وہ پھر آسمان کو گھورنے لگی تو اسے چاند نظر آیا جس میں علی احمد کی ہنستی مسکراتی ہوئی شبیہ ابھری۔ وہی بھولی شکل، گورا چٹا رنگ، ستواں

ناک، باریک نقوش اور موٹے لمبے نین جن کے اوپر باہم ملی ہوئی بھاری بھنویں اور تلواری مونچھیں، سر پر پگڑی اور کانوں پر گرے ہوئے لہریئے سیاہ بال۔ پھر اچانک وہ اسے ننھے بچے کی صورت میں نظر آنے لگا اور اچانک وہ اپنے بچپن میں چلی گئی۔ جب علی احمد اپنی مال مویشی والی حویلی میں آتا اور سیدھا اسی حصے میں آتا جہاں دو کوٹھوں میں کالو کے پریوار کا کل سنسار آباد تھا اور زیادہ تر کالو باہر صحن ہی میں کچھ نہ کچھ کھیل رہی ہوتی تھی پھر وہ دونوں مل کر کھیلتے۔

ایسا روزانہ شام اس وقت کو ہوتا جب گاؤں کا مولوی پیشی کی نماز پڑھانے جانے کے لئے چوہدری حسین بخش خاں کی مال مویشی والی حویلی سے گزرتا۔ کالو ہر روز اس وقت لازمی آنگن میں رہتی اور باقی سکھی، سہیلیوں سے گریز ہی کرتی۔ ہاں ڈیگر کی نماز کے وقت علی احمد چلا جاتا تو وہ بھی سہیلیوں کے ساتھ مل جاتی۔ بچپن کے خوابوں میں کھوئی کھوئی اچانک کالو بیدار ہوئی۔ اس نے اپنے دل میں ایک تازگی سی محسوس کی اسے خیال آیا کہ اگر وہ علی کا انتظار کرتی تھی تو وہ بھی تو بروقت ہر روز آتا تھا اور اب گو کہ وہ دونوں بڑے ہو چکے ہیں، باہم کھیلتے نہیں مگر آج بھی وہ حویلی میں آئے تو سیدھا اسی حصہ میں آتا ہے جہاں کالو کا آشیانہ ہے اور پھر کہیں اور جاتا ہے کالو کے سینے پر جیسے کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔

خیر اسی ادھیڑ بن میں رات کٹ گئی اور حسب سابق سرگی کالو کی آنکھ لگی۔

☆☆☆

بابا موج دریا شاہ اپنے تکیے پر بیٹھا سر دُھن رہا تھا اور پاس بیٹھا علی احمد پورن بھگت کا قصہ بڑے سوز کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ اللہ نے علی احمد کو آواز بھی داؤد کے طاؤس جیسی بخشی تھی۔

متھا جوگی دا ایڈا نوری سورج لاٹاں مارے
نین جوگی دے شربتی جیویں اسمانی تارے
نک جوگی دا ایڈا تیکھا سان چڑھی تلوار اے
ٹرجا رانیئے نال جوگی دے کلیاں چاڑ کے چارے

(جوگی (پورن) کا ماتھا ایسا نورانی خوبصورت ہے کہ جیسے سورج لشکارے مارتا ہے۔ آنکھیں ایسی چمکدار اور شربتی رنگ کی ہیں گویا آسمان کے ستارے ہوں۔ ناک ایسا ستواں جیسے سان پر تیز دھار ہوئی تلوار ہو۔ رانی! میں مشورہ دوں گی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جوگی کے ساتھ چلی جاؤ۔)

''واہ وا...... وسدا رہو پترا!'' بابے موج دریا شاہ نے علی احمد کو کہا اور علی احمد نے بابے کو ادب سے سلام کیا۔ اب وہ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

''بابا جی پورن جتی بڑا خوبصورت تھا؟'' علی احمد نے سوال کیا۔

''ہاں علی احمد! راجے سلوان کا وروانی پتر تھا۔ وہ جتی ستی راجپوت اور سچا سنت اور سچا بھگت۔ حُسن کے ساتھ پاکبازی ملے تو ایسے شہکار بنتے ہیں''۔ بابے نے جواب دیا۔

''تو آخر رانی سندراں کا کیا قصور تھا وہ تو پورن پر سچے دل سے عاشق تھی تو پورن جتی کیوں چلا گیا، اسے محلوں میں رلا کر؟'' علی احمد نے جلتا ہوا سوال داغا۔

''او کملیا! جو پہلے ہی کسی کو دل دے کر جان اس کے نام کر چکا ہو وہ کسی اور کے پیار کو کیسے قبول کر لے اور رانی سندراں نے جب پورن کو گورو بال ناتھ سے مانگ کر محل میں لا ن رکھا تو رات اس کے حسن پر ایمان ہار گئی۔ جتی کی لو سچے رب کے ساتھ سچی تھی، اس نے دعا کی کہ ربا سچیا! میری حیاتی کی محنت تیرے ہاتھ ہے۔ دعا قبول ہوئی اور رانی پر نیند غالب آ گئی۔ گورو کا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

وعدہ پورا ہوا اگلی سویرے پورن محلوں کو چھوڑ، جنگل کو نکلا۔ رانی تب بیدار ہوئی جب پورن جتی فصیل پار کر گیا۔ جھروکے سے جاتا پورن دیکھا تو اس طرح جھروکے سے ہی پورن کی طرف بھاگی جیسے زمین پر کھڑی ہو مگر وہ تو جھروکا تھا وہاں سے زمین پر گری اور ہجر کا سیک ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ جاتے پورن کو دیکھ کر رانی سندراں نے جھروکے سے کود کر جان دے دی۔ وہ تو بے خیالی میں گر پڑی تھی جیسے بے دھیانی میں مصر والیوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لی تھیں"۔ بابا جی نے تفصیل بتائی۔

"آج سمجھ میں آیا بابا جی! ورنہ میں تو رانی سندراں کو بھی قصوروار سمجھتا تھا کہ خودکشی کر لی پر وہ تو سچے عشق کے امتحان میں کھری اتری کہ ہوش کھو دیا"۔ علی احمد گویا ہوا۔

"آہو پتر! عاشق دو طرح کے ہی ڈھولے سر کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا پینڈا سیدھا سچے رب سے جا پڑے تو وہ سیدھے اس میں جا سماتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی آنکھ اس پر ٹھہرے جس کا پینڈا رب سوہنے کے ساتھ پڑ گیا ہو کیونکہ وہ فیر اس کے ذریعے سے رب سچے میں جا سماتے ہیں۔ کیوں کہ سوہنے کا وعدہ ہے جس نے جس کو حق سچ سے چاہا اس کا انجام اس بندے کے ساتھ ہوگا اور اس بندے کے طفیل آخیر وہ بھی رب سوہنے تک جا پہنچے گا"۔ بابا جی نے مزید تفصیل بتائی۔

علی احمد کو جیسے بات سمجھ آئی ہو اس طرح سر ہلایا اور پھر کسی خیال میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

چوہدری حسین بخش خاں حویلی آیا اور چیتے کو آواز دی۔ "چیتیا!"

چیتا بھاگتا ہوا آیا۔

جی چوہدری جی آیا چوہدری جی...... حکم سرکار!

"چیتیا! یار وہ کھوہ والے ڈیرے پر تین ہزار اینٹ پڑی ہے گڈا جوڑ کر وہ اینٹ اٹھا لا پھاگو چوہڑے اور جھیے جولاہے کو ساتھ لے لے اور آتا ہوا رحمے ترکھان کو میرا سنیہا دیتے آنا کہ میری گل سن جائے"۔ چوہدری حسین نے کہا۔

"ٹھیک ہے سرکار پر کرنا کیا ہے؟" چیتے نے پوچھا۔

"چیتیا! کالو دھی جوان ہو گئی ہے یار چنگا نہیں لگتا توں اب چار دیواری ڈل لے۔ پہلے تو تیرے گھر میں کوئی زنانی نہیں تھی اور بس اس پر عمل کر چیتیا!" چوہدری نے جواب دیا۔

"بھلا ہو سرکار تبر چوہدری جینے خاں دا وسدا رہے۔ وڈی حیاتی ہوو۔ چیتے نے دعائیں دیں اور جلدی سے چارپائی بچھا کر حقہ بھی لا سامنے رکھا اور خود گڈ جوڑنے لگا۔ چوہدری حقے کے کش بھرنے لگا۔

☆☆☆

دیوار بنے چار دن گزر گئے تھے، کالو بے چین ہوئی جا رہی تھی۔ دیوار کا نقصان یہ ہوا کہ اب اسے حویلی کے راستے نظر نہ آتے اور چار دن ہو گئے۔ علی احمد بھی دیوار تک آ کر آواز لگاتا چاچا چیتیا! اور کالو کے ابا سے کام کی بات کر کے مڑ جاتا جانے کیوں کالو کو دیوار اپنی سوکن لگنے لگی تھی۔ آخر چوہدری کو میری عزت کا خیال اتنا کیوں ہے۔ میں کوئی اس کی دھی ہوں؟

پر چوہدری کو کیا پتا کہ جس کی عزت کے لئے اس نے دیوار بنوائی ہے یہ دیوار اس کی جان لے رہی ہے۔ خیر اس نے دل سے اس خیال کو نکالا اور بھگوان سے اس کی معافی مانگی کہ اس نے دیوتا جیسے چوہدری کے بارے ایسا سوچا بھی کیوں۔

آج رات پھر وہ اسی کے بارے سوچ رہی تھی کہ آخر اس کے دل میں میرے لئے جگہ ہے یا نہیں تو اسے وہ دن یاد آیا جب وہ دیوار بنانے والوں کے لئے روٹی پانی نوکر کے ساتھ اٹھوا کر لایا۔ تو اچانک ان دونوں کی نظریں چار ہو گئیں۔ ان آنکھوں میں کچھ تھا اور پھر کالو ہی نے اس کی نظر کی تیزی کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھکا لی تھیں اور اب سوچتے ہوئے بھی مارے شرم کے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ پھر دل میں بے چینی ابھری کہ یہ پاگل پن ہے نہ مذہب ملے نہ ذات، نہ رتبہ نہ جائیداد نہ شکل ایک سی نہ نین نقش۔ تُو کیا سوچ رہی ہے کالو؟ کالو کے اندر سے سوال ابھرا۔ پر میں کیا کروں؟

"عشق نہ دیکھے محل منارے، عشق نہ پچھے ذاتاں"

یکدم کالو چارپائی سے اٹھی اور نیچے کمرے میں چلی گئی اور اپنے صندوق سے کرشن بھگوان کی موہنی مورت نکال کر صندوق پر رکھ لی۔

دروازے سے چاندنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی جس میں کرشن بھگوان کی مورت اور بھی سہانی دکھائی دے رہی تھی۔ اب کالو نے دونوں بازو صندوق پر ٹکا لئے کہ اس کا سینہ صندوق کے سامنے والی ڈھو کے ساتھ جا لگا اور تکنے لگی مرلی والے کو۔

"علی احمد! یہ کیا جادو کر دیا ہے تُو نے۔ صدیوں سے کالو کے بڑے بھولے ناتھ اور کالی ماتا کے پجاری تھے۔ کالو کو اب پتا نہیں کیوں بھگوان وشنو میں زیادہ شردھا بن گئی تھی اور وشنو اوتاروں میں کرشن بھگوان تو جیسے۔

یکدم ہوا کا جھونکا آیا جس نے کمرے کے دروازے کو ہلایا تو آواز پیدا ہوئی کالو جیسے واپس کمرے میں آ گئی۔ وہ تو بندرا بن میں تھی اپنے موہن کے ساتھ۔ خیر حواس قائم ہونے پر اس نے جلدی سے کرشن مورت صندوق میں چھپائی اور واپس چارپائی پر جا لیٹی۔

دل میں کہنے لگی کہ شکر ہے گاؤں مسلمانوں کا ہے اور چوہدری بھی مسلمان ہیں۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کو پتا چلے کہ ایک شودر لڑکی نے بھگوان کی مورت گھر میں رکھی ہوئی ہے تو سارے گھر کو باپ بیٹی سمیت جلا دیں اور پھر جا کر گنگا اشنان کریں۔ اب پھر وہی رات وہی خیال وہی چاند۔

☆☆☆

چوہدری حسین بخش خاں کا بیٹا طفیل محمد خاں جو تھانیدار تھا اور جالندھر شہر میں تعینات تھا، چھٹی آیا ہوا تھا۔ آج سویرے سویرے ہی حویلی آن پہنچا اور مال مویشی دیکھے پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جھیے جولائے نے چوہدری کو لسی لا کر پیش کی۔ ادھر چیتا جلدی جلدی پھاوڑا مارنے لگا اور جلدی کام ختم کر کے ہاتھ پاؤں دھو کر طفیل محمد خاں کے پاس زمین پر جا بیٹھا اور چوہدری کے تھانیدار بیٹے سے خیر خیریت دریافت کی۔ پھر اس طرح مدعا بیان کرنا شروع کیا۔

طفیل خاں! تُو تو بڑا افسر ہے اور شہر میں ون پونے لوگ بھی دیکھتا ہے، میرا بھی ایک کام کر دے۔

بول چاچا! طفیل محمد خاں سعادت مندی سے بولا۔

طفیل خاں! کالو دِھی جوان ہو گئی ہے۔ کوئی خاندانی سے چوہڑے دیکھ اس کے ویاہ کے لئے۔ چیتے نے نہایت سادگی سے کہا۔

چاچا! چوہڑوں کے وی خاندان ہوتے ہیں بھلا؟ طفیل خاں نے اتنی ہی سادگی سے سوال کیا۔

چیتے نے گہری سانس لی اور زمین پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "چوہڑے بھی تو بندے ہی ہوتے ہیں۔ کیڑوں کاڈھوں کے وی خاندان ہوتے ہیں طفیل

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خاں!"

طفیل خاں کو جسے یہ بات بڑی پسند آئی اور دل کو لگی اور وہ سر اثبات میں ہلا کر خاموش رہ گیا جیسے کالو کے لئے رشتہ ڈھونڈے گا۔

☆☆☆

اے جادوگراں دا چیلا جادوگرنی ایدی ماں
اے تے اگ بجن دی جاندا پورا ئمیں سڑیا تاں
میں دھرم راج دی کچہری تاں ہی رولی پاں
تیری گرک کچہری راجیا جیتھے ہے ئمیں عدل نیاں

(ترجمہ: یہ جادوگروں کا شاگرد ہے اور اس کی ماں بھی جادوگرنی ہے۔ یہ آگ کو بس میں کرنا جانتا ہے۔ اسی لئے ذرہ بھی نہیں جلا۔ میں دھرم راج کے دربار میں جا کر شور مچاؤں گی اور جا، تیرا دربار غرق ہو جس میں عدل و انصاف نہیں ہے۔)

علی احمد بابے موج دریا شاہ کے تکیئے پر بیٹھا آج پورن جتی کے قصے کا یہ پاٹ پڑھ رہا تھا اور بابے نے ہزاروں دعائیں دے کر آج کے لئے اتنا کافی ہونے کا اعلان کیا۔

بابا جی! رانی لونا نے بھی بڑا ظلم کمایا؟
علی احمد نے پھر سوال کیا۔

او جھلیا وہ تو ہمیں نظر آتا ہے اگر لونا، پورن پر الزام نہ لگاتی تو پورن کو گرو بال ناتھ جیسا گرو اور جوگ کہاں سے ملتا؟ اور فیر رانی سندراں کا انجام بالخیر کیسے ہوتا اور فیر الزام لگانے سے پہلے لونا پورن کو ورغلانے کی کوشش نہ کرتی تو جتی کا امتحان کیسے ہوتا اور امتحان نہ ہوتا تو جتی کامیاب کیسے ہوتا؟ بابے موج دریا نے علم کے موتی بکھیرے۔

ہاں تو اس کا حال زلیخا جیسا ہوا نا بابا جی! علی احمد نے رائے ظاہر کی۔

تم کہہ وی سکتے ہو پر ایک فرق وی ہے اور بہت بڑا فرق ہے۔ زلیخا کے عشق نے یوسف کو محلوں میں پہنچا دیا اور لونا کے عشق نے پورن سے محل چھڑوا دیا اور یہ بات ہے کہ یوسف جنگلوں میں پیدا ہوا تھا۔ محلوں میں پہنچ گیا اور پورن محلوں میں پیدا ہوا تھا جنگلوں میں پہنچ گیا۔ یہ سب عشق کے چکر ہیں پترا۔ حالانکہ نہ یوسف نے عشق کیا نہ پورن نے۔ یوسف کو بھی چاہا گیا اور پورن کو بھی۔ تو عشق کا اثر صرف چاہنے سے ہی نہیں ہوتا بلکہ چاہے جانے سے بھی ہوتا ہے۔ چاہے جانے والے کو پاویں پتا ہو یا نہ ہو۔ بابا جی نے علی احمد کو حیران کر دیا۔

رب اور عشق کا کیا جوڑ ہے بابا جی؟ آخر علی احمد نے پوچھا۔

او پتر! جو مکھن کا کاڑھنی اور رڑکنی سے ہے۔ بابا جی گویا ہوئے۔ علی احمد۔

بابا جی مکھن اور رب کی بات کیسے ایک جیسی ہے؟

پتر جیسے دودھ کے اندر مکھن ہوتا ہے پر جب تک دودھ کاڑھنی میں کڑھے نہ، رڑکنی میں رڑکا نہ جائے تو مکھن نہیں نکلتا۔ اسی طرح بندے کے اندر رب ہے، جب تک بندہ عشق کی آگ میں کڑھے نہ اور ہجر کی رڑکنی میں رڑکا نہ جائے رب نہیں ملتا۔ بابا جی نے فیضانِ علم عطا کیا۔

علی احمد دیر تک تکیے پر اپنے آپ سے یہی دہراتا رہا کہ کاڑھنی، دودھ، رڑکنی، مکھن، رب اور بندہ۔

☆☆☆

آج بھی علی احمد کی آنکھ تہجد کے وقت کھل گئی حالانکہ اس کا ارادہ آج فجر تک سونے کا تھا۔ اس کو تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ کچھ دیر اور سو لے مگر چین نصیب نہ ہوا۔ آخر مسجد کو چل پڑا گھر سے کپڑے اٹھا کر۔ مسجد کے نل تلے نہایا اور نماز تہجد ادا کی۔ اس وقت اس کے سوا مسجد میں کوئی بھی نہ

تھا۔ آج مولوی صاحب بھی تشریف نہ لائے تھے۔ وہ تو شکر ہے مسجد کی چابیاں علی احمد کے پاس ہی ہوتی تھیں۔

نماز سے فارغ ہو کر دیئے کی مدھم روشنی میں علی احمد تسبیح کرنے لگا تو اسے اچانک محسوس ہوا کہ جیسے مسجد میں اس کے سوا بھی کوئی موجود ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید کوئی نمازی ہو مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

پھر دھیان تسبیح پر لگایا مگر پھر وہی احساس۔ اب محراب میں ایک نورانی ہیولہ بھی نمایاں ہوا۔ علی احمد کا مضبوط دل اور تگڑے اعصاب اس کا ساتھ چھوڑ گئے مگر اپنی نیکی کا احساس اور پاک جگہ پر موجودگی نے اسے حوصلہ عطا کیا اور وہ پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اب ہیولہ، جو کسی بارعب مردِ کامل کا لگ رہا تھا، اس سے مخاطب ہوا۔ علی احمد تجھے رب کی تلاش ہے؟

علی احمد نے جواب دیا۔ ہا...... ہاں۔

تو پھر اپنی کھوج میں نکل جا۔ ہیولے نے نیا سندیسہ سنایا۔

میں...... میں رب کو پانا چاہتا ہوں۔ علی احمد نے اپنی حیرت اور خوف پر قابو پا کر جواب دیا۔

تُو بھی رب ہے، کوئی تجھے اپنا چاہتا ہے۔ ہیولے نے پھر کچھ کہا جو علی احمد کے سر سے گزر گیا۔

میں...... میں...... بندہ ہوں...... رب وہ ہے۔ علی احمد نے کہا۔

وہ کون؟ ہیولہ مخاطب ہوا۔

وہ اور ہے مجھے نہیں پتا۔ علی احمد نے جواب دیا۔

تُو نے پھر توحید کا انکار کیا۔ تیری منزل بہت دور ہے، ابھی راستہ لمبا ہے، جا سفر کی تیاری کر۔ یہ کہہ کر ہیولہ غائب ہو گیا اور علی احمد پر غشی طاری ہو گیا۔

☆☆☆

چوہدری...... او چوہدری!

ہوں...... کون ہے؟ یہ کہہ کر علی احمد نے آنکھیں کھولیں تو مولوی شریف الدین اس پر جھکا ہوا تھا۔

چوہدری! تہجد پڑھ کر یہیں سو گئے آج؟ اٹھو فجر پڑھ لو اور گھر جا کر سو لو کچھ دیر۔ مولوی نے کہا۔

نماز ہوئی اور پھر سارے مسجد کے صحن ہی میں بیٹھ گئے۔ چوہدری حسین بخش اور چوہدری امام دین نے باری باری سب لوگوں کو صورتِ حال بتائی کہ اب گاؤں میں رکنا ممکن نہیں رہا کیونکہ آج تک پاکستان بننے کا اثر ان پر نہ ہوا تھا۔ کیونکہ مہاراج نے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی رعایا کی اکثریت مسلمان تھی اور ریاست میں امن قائم رکھنے کے وسیع تر انتظامات کئے گئے تھے۔

مگر اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے اور مہاراجہ کپورتھلہ کو زہر دے دیا گیا ہے۔ جگجیت سنگھ راجا بنا ہے اس نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا ہے اور سنگٹھن والوں نے ہریانہ سے بلوائی جتھے منگوائے ہیں تا کہ مسلمانوں کے ساتھ آڑھے ہاتھوں نمٹا جائے۔ اس سے یہ ہوا کہ مقامی سکھ جو نہ صرف رو رعایت برت رہے تھے بلکہ ہماری حفاظت بھی کر رہے تھے، اب ہمارا ساتھ نہ دے سکیں گے اور پھر بلوائیوں کو بھارتی فوج کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ان حالات میں ہجرت ناگزیر ہے۔ جلد از جلد ہمیں پاکستان کی طرف روانہ ہونا ہو گا۔ اس کے بعد گاؤں کے پہرے کے لئے سب جوانوں کو کہا گیا اور بڑے بوڑھوں کو سامان باندھنے کا کام ذمے لگایا گیا۔ اچانک علی احمد کے اندر جیسے طوفان آ گیا۔

کیا وہ سفر...... تو یہ ہے وہ سفر؟

اب اسے یہ بات کھانے لگی کہ اگر میں سچا عالم ہوتا تو رات ثابت قدم رہتا اور شاید سب لوگوں پر یہ مصیبت نہ پڑتی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

☆☆☆

کالو...... نی کالو! اٹھ جا کڑیے، اٹھ جا...... گاؤں پر مصیبت آن پڑی ہے۔ مہاراج کو زہر دے دیا گیا ہے، چوہدری پاکستان جا رہے ہیں۔ چیتے نے کہا۔

کالو کے کانوں پر جیسے بجلی گر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چیتے سے تفصیلات جاننا چاہیں مگر وہ نیچے جا چکا تھا۔

کالو کے اعصاب ٹھکانے آئے تو اس نے دیکھا ساری چارپائی گیلی تھی اس نے کھیس اتارے اسے جسم میں تھکاوٹ محسوس ہوئی اور پھر اچانک رات کا حسین سماں یاد آیا۔ ارے علی احمد کس وقت گیا؟

کیا وہ آیا بھی تھا؟ ارے، یہ تو میرا خیال تھا۔ شاید یہ کالو کے عشق کی تکمیل تھی کہ اسے خود میں علی احمد نظر آ گیا تھا۔

مگر علی احمد وہ بدنصیب عاشق تھا جسے خود میں رب ابھی تک نظر نہ آتا تھا۔

مجھے خود...... خود...... میں علی احمد دِکھا۔ کالو نے سوچا۔ ہاں۔ کالو کے دل سے جواب آیا۔

پھر اس کا دھیان اس کے لیتے کی باتوں پر گیا۔ مصیبت...... چوہدری پاکستان جا رہے ہیں۔

یہ پاکستان کا نام تو کالو نے سنا تھا مگر ساتھ یہ بھی سنا تھا کہ ہمارے علاقے میں امن ہے، مہاراج نے کہہ دیا ہے کہ ریاست پاکستان میں شامل ہوگی اور کوئی بدامنی نہیں کرے گا۔ اب کیا ہوا؟ ہاں مہاراج ہی قتل ہو گئے۔ بدامنی یہیں سے شروع ہوگی۔ چوہدری چلے گئے تو علی احمد بھی۔ نہیں۔ اس خیال نے کالو کو پاگل بنا دیا اور وہ چوہدریوں کی حویلیوں کی جانب بھاگی لیکن آدھ راستے آ کر نہ جانے کیاں خیال آیا کہ رک گئی اور دھیرے دھیرے واپس پلٹنے لگی مگر اب اس کے آنسو اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

☆☆☆

چوہدری حسین بخش گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں آیا جہاں علی احمد چار اور جوانوں کے ساتھ پہرا دے رہا تھا۔ چوہدری حسین بخش خاں نے پہنچتے ہی تیزی سے کہا۔ اب پہرا چھوڑ دو کوئی فائدہ نہیں ہمیں آج، ابھی اور اسی وقت نکلنا ہوگا۔ اپنے اپنے گڈ تیار کرو، ان کے اوپر ٹاپے لگاؤ اور چادریں باندھ کر پردہ بناؤ۔ ان میں عورتوں کو سوار کراؤ۔ خیال رہے کوئی عورت زیور نہ رکھے کوئی فائدہ نہیں روپے اور زیور کا سوائے لوٹ کی دعوت کے، اناج کی چند بوریاں رکھو مرد گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ اور نکلو جلدی جلدی۔

مگر جانا کہاں ہے میاں جی؟ علی احمد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بارے پوچھا۔

''جہاں امر ہے''۔ چوہدری حسین بخش نے جواب دیا۔

آناً فاناً یہ قافلہ گاؤں سے نکل پڑا چوہدریوں کی عورتیں پردہ دار بیل گاڑیوں پر مرد گھوڑوں پر سوار تھے۔ کچھ پیدل بھی تھے۔ پیچھے مسلمان کمی ریڑھوں اور گدھوں پر سوار تھے اور چوہڑے جو غیر مسلم تھے، وہ پاکستان نہیں لے جائے جا رہے تھے مگر وہ سب عورتیں، مرد بین کرتے ہوئے اس قافلے کو الوداع کرنے کے لئے ساتھ ساتھ چلتے آ رہے تھے۔ قیامت کا سماں تھا۔ ایک میل آگے جا کر چوہدری امام دین، جو کہ چوہدری حسین بخش کے علاوہ گاؤں کا سرکردہ چوہدری تھا، دونوں کی سورگی مہاراج تک رسائی تھی، نے قافلے کو رکنے کا کہا۔

اور چوہڑوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''تمہاری ان گنت پیڑیوں نے ہماری ان گنت پیڑیوں کی سیوا کی ہے اور ہم نے بھی تم کو اولاد کی طرح سمجھا

ہے پر ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ اب جاؤ واپس جاؤ۔ یہ سب برے وقت کے جھگڑے ہیں جب حالات ٹھیک ہوئے ہم واپس آئیں گے اور اپنے گھروں میں پہلے کی طرح آباد ہوں گے۔ پر تم لوگوں نے ہماری جو سیوا کی ہے اس کا صلہ ہم نہیں دے سکتے۔ پھر بھی سب چوہدریوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہمارے گھروں کا تمام سامان مع زیورات اور ڈھور ڈنگر یہ سب تمہارے ہیں، بس تم ہمارے گھروں کی حفاظت کرنا جب تک ہم واپس نہ آجائیں اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے یہ سب آج سے تمہارا ہے۔ ہمارے واپس آنے کے بعد بھی تمہارا ہے۔ بس اب لوٹ جاؤ، ہمیں آگے جانا ہے۔ جانے انجانے ہم سے کبھی تمہاری دل شکنیاں ہوگئی ہوں تو اوپر والے کے واسطے ہمیں معاف کر دینا"۔ اتنا کہہ کر چوہدری امام دین خاں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر سے بلند کئے۔ اس پر آہ و بکا اور ہچکیوں کی آوازیں فلک شگاف ہوگئیں اور چھیتے نے رندھی ہوئی آواز سے کہا۔

"چوہدری! اس سے اچھا تھا تُو ہمیں قتل کر دیتا"۔ اور ساتھ ہی چھیتے نے ہاتھ جوڑ کر بلند کئے۔

پھر تو سارے چوہڑوں نے اس کی تقلید کی۔ امام دین خاں نے آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لئے فوراً گھوڑا پلٹایا اور آگے بڑھ کر حکم دیا کہ کوچ کرو۔

☆☆☆

علی احمد اپنے گھوڑے چنن پر سوار دور تک پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اسے آخری بار دیکھنے تک کالو نظر آئی جو اپنے باپ کے پہلو میں کھڑی روتی جا رہی تھی اور مسلسل دیکھتی جا رہی تھی۔ ان کو جو کل تک اس جگہ کے مالک اور وارث تھے، آج اپنے ہی وطن میں غریب الوطن اور ایسے مسافر ہیں جن کی منزل کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

☆☆☆

پہلا پڑاؤ گاؤں سے بتیس میل پر ہوا کیونکہ اندھیرا پڑ رہا تھا اور آگے وسیع بیلہ تھا۔ رات میں بیلے کا سفر ان حالات میں قطعاً نامناسب تھا۔ چوہدری حسین بخش خاں اور چوہدری امام دین خاں نے قیام کا فیصلہ کیا۔ بیل گاڑیوں کو کھول کر ساتھ ساتھ جوڑا گیا جس سے ایک اووٹ، ایک فصیل تیار ہوئی۔ اس چاردیواری سی میں عورتوں اور بچوں کو اتارا گیا۔ ایک جگہ گزرگاہ رکھی گئی جس کے سامنے بڑے بوڑھے بیٹھ گئے اور جوان فصیل کے چاروں طرف پھیل کر پہرہ دینے لگے۔ جب کہ بیل اور گھوڑے، گھوڑیاں درختوں، جھاڑیوں کے ساتھ باندھ دیئے گئے۔ گڈوں کی اس فصیل کے باہر کمیوں کی ریڑھیاں بھی قطار میں کھڑی کر دی گئیں اور ریڑھیوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ لوگ ریڑھیوں کو سہارے سے کھڑا کر کے ان کے اوپر دراز ہوگئے۔

☆☆☆

بڑوں کی محفل میں کم از کم پینتالیس، پچاس افراد بیٹھے تھے مگر کمال کا سکوت چھایا ہوا تھا، سب کے سب خاموش۔

یہ وہی تھے کہ جب رات کے اسی وقت چوپال پر بیٹھتے تو ان کا ٹھٹھہ مذاق میلوں اور دور سنائی دیتا۔ آج نہ کوئی بولتا ہے نہ بلاتا ہے۔ کوئی زمین پر نظریں گاڑھے بیٹھا ہے تو کوئی آسمان پر نگاہیں گھما رہا ہے۔ ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی طاقت کسی میں نہیں۔

آخر شیر خاں نے سکوت توڑا اور یوں گویا ہوا۔

"کچھ ڈوڈے تو میں نے رکھ لئے ہیں مگر دودھ کہاں سے آئے گا اور اگر میں نے کچھ ڈوڈے نہ پیئے تو مر جاؤں گا"۔

یہاں حالت کیا ہے ہماری کچھ اندازہ ہے؟ دیکھا چھوڑ آئے ہیں اور آگا ہے نہیں، جانے کیا کیا ہونے والا ہے اور تمہیں ڈوڈے پینے کی فکر پڑ گئی ہے۔ چوہدری حسین بخش نے اپنے پوستی بھائی شیر خاں کو ڈانٹا۔

شیر خاں بڑے بھائی سے ڈرتا بھی تھا اور اس کا احترام بھی کرتا تھا مگر آج بات اس کی کمزوری کی تھی صبر نہ کر سکا۔ پھر بولا۔ پائی! میں بھی جانتا ہوں سارے حالات کو مگر میں مجبور ہوں اور اپنی مجبوری ظاہر کی ہے، میں مر جاؤں گا ڈوڈے نہ ملے تو۔

چوہدری حسین بخش کچھ کہنے لگا تو اسے روک کر چوہدری امام دین بولا۔ ناراض نہ ہو چوہدری حسین بخشا یہ سچ کہتا ہے، اس کا قصور نہیں۔ رات ہم یہاں قیام کریں گے اس کا کچھ حل نکالنا پڑے گا۔ یوں کرتے ہیں کہ دو جوانوں کو پیچھے بھیجتے ہیں ابھی بلوائی تو یہاں پہنچے نہیں اور پہلا پڑاؤ ہے اور آگے جائیں گے تو ناممکن ہوگا۔ دو جوان پنڈ سے ایک پرانی لیاری بھینس کھول لائیں تو اس کا کام چلتا رہے گا۔ راستے میں کہاں سے دودھ اس کو لے کر دیں گے اور پھر یہ تو سچا ہے اگر ڈوڈے نہ پیئے گا تو مر جائے گا۔ اب تو غصہ چھوڑ دے اور اجازت دے میں کرم حسین اور عباد علی کو بھیجتا ہوں چوہدری امام دین خاں نے اپنے بیٹے اور بھتیجے کو بھیجنے کا فیصلہ سنایا۔

اس پر چوہدری حسین بخش خاں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس ترمیم کے ساتھ شرط مان لی کہ کرم حسین کے ساتھ عباد علی نہیں بلکہ علی احمد جائے گا۔ امام دین خاں نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ چوہدری امام دین نے دونوں جوانوں کو بلایا جلدی دونوں حاضر ہو گئے اور امام دین خاں نے ہی حکم سناتے ہوئے دونوں جوانوں کو ساری روداد سے بھی آگاہ کر دیا۔

تحمل کے ساتھ سارا معاملہ سننے کے بعد علی احمد گویا ہوا۔ ماما جی۔ اس نے امام دین (جو رشتے میں اس کا ماما لگتا تھا) کو مخاطب کیا۔ آپ اللہ اللہ کریں اور مجھے دعا دیں کرم حسین خاں کا یہاں رکنا زیادہ ضروری ہے۔ مجھے اجازت دیں اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں یہ چھوٹا سا کام ہے، میں اکیلا ہی کر کے آجاتا ہوں اور پھر اس نے پُراعتماد نظروں سے پہلے ماے اور پھر باپ کو دیکھا۔ چوہدری امام دین کچھ کہنے لگا تو علی احمد باپ کو دیکھ کر گویا ہوا۔ میاں جی! ماے کو بتائیں کہ میں کھرا سوار اور سچا گتکا باز ہوں اگر کوئی مصیبت بن بھی گئی تو اکو نعرۂ حیدری کافی ہے۔ یہ ساری گفتگو سن کر حسین بخش خاں کے دل میں بھی اکیلے بیٹے کو روانہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے سوچا کہ ہمارے گھر کی مصیبت خواہ مخواہ چوہدری امام دین بھی اٹھا رہا ہے۔ اچھا ہے کہ وہ بے چارے تو بچیں کم سے کم۔ یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد چوہدری حسین بخش نے چوہدری امام دین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

پائیا! جوان ٹھیک کہتا ہے۔ پچھلی وساکھی یاد کر. پورے جالندھر میں کوئی جوان نہیں نکلا تیرے بھانجے کے مقابلے پہ۔

یہ سن کر امام دین خاں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ اچھا بھئی تم ڈاڈھے راجپوت ہو بھئی۔ چنگا پتر! اللہ دی امان۔

پھڑ یہ پتر روپئے۔ امام دین نے کھیسے سے بیس روپے نکال کر علی احمد کی طرف بڑھائے۔

یہ کس واسطے ماما؟

او پترا سارا مال ہم چوہڑوں کو بخش آئے ہیں اچھا نہیں لگتا اب کوئی چیز موڑتے ہوئے۔ پتر جو بھینس اچھی لگے وہ جس کے پاس بھی ہو اسے یہ پیسے زبردستی دے آنا ورنہ پھینک کے آجانا اس کے سامنے۔ میں نے یہ روپئے احتیاطاً رکھ لئے تھے کام آگئے۔

علی احمد نے باپ کی طرف دیکھا ہے۔ چوہدری حسین اثبات میں سر ہلایا تو علی احمد نے روپیئے لے کر جیب میں ڈال لئے۔

علی احمد خوشی سے بولا۔ ”لے ماما میں اور میرا چنن ابھی گئے اور وعدہ نبھایا“۔ اور پھر علی احمد اپنے گھوڑے پر زین ڈالنے لگا۔

اس موضوع کلام کے حل ہونے کے ساتھ امام دین نے حسین بخش کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ جیسے بڑی دیر سے پوچھنا چاہ رہا ہو۔

حسین بخشا! بابا موج دریا نے تیرے کن میں کیا کہا تھا تیاری ویلے؟ اور فیر تیرے سیدھے ہاتھ پر کیا پھوکی جارہے تھے؟

حسین بخش نے مسکرا کر جواب دیا۔ او کچھ نہیں پائیا! فقیر موج میں تھا۔ کوئی نیکی کی نصیحت ہی کر رہا تھا اور دعائیں دے رہا تھا۔

چنگا پائیا نہ دس ویسے بھی تیرے اور بابے موج دریا کے یارانے بڑے ڈوہنگے ہیں۔ جو فقیر مہاراج کے آنے پر بھی کھڑا نہیں ہوتا تیرے پتروں کا کھڑا بنا ہوتا تھا بچپن میں، تُو ڈاڈھا ہے بھئی حسین بخشا! چوہدری امام دین نے مفصل بتایا۔

او نہیں نہیں پائیا! تُو اویں پریشان ہو گیا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے وقت آنے پر تم سب کو بتاؤں گا۔ بابوں نے وہ تھاں دکھائی تھی مجھے جہاں جا کر آباد ہونا ہے اور وہاں کے ایک فقیر کے سپرد کیا ہے مجھے وہ تھاں اور فقیر تم سب پر ظاہر کرنا ہے اس لئے پردے کی کوئی بات نہیں اور ہاں یہ تو سچ ہے کے رب کا کرم اور بابے کی مہر ہے مجھ پر۔ چوہدری حسین بخش نے مسکراتے ہوئے سارا حال سنا دیا۔

لے بھئی دل کے سارے وہم دور ہو گئے چوہدری! میں بھول ہی گیا تھا کہ میرا سنگ کوئی عام بندہ نہیں ہے۔ امام دین کہنے لگا۔

او توں وی پائیا مینوں بلاوجہ ہی آسمان پر چڑھائی رکھتا ہے۔ حسین بخش پھر ہنسا۔

☆☆☆

علی احمد گھوڑا تیار کرنے میں مگن تھا اور ساتھ ہی ساتھ دُلے بھٹی کی وار کے بول گنگنا رہا تھا۔

اج چڑھو گا پت رجپوت دا
اج مغلاں دے ٹانیں نے ٹاہ اوئے
نفرا لکی نوں پیڑ لیا اوئے
جیڑا دیو قلعے نوں ٹاہ اوئے

(ترجمہ: آج راجپوت کا بیٹا حملے کرے گا اور مغلوں کے غرور مٹی میں ملا دے گا۔ اے سائیس میرے گھوڑے لکی پر زین کس لاؤ جو قلعہ گرا دے گا۔)

جب چنن سج چکا تو علی احمد نے رکاب میں پاؤں رکھا اور سوار ہونے کا ارادہ کیا تو اسے اچانک خیال آیا کہ میں جو دُلے کی وار کا بند پڑھ رہا تھا۔ اس حملے کے بعد دُلا شہید ہو گیا تھا۔ یہ اچھا شگون نہیں۔ پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کہ میں جنگ پر نہیں جا رہا۔ صرف اپنے گاؤں سے اپنی بھینس ہی تو لینے جا رہا ہوں۔ جو لمبے رسے سے باندھ کر اپنے گھوڑے کے پیچھے آہستہ آہستہ میں پڑاؤ تک لے آؤں گا اور ہو سکا تو کالو کو الوداع کہہ آؤں گا۔

علی احمد کے لاشعور سے اچانک کالو کا تصور اس کے شعور میں عود آیا۔ اس خیال کے آنے کے ساتھ ہی علی احمد کے ہاتھ تیزی سے حرکت میں آئے، چنن کو تھاپڑا دیا دُلدُل اسوار کا نام لینے کی بجائے نہ جانے آج مرتجز اسوار کا نام نکلا اس کے منہ سے خیر وہ اسی کا نام لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے لگام کھینچ کر ایڑھی لگائی تو گھوڑا ہوہو گیا۔

☆☆☆

کالو کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ کسی طرح خود کو سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی اور اوپر سے ظلم یہ تھا کہ اسے اپنے ابے سے بھی اپنے حال کو چھپانا پڑتا تھا۔ چیتا بھی غم سے نڈھال تھا مگر کالو کی تو حالت ہی اور تھی۔ خیر یکدم کالو کے اندر کی ماں جاگی اور اپنے ابے کو بچہ تصور کرنے لگی اور اس کی بھوک کے یاد آنے پر اپنے غم کو سنبھالا دیا۔ لاشعوری طور پر کالو نے چولہا تازہ کیا اور سویر کی باسی روٹی گرم کر کے وہاں آ گئی جہاں چیتا بے حس و حرکت زمین پر بیٹھا تھا اور سامنے لگے پیپل کے درخت کو گھور رہا تھا، جو چوہدری بابا جیو نے خاں کے ہاتھ کا لگا ہوا تھا وہ بابا جی ان چوہدریوں کے وہی بڑے تھے جنہوں نے گاؤں ”جیئے خاں“ باندھا تھا۔ ابا...... ابا!

ہوں...... کیا ہے پترا؟ چیتا بولا۔

ابا تھوڑی سی روٹی کھا لے۔

کالو نے اتنا کہہ کر چنگیر اس کے سامنے رکھی اور خود پانی کا کٹورا بھرنے چلی گئی۔ جب پانی لے کر آئی تو دیکھا کہ اس کا ابا پہلے والی ہی حالت میں بیٹھا ہے۔ کالو نے کٹورہ بھی اس کے سامنے رکھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھر پکارا۔

ابا روٹی کھا لے۔

نہیں پترا اوئے...... نہیں گزرتی گلے سے۔ چیتا ایسے بولا جیسے نیند میں ہو اور ساتھ ہی ہچکیاں لینے لگا۔

کالو بھی قابو میں نہ رہ سکی مگر اپنے کو رندھی ہوئی آواز میں تسلیاں دینے لگی جیسے اسے نہیں بلکہ اپنے دل کو تسلیاں دے رہی ہو۔

ابا! ایسے کیسے ہو سکتا ہے پلا۔ اس طرح وی کدی کسی نے گھر چھوڑے ہیں۔

یہ سب کچھ دیہاڑوں کا ہیر پھیر ہے۔ چوہدری واپس آ جائیں گے۔ ہمارا پنڈ فیر پہلے کی طرح وس جائے گا ابا توں فکر نہ کر۔ کالو بولے جا رہی تھی اور آنسو تھے کہ بہتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد کالو جیسے خود کی صفائی بھی دینا چاہ رہی ہو پھر گویا ہوئی۔ ہائے میرا تو سانس ہی بند ہو رہا ہے ابا یہ لوگ واپس نہ آئے تو میں مر جاؤں گی۔ میری سہیلیاں، نورو تر کھانی، ملانوں کی جیراں اور کری جولاہی میری جم پل کی سانجدار...... پر ابا وہ واپس ضرور آئیں گے، دیکھ لیں۔

ہاں پترا اوئے ہاں ضرور۔ بھگوان دیا کرے گا دھیئے! چیتا بولا اور مزید کہا۔ پر دھیئے! روٹی نہیں مجھ سے کھائی جاتی تو کھا لے شاباش۔

کالو اچانک کہیں دور نکل گئی اور یکدم پھر وہ کالو مخاطب ہوئی جس کا انتخاب کسی بڑے دربار میں ہو چکا تھا۔

”ابا! یہ ستی کیا ہوتی ہے؟“

او دھیئے! اس کا تجھے کیا خیال آ گیا؟ چیتا حیران ہوا۔

بس ابا بتا مجھے ایک وار پروچن میں میں نے ستی ناری کی شکتی کے بارے سنا تھا آخر یہ ستی ہوتی کیا ہے؟

کالو نے باپ کو اور حیران کیا مگر چیتا جانتا تھا اس کی دھی بڑی سیانی ہے اور بچپن ہی سے اوپرے سوال کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی چیتے کو یہ خیال بھی آیا کہ چلو اسی بہانے دھی کا دھیان سکھیوں کے وچھوڑے سے ہٹے گا۔ تو یہ سب باتیں دھیان میں رکھ کے چیتا گویا ہوا......

بچیا! ستی ایک دھارمک ودھی بھی ہے اور ناری کا اُچ استھان بھی ہے عام طور پر تو یہ صرف شتریہ ورن کی عورتوں کو ہی پراپت ہوتی ہے۔ خاص کر راجپوت ناریوں کو کیونکہ راجپوت ناریاں وفا اور حیا میں سارے سنسار میں بلند جو ہوتی ہیں۔ ویسے ستی کا مقام ان براہمن کنیاؤں کو بھی پراپت ہوتا ہے، جن کا بیاہ شتریہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کل میں ہو جائے۔

چیتا دی کو اس طرح دھرم کرم کی باتیں بتا رہا تھا جیسے کوئی شودر نہیں بلکہ براہمن ہو۔

مسلمانوں کے اثر رسوخ اور وقت کے چکر کی وجہ سے دھرم گیان کے دروازے نچلی ذات کے ہندوؤں پر بھی آشکار ہوتے جا رہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو۔

بہر حال کالو نے ایک سلگتا ہوا سوال داغا۔ تو ابا کوئی ویش یا شودر کنیا ستی نہیں ہو سکتی؟

چیتا مسکرایا اور جواباً لب کشائی کرنے لگا۔ دھیئے! بندہ جتنی چھوٹی ذات کا ہوتا ہے اس پر سختی بھی دھرم انوسار تھوڑی ہوتی ہے۔ نچلی ذات کی عورت ودوا ہونے پر نیوگ ویواہ یعنی دوبارہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ بیاہ کر سکتی ہے اس پر اکا پتی کا آدیش پالن لازمی نہیں ہے۔ مگر آریہ عورتوں پر جیون میں بلکہ جنم جنم میں ایک ہی مرد کا ساتھ عائد کیا گیا ہے اور آریہ ناری کی فطرت [illegible] ہوتی ہے دھیئے اور...... چیتا کچھ کہتے کہتے رُک [illegible]

تو کیا کوئی ویش اور [illegible] کبھی کسی ایک مرد کی نہیں ہو سکتی؟ کالو نے جلتی پر تیل ڈالا۔

کیوں نہیں پر۔ چیتا پھر بات کرتے کرتے رک گیا جیسے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے بات کر رہا تھا پس بہت سوچ کر اسے الفاظ ادا کرنے پڑتے تھے۔

بہر حال اس نے کوشش کی۔ پر دھیئے ویش اور شودر جاتی کے لئے یہ سہولت دی گئی ہے باقی تو دھرم اور کرم کے دوار ہر کسی پر کھلے ہیں۔ بھگوان نے تو انسان کو یہاں تک کا اختیار دے دیا ہے کہ وہ اپنے کرم سے اپنی ذات اپنا برن اپنا جنم تک بدل سکتا ہے۔ بہت بڑے رشی وشوامتر گزرے ہیں وہ اپنی تپسیا اور کرموں سے براہمن بنے تھے جن کے یگیہ کی رکھشا [illegible] اور راکھشسوں سے بھگوان رام اور لکشمن جی نے کی تھی، تو جب کرم سے یونی، ورن، اور کل بدلا جا سکتا ہے تو پھر کوئی "کرم" کسی انسان کے لئے منع کیسے ہو سکتا ہے۔

چیتا ابھی اور بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کالو خود پر قابو نہ پا سکی اور بولی۔

ابا! کیا سچ میں مانو کا ورن اور ذات کرموں اور تپسیا سے بدل سکتی ہے یہ کالو کے علم میں ایک نیا اضافہ تھا۔

چیتا پھر بولا۔ اگر سچے من سے بھگوان کی لگن لگ جائے تو آخرکار بندہ بھگوان میں لین ہو کر موکش پراپت کر لیتا ہے۔ تو پھر باقی سب تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔

دھیئے! بات تو سچے من سے چاہنے کی ہے کہ بندہ کیا چاہتا ہے اور کس کو چاہتا ہے؟ چیتے نے اس انداز سے کہا کہ گویا وہ بھی کسی اور دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

کالو بڑبڑائی، من کی لگن سچی ہو تو پراپتی ہو جاتی ہے۔

ہاں پتر! اوئے چیتے نے سمجھا کہ وہ شاید اس سے مخاطب ہے اس لئے اس نے جواب دے دیا۔ حالانکہ وہ خود سے کلام کر رہی تھی۔

اچانک چیتے نے کہا۔ دھیئے! باتیں تو ہوتی رہیں گی اب کچھ روٹی کھا لے اور اندر ہو جا ہنیرا کافی ہو گیا ہے۔

کالو نے روٹی والی چنگیر اٹھائی اور اندر چلی گئی روٹی ایک طرف رکھ دی اور آنکھ بچا کر کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا کافی تھا۔ کالو نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صندوق سے کرشن بھگون کی مورت نکال کر صندوق پر رکھی اور پھر صندوق پر کہنیاں

اس انداز سے نکالیں کہ اس کا سینہ صندوق کو چھونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اندھیرا کمرہ ہے اگر اچانک اس کا ابا آ بھی گیا تو اسے پتا نہیں چلے گا کہ کیا ہو رہا ہے اور پھرتی سے بھگوان کی مورت چھپا دے گی اور وہ بے فکر ہو کر بھگوان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ خیال کر رہی تھی کہ بھگوان میں سچے من سے دھیان لگائے پھر بھگوان خوش ہو کر اسے درشن دیں اور وہ اپنی مرضی کا وردان مانگ لے۔ اسے لگا جیسے یہ سب کچھ ابھی ہو جائے گا۔ وہ مرلی والے کی موہنی صورت تکنے لگی۔ مگر یہ کیا؟ اب تو علی احمد کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دے رہا تھا اور علی احمد اسے کہہ رہا تھا کہ آ جاؤ کالو آ جاؤ۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کرشن بھگوان، علی احمد بن کر آئے ہیں یا علی احمد کرشن بھگوان ہے؟ تو علی احمد مسکرا کر بولا کیوں پریشان ہے کالو؟ تم نے علی احمد سے پیار کیا یا کرشن سے؟ اگر تم کالو ہو تو میں علی احمد ہوں اور اگر میں کرشن ہوں تو تم میری رادھا ہو۔ تمہارا پریم سچا ہے تم صرف مجھ میں سما سکتی ہو۔

آ جاؤ آ جاؤ میرے پاس اور پھر مورتی جیسے بقع نور بن گئی۔ کالو کی آنکھیں روشنی کی تاب نہ لا سکیں اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر آنکھیں بند کرنے پر بھی اس حسین منظر اور تیز روشنی نے اس کی بصارت سے ہٹنے سے انکار کر دیا۔

اب آنکھیں بند ہوں یا کھلی...... منظر ایک ہی تھا۔

اس کیفیت نے کالو کو مدہوش کر دیا۔ جیسے اسے چکر آنے لگے۔

چوہدریوں کی ڈھور ڈنگروں والی حویلی میں علی احمد اور وہ کھیل رہے ہیں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ رہے ہیں۔

اور پھر بندر بن میں کرشن اور رادھا۔

کبھی وہ دونوں...... کبھی یہ دونوں۔

کبھی وہ دونوں...... کبھی وہاں ایک ہی جوڑا کھیل رہا ہے۔

کبھی دو جوڑے ہیں۔

یہی منظر بار بار دوہرایا جاتا رہا اور کالو بے خود ہو کر اپنا سر صندوق پر ٹکا دیتی ہے جیسے بھگوان کی شرن میں آ گئی ہو۔

تب کہیں جا کر یہ سارے مناظر ٹھہرتے ہیں اور وہ واپس اسی اندھیرے کمرے میں آ جاتی ہے۔ پھر بھگوان کے درشن کرتے ہوئے پرنام کر کے دوبارہ صندوق میں سنبھال دیتی ہے۔

کالو کی سانس اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی اور تیزی سے چھت پر چڑھ جاتی ہے اور آسمان پر تارے ایسے صاف نکلے ہوئے ہیں جیسے آج خاص طور پر بن سنور کر نکلے ہیں۔

البتہ چاند کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ کالو آسمان کو دیکھ کر گہرے سانس لیتی ہے۔ تب کہیں جا کر اس کی سانس کی رفتار سنبھل پاتی ہے۔

اب وہ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچتی رہی اور پھر اس کے چہرے پر عجیب سا اعتماد اور سکون ظاہر ہوتا ہے اور وہ سیڑھیاں اتر جاتی ہے پھر چھوٹا سا صحن عبور کر کے نئی بنی دیوار کا دروازہ پار کرتی ہے۔ پیپل کو گھورتے اپنے باپ پر ایک نظر ڈال کر مڑ جاتی ہے اور اپنے مکان کی اوٹ میں چھپے رستے پر تیز تیز قدم بڑھانے لگتی ہے۔

پھر اس کا گھر جو گاؤں کی آبادی کے آخری کنارے پر ہے اس کے بعد کھیت اور راستے ہی ہیں اس سے دور [illegible] جاتا ہے۔

اب وہ اس راستے پر آ گئی جس پر چوہدریوں کے گڈ اور گھوڑے نکلے تھے جن کے پیچھے باقی مسلمان

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کی ریڑھیوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آن دیکھے ملک میں جانے کو نکلے تھے۔

اسی راہ پر وہ کھوہ بھی آتا تھا جس سے روز کالو پانی لاتی تھی۔

اب کالو مرکزی راہداری پر آ گئی اب اس کے قدم تیزی سے اٹھتے اٹھتے بھاگنے لگے اور اس کے دماغ میں ایک فلم کی طرح کچھ مناظر تیزی کے ساتھ چلنے لگے جیسے علی احمد اور وہ سنگ سنگ کھیل رہے ہیں اور رادھا کرشن بھی کھیل رہے ہیں۔

اور کبھی اسے رانی پنگلہ دکھائی دیتی ہے اور کبھی اپنے گاؤں کا دیکھا بھالا کنواں دکھائی دیتا ہے اور کبھی چوہدریوں کا قافلہ پھر کنواں اور قافلہ تکرار کے ساتھ منظر بدلتے ہوئے اس کے دماغ میں کئی بار اپنے آپ کو دہراتے ہیں اور وہ بے تحاشہ بھاگتی جا رہی ہے۔

کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ اس کی منزل کیا ہے؟

☆☆☆

"من کنت مولیٰ فھذا علی مولیٰ" حدیث نبویؐ کے الفاظ جو ایک مشہور قوالی میں بھی پڑھے گئے۔ علی احمد گنگناتا ہوا، بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اب وہ اپنے گاؤں کے قریب ہی آ پہنچا۔ اچانک اسے اپنا کنواں نظر آیا تو اس نے ارادہ کیا کہ اپنے کنویں کا پانی پی ہی لوں اور چنن کو بھی پلاؤں پھر پتا نہیں پانی کہاں ملے گا اور آگے حیاتی میں اپنے کنویں کا پانی نصیب ہو گا بھی یا نہیں۔ اسی ارادے کے ساتھ علی احمد نے چنن کی لگام کھینچی اور ساتھ اس کو پچکارا چنن اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً رک گیا اور علی احمد چھلانگ لگا کر اس کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ ظاہر ہے اس وقت اور ان حالات میں وہاں بیل تو جتے ہوئے تھے نہیں لہٰذا علی احمد نے پاس پڑا ہوا ڈول کنویں کی جرخی پر چڑھا کر کنویں میں ڈالا اور کھینچا تازے ٹھنڈے پانی سے لبریز پانی کا ڈول باہر آ گیا۔

علی احمد نے پانی دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور منہ کو لگانے لگا پھر نہ جانے کیا خیال آیا کہ پانی پھر ڈول میں چھوڑ دیا۔ چنن نے اپنے مالک کو دیکھ کر ہنکار لگائی اور سر ہلایا پھر علی احمد نے خاص انداز میں "تر دیا" کا نعرہ لگایا تو چنن پانی پینے لگا اور ڈول بھر چٹکی بجاتے پی گیا۔ علی احمد نے ڈول پھر کنویں میں ڈالا اب کے نکالا پھر چنن کے آگے رکھا مگر چنن نے منہ پھیر کر اپنے سیر ہونے کا اعلان کیا۔

اب پھر علی احمد نے پانی ہاتھوں پر اٹھا کر پینے کا ارادہ کیا کہ چنن بدل کر ہنکیایا اور علی احمد نے اچانک سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور پانی پھر چھوڑ دیا۔

سامنے مشعلیں اٹھائے پندرہ بیس آدمی آ رہے تھے مشعلوں کی روشنی میں تلواریں بھی چمک رہی تھیں اور مخصوص حلیوں اور پگڑیوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ سب سکھ لوگ ہیں۔ خیر علی احمد نے رک کر ان کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اتنے میں وہ لوگ قریب آ گئے تو علی احمد نے ان کو پہچاننے کی کوشش کی وہ تو سارے ساتھ کے گاؤں نور پور کے تھے اور سب کی شکلوں، ناموں سے علی احمد واقف تھا۔ اب وہ بھی علی احمد کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اور قریب آ گئے ان میں سے ایک نوجوان نے آتے ہی آواز بلند کی۔

اوئے دیکھ لو سارے، چوہدریوں کا علی احمد بھی ان کے ساتھ تھا۔ تم لوگ ان کی پوجا کرتے ہو بے وقوفو!

علی احمد کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ خیر ان کے ساتھ نابھہ سنگھ بھی تھا جس کو علی احمد تایا کہتا تھا۔

علی احمد نے فوراً اسی کو مخاطب کیا۔

کیا بات ہوئی ہے تایا! یہ پرم سیاں کیا بکواس کر رہا ہے؟

نابھے سیاں نے پرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

ایویں ای نہ بولی جایا کر دکھو تیو۔

پھر علی احمد کی طرف دیکھ کر کہا۔ اوئے تسی تے کئے چڑدے چلے گئے ہوئے او۔ توں ایتھے کی کردا ایں پترا؟ (تم لوگوں کو گئے کافی وقت ہو گیا تم یہاں کیا کر رہے بیٹا؟)

تایا! رات ہو گئی تھی پہلا پڑاؤ ڈالنا پڑا اچانک شیر کو چائے کی طلب لگی ہوئی تھی۔ دودھ تھا نہیں تمہیں تو پتا ہے وہ ڈوڈے پیتا ہے۔ میاں جی اور ماسے امام دین نے مجھے بھینس لانے پنڈ بھیجا ہے۔ علی احمد نے مفصل جواب دیا۔

نابھہ سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔ چنگا پترا اب تو ویلے سر نکل جا یہاں سے دونوں طرف کے بلوائی آئے ہوئے ہیں یہاں کوئی حال نہیں رہا۔

کیا ہوا تایا؟ علی احمد نے لاعلمی سے سوال کیا۔

پرم سنگھ پھر نہ رہ سکا اور پھر بپھر کر بولا۔ پہلے چھپ کے وار کرتے ہو۔ پھر سوال کرتے ہو۔ بھینس لانے کی کہانی بنا لی اب تُو نے بابے مان جائیں گے۔ پر ہم نہیں مانیں گے تُو بھی کیمپ والوں کے ساتھ ہی تھا اوئے۔ ان کو کیا پتا کون سا کھوہ مسلمانوں کا ہے اور کون سا سکھوں کا تُو نے ہی بتایا ہو گا اور ہمارے بندے مروا دیئے اب ہمیں دیکھ کر بہانے بناتا ہے۔

یہ باتیں سن کر علی احمد کو دھچکا لگا اسے اچانک پتا چلا کہ یہاں کوئی خون خرابہ ہو گیا ہے۔ پر پرم سیاں کے رویے کا اسے بڑا دکھ ہوا وہ ان کے جذبات سمجھ سکتا تھا مگر کیا کرتا؟ دھمکی نما جملے سن کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کے خون میں گرمی آ گئی اور وہ پرم سیاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

زبان کو لگام دے اوئے ڈنگرا۔ میں تم لوگوں کو دیکھ کر باتیں نہیں بنا رہا اوئے میں سچے راجپوت کا بال ہوں۔ تم سب میرے پیو دادے کو جانتے ہو جس جس کے دل میں حسرت ہے آ کر مٹا لے۔ اٹھاؤ تلوار تگڑے ہو جاؤ جس کو سورما سمجھتے ہو نکالو باہر۔ نہیں تو واری واری سارے آ جاؤ اور اتنی بھی ہمت نہ ہو تو اکٹھے ہی آ جاؤ میں اکیلا پیدل ہی تم سب کے لئے کافی ہوں۔ یہ کہہ کر علی احمد نے قبضہ تلوار پر ہاتھ رکھا اور "یااللہ مدد" کے نعرے سے تلوار بے نیام کر لی۔

سامنے کھڑے سب لوگوں پر سناٹا طاری تھا جو اچانک پرم سنگھ نے توڑا اور کہا میں تیار ہوں ساتھ ہی ہیلا سنگھ اور لابھے سنگھ بھی بول پڑے۔ کرتے ہیں اس کو ٹھنڈا اوڈا اسان۔

نابھہ سنگھ چیخ کر بولا۔ ارمان کرو اوئے سارے پہلے مجھے گل بات تو پوچھ لینے دو تم جوانوں سے میں بڈھا ابھی تگڑا ہوں۔

پھر نابھہ سنگھ علی احمد کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

علی احمد!! جالندھر کیمپ کے کچھ لوگ اسلحے سمیت یہاں آئے تھے۔ مقصد یہی بتایا تھا انہوں نے کہ پھنسے ہوئے مسلمانوں کو نکالنا ہے کیونکہ سکھ بلوائی بھی باہر کے علاقوں سے آئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ نور پور کے کھوہ اجاڑ گئے ہیرے سیاں اور مہنگے سیاں کو قتل کر گئے اور اپنے جیتے کو اٹھا کر ساتھ لے گئے۔

علی احمد نے سارا وقوعہ سن کر آہ بھری اور رو کر بین کرنے لگا۔ او میرا یار جیتا اوئے کنجر کہاں لے گئے اس کو اس کا بھلا کیا قصور تھا؟

ساتھ ہی کسی مشعل بردار کی آواز آئی۔ اوئے کھوہ میں کوئی ہے۔

سب کنویں کے اندر دیکھنے لگے ساری مشعلیں یکجا کر کے دیکھا تو ایک انسانی لاش کنویں کے پانی پر تیر رہی تھی۔

کسی نے آواز دی۔ اوئے...... کوئی لڑکی لگتی ہے۔ ایک اور آواز ابھری آخر یہ کون ہو سکتی ہے؟

کسی نے کہا غور سے دیکھو پہچاننے کی کوشش کرو۔

بہت مشکل سے علی احمد بھی ان لوگوں کے درمیان سے راستہ بنا کر کنویں کی منڈیر پر آ پہنچا اور اندر کو جھانکا۔ یکدم تو اسے کچھ دکھائی نہ دیا مگر پھر اس نے خوب زور سے آنکھیں پھیلا کر بیج لگائی تو ایک انسانی لاش اوندھے منہ کنویں کے پانی پر تیر رہی تھی اور اس کے سر کے سارے لمبے لمبے بال پانی کی سطح پر پھیلے ہوئے تھے۔ علی احمد نے جھک کر دیکھا اور غور کرنے لگا آخر یہ عورت کون ہے؟ بالوں کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ یعنی کوئی جوان عورت یا لڑکی ہے؟

اچانک ایک مشعل نے بھبھوکا چھوڑا جس کی تیز روشنی میں علی احمد کی نظر لاش کی کمر پر پڑی اسے ایک چمڑے کی پیٹی نظر آئی جو اس کے دائیں کندھے سے کمر تک آ رہی تھی۔ علی احمد نے فوراً لاش کا دائیاں ہاتھ دیکھنے کی کوشش کی وہ بھی تیر رہا تھا اور ایک طرف کو پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کڑا بھی تھا وہ کوئی عورت نہیں بلکہ کوئی سکھ مرد تھا جس کے کیس کھل گئے تھے۔ ساتھ ہی علی احمد کے دماغ میں جیسے بجلی چمکی۔ جیتا! اس کے منہ سے بے اختیار جیت سنگھ کا نام نکلا۔ اس کے ساتھ ہی کنویں کی منڈیر پر جمع تمام لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ جیتا۔ ''اوئے یہ جیتا ہے''۔ ساتھ ہی پرم سیاں پھر چلایا۔ ویکھیاں اینے ماریا اے جیتے نوں۔ (دیکھا اسی نے مارا ہے جیتے کو)

اس کے ساتھ ہی پرم سیاں نے کچھ اول فول بکا۔ جسے سن کر علی احمد خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بجلی کی طرح اس ہجوم سے نکل کر دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی تلوار کا پھل بلند کیا جو ابھی تک بے نیام ہی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پرم کے اول فول بکو اس کا جواب اسی انداز میں دیا اور پھر پورے

فرمانِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

☆ میں بڑوں کی عزت اس لئے کرتا ہوں کہ ان کی نیکیاں مجھ سے زیادہ ہیں اور چھوٹوں سے پیار اس لئے کرتا ہوں کہ ان کے گناہ مجھ سے کم ہیں۔

☆ قربان جایئے اپنے رب پر جو برداشت سے زیادہ دکھ تو نہیں دیتا مگر اوقات سے زیادہ سکھ دیتا ہے۔

☆ خواہش پرستی ہلاک کر دینے والا ساتھی اور بری عادت ایک زورآور دشمن ہے۔

مرسلہ: مہوش شہزادی۔ لاہور

ہجوم کو مخاطب کر کے للکارا کہ آؤ مجھ سے ٹکراؤ میں تمہارے کس بل نکال دوں میں نے جیتے کو یا کسی اور کو نہیں مارا مجھے چھپ کر وار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ تم میں سے کون ہے جس کے زور میں بیساکھی کے میلے میں نہیں تول چکا۔ یہ پرمادہ ہے جس نے مجھ سے ہارنے کے بعد دھمکی دی تھی کہ کبھی نور پورے گزرا تو یہ میرا دھڑ ن تختہ کر دے گا۔ تم سب لوگ گواہ ہو کہ اسی شام میں تن تنہا علی الاعلان پورے نور پور میں گھوم پھر کر اسے للکارتا رہا مگر یہ نہ نکلا۔ آج یہ فسادوں کی آڑ میں پرانے حساب چکتے کرنا چاہتا ہے۔ جو جو اس کا ساتھ دینا چاہتا ہے بے شک دے۔ آؤ میدان میں گرج رہا ہے سورما۔ آؤ جس نے اپنی موت کی چاہ کی ہے اترو میدان میں۔ علی احمد بدمست ہو کر للکار رہا تھا مگر ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ جب علی احمد اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا تو خاموش ہو گیا اس کا جلال ٹھنڈا ہوتا دیکھ کر پرے کے چاچے اودھے سنگھ نے ہمت کر کے زبان بندی کی اور کہا۔

جا چلا جا علی احمد! بات نہ بڑھا۔ ہمیں تیرے دادے کا بڑا حیا ہے تُو تو جانتا ہے جس خاندان سے

ہے تجھ پر کوئی خالصہ اور خاص کر ہم ہاتھ نہیں اٹھا سکتے ورنہ......

علی احمد کے جلال کی بجھتی آگ کو جیسے پھر کسی نے ہوا دے دی ہو اور وہ پھر گرجنے لگا۔ چاچا اپنے بڑوں کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ حسین بخش سے نور خاں تک جس نے تم کو نور پور کا سارا گاؤں بخشا۔ نور خاں سے بابے جینے تک اور بڈھے خاں کی طرف سے بھی جس کی دعا سے گرو گوبند سنگھ جی پدھارے اور بڈھے خاں سے راہ بلا رتک جس نے ننکانہ صاحب بابے نانک کو دان کر دیا۔

اور وہاں سے لے کر مہاراج شری کرشن چندر جی اور شری رام چندر جی مہاراج تک۔

اپنے بڑوں کی ذمہ داری لیتا ہوں تمہارے دھرم کرم کو کچھ نہیں ہوگا۔ پرے کو کہو اپنے زور دکھائے یا اور کوئی سورما ہے تو باہر آئے۔ علی احمد کا سرخ چہرہ حالتِ جلال میں رات کے اندھیرے میں بھی دہک رہا تھا۔ آنکھوں سے انگارے برپا ہو رہے تھے اور جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔

حالات کی نزاکت اور علی احمد کے استقلال کو دیکھ کر بوڑھا تابھہ سنگھ آخر بیچ میں پڑ گیا اور اس نے بلند آواز سے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کیا۔

اوئے بے حیاؤ اور کیا کیا سنواؤ گے ہمیں؟ نہ بکواس کرو، علی احمد ٹھیک کہتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ ٹبر کبھی جھوٹ نہیں بولتا چلو سب واپس چلو جیتے کو نکالنے کا کوئی بندوبست کریں۔

علی احمد کے فنِ تلوار بازی، زورِ بازو اور بدن کی پھرتی سے نہ صرف نور پور بلکہ پورے جالندھر کے جوان واقف تھے۔ اسے سچ مچ مقابلے پر اترا دیکھ کر پرے کا پتا پانی ہو گیا اس نے تابھے کے بیچ بچاؤ کو غنیمت جانتے ہوئے پیچھے کی راہ لی۔

پرے کو جاتا دیکھ جو دیگر دو ایک جوان کسمسا رہے تھے وہ بھی پلٹنے میں ہی عافیت جاننے لگے۔ سب واپسی کو پلٹے اور دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔

تابھہ سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر علی احمد سے درخواست کی۔ پترا! یہ سب بے عقل ہیں ان کو تمہاری کیا قدر؟ میں ہتھ بن کے بنتی کرتا ہوں کہ ان کی کوئی بات تو دل پر مت لینا۔

علی احمد نے سفید ریش تابھے کو ہاتھ باندھے کھڑے دیکھا تو اس کا سارا غصہ رفو ہو گیا۔ اس نے بڑے پیار سے تابھے سیاں کو جواب دیا۔

نہیں تایا کیوں شرمندہ کرتا ہے تو میرے میاں جی کا بڑا بھائی ہے۔ تابھے کے بندھے ہوئے ہاتھ علی احمد نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لئے تابھے نے آنکھوں سے اظہار تشکر کیا اور پھر وہ بھی پلٹ کر دیگر جانے والوں کے ساتھ ہو لیا۔

علی احمد پلٹ کر چنن پر سوار ہو گیا۔

☆☆☆

کالو شتر بے مہار کی طرح کھوہ کی سمت بھاگے جا رہی تھی اس کے سانس کی رفتار بھی اس کے قدموں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی مگر اسے کہاں ہوش تھا کہ وہ اپنی پھولی سانس کو دیکھے یا اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اپنے سینے کے زیر و بم یا اپنا پسینے سے شرابور جسم یا اپنا بے حال ہوتا ہوا لباس۔ اس کی تمام تر توجہ تو ان مناظر پر مبذول تھی جو اس کے ذہن میں کسی فلم کی طرح آ جا رہے تھے اور اسے یہی احساس دلا رہے تھے کہ وہ محض خیال نہیں بلکہ اس کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہونے والی حقیقت ہے۔ اسے چوہدریوں کا قافلہ، کھوہ، رانی۔ کرشن اور رادھا، وہ خود اور علی احمد پھر اپنا اور اس کا بچپن، بندرابن، ستی کی ودھی، دویاہ میں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اگنی کنڈھ کی ودھی اور نہ جانے کیا کیا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اس کا جسم تو زمین پر بھاگ رہا تھا لیکن اس کی روح آسمانوں آسمانوں اڑ رہی تھی کہ اچانک اسے اس طرح محسوس ہوا کہ اس کے سامنے ایک اوٹ میں مہا دیوی ماتا لکشمی جی براجمان ہیں اور ان کے یہ الفاظ اس کے کانوں کے پردوں پر ٹکرائے۔ "ہائے میرا پُتر"۔

کالو کو چکر آیا اور وہ زمین پر گر پڑی اسے آخری منظر یہ نظر آیا کہ اس کے دیکھے بھالے کھوہ کے کنارے کے ساتھ والی زمین اپسرائیں اپنے بالوں سے جھاڑ رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی اور خود کو گہرے اندھیرے کے حوالے کر دیا۔ اشہد اللہ الہ الا اللہ...... اشہد ان محمد الرسول اللہ...... اسے یوں لگا کہ وہ کسی ہریالے باغ کی ہری ہری گھاس پر لیٹی ہوئی ہے اور علی احمد اس کے پاس کھڑا مسلمانوں کی بانگ دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔

اشہد اللہ الہ الا اللہ...... اشہد ان محمد الرسول اللہ...... اس کے ساتھ ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی جب اس کے حواس قائم ہوئے تو اس نے غور کیا کہ اس کے لب ابھی بھی وہی الفاظ دہرا رہے تھے جو علی احمد سے اس نے سنے تھے...... اشہد اللہ الہ الا اللہ...... اشہد ان محمد الرسول اللہ...... اب اس نے اپنے محل وقوع پر غور کیا تو وہ کسی ہرے بھرے باغ میں نہ تھی بلکہ گہری اندھیری رات کے وقت راہگور سے ایک طرف ایک کھیت میں گری پڑی تھی اب وہ سنبھل کر بیٹھ گئی تو اسے ساری بات یاد آ گئی کہ وہ گھر سے بے سدھ بھاگی آ رہی تھی اور اس کے دماغ میں کیا کچھ چل رہا تھا۔ اسے ایک ایک بات یاد آ گئی۔ اب اس نے نظریں اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنا چاہا کہ دراصل وہ اس وقت موجود کہاں ہے۔ اس نے سامنے کا منظر غور سے دیکھا تو اسے اپنے سامنے وہی کھوہ دکھائی دیا جس سے وہ بہت مانوس تھی۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ وہ کھوہ کے بالکل پاس پہنچ چکی ہے۔ لیکن...... لیکن یہ کیا؟ اس نے اپنی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اسے اپنے دیکھے پر اعتبار نہ آیا اسے یوں لگا کہ ابھی وہ عالم خواب ہی میں ہے۔ پھر اس نے خود کی چٹکی لی تو اسے یقین آیا کہ وہ اب پوری طرح سے بیدار حالت میں ہے۔

کیا دیکھتی ہے کہ اس کے سامنے...... وہ...... جو نہ جانے اس کا کیا لگتا ہے؟ اور...... نہ جانے کون ہے؟...... کرشن ہے علی احمد ہے؟ یا کوئی اور...... یا راجہ بھوج؟

جسے وہ بچپن سے جانتی تھی مگر آج وہ اس نتیجے پر پہنچی وہ تو علی احمد کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ خیر...... بہرحال اسے اپنے نینوں کی شہادت پر اعتبار آ گیا اور اس نے یقین کر لیا کہ وہ جو جوان گھوڑے پر سوار ہے تلوار نیام میں ڈال رہا ہے۔ علی احمد ہی ہے اور وہ اس کے گھوڑے چنن کو بھی تو جانتی تھی یہ وہی چنن اس کے سامنے تھا جس نے ایک بار علی احمد کے بھائی طفیل خاں کے گورے افسر کو اپنی پشت پر سوار ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ سارا گاؤں ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔ طفیل نے گورے صاحب کو بتایا کہ وہ اس گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکیں گے مگر گورے نے کہا کہ وہ برطانیہ سے سواری کی تربیت لے کر آیا ہے اور برطانوی ہر کام کر سکتے ہیں مگر جب وہ ناکام رہا تو بہت شرمندہ اور بھیگی بلی بن گیا۔ کالو کے ذہن میں وہ دن اور اس دن کی یاد روز روشن کی طرح تازہ ہو گئی پھر اچانک کالو یادوں کے بکھیڑوں سے نکل کر آج کی اس رات اس حقیقت میں واپس آ گئی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ علی احمد گھوڑا بڑھا لے گا اگر بھاگ سے وہ میرے سامنے ہی آ گیا ہے تو میں اس سے مل تو لوں دو باتیں کر لوں

یہ تو پوچھ لوں کہ وہ لوگ واپس پنڈ کب آئیں گے؟

اس سوچ نے کالو کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر دیں اور پھرتی سے اچھل کر اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے آرام کرتی ہرنی کو شیر کے حملے کی خبر ہو جائے۔ کھڑی ہونے کے بعد وہ تیزی سے علی احمد کی جانب بڑھی۔

☆☆☆

علی احمد نے تلوار میان میں رکھی اور چنن کو راہ کی طرف موڑا کہ اس کی نظر کالو پر پڑ گئی۔ ایک بجلی جیسے اس کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ اس نے کالو کی طرف گھوڑا بڑھانے کا ارادہ کیا کہ بلند آوازیں ہر طرف سے اٹھیں۔ "جو بولے سو نہال"...... "ست سری اکال"۔

آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ آوازیں تعداد اور کافی زیادہ لوگوں کی ہیں۔ علی احمد کے دل میں پہلا خیال آیا کہ شاید پرمہ وغیرہ یہاں سے تو چلتے بنے اور اب سارا گاؤں اس پر پل پڑا ہے۔

خیر علی احمد نے ہاتھ مضبوطی سے قبضۂ تلوار پر رکھ لیا اور دل میں سوچنے لگا آج پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ اسی اثناء میں وہ سارا جتھہ اس کے سامنے آن موجود ہوا۔ سوار کو دیکھ کر سب رک گئے۔ علی احمد نے تیزی سے آنے والوں پر نظر پھیری مگر وہ نور پور سے نہیں تھے۔

علی احمد نے اندازہ لگایا کہ پھر یہ لوگ یقیناً سکھ بلوائی ہیں جو نابھے کے مطابق ہریانہ سے آئے ہیں۔ دوسرا خیال علی احمد کے دل میں گزرا کہ شاید پرے سیاں نے فوراً ان بلوائیوں کو جا کر میری موجودگی کی اطلاع دی ہو گی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ از راہِ اتفاق ہی گھومتے گھامتے اس کی راہ میں آ پڑے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا وہ بلوائیوں سے آڑھے ہاتھوں نمٹنے کو تیار ہو گیا اور اسے یہ دیکھ کر بھی اطمینان ہوا کہ بلوائی سوا سو سے ڈیڑھ سو افراد کی تعداد میں تھے مگر پاپیادہ تھے سوار نہیں تھے۔ ان کے پاس کرپانوں اور تلواروں کے علاوہ نیزے، بھالے اور تیر کمان بھی تھے مگر علی احمد ان سب سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور طاقت و مہارت دونوں رکھتا تھا۔

ماہر سپاہ گر کی طرح اس نے ان تمام باتوں کا تخمینہ لگایا کہ جتھے کے کس حصے کی طرف بڑھے گا۔ تیروں، بھالوں، نیزوں کے وار سے کس سمت تلوار گھما کر رفع کرے گا اور پھر وہ جتھے کے اندر گھس جائے گا۔ جتھے کے اندر گھسنے سے یہ ہو گا کہ اس پر تیر، نیزے اور بھالے دور سے نہیں داغے جائیں گے۔ جو بھی حملہ کرے گا وہ اس کے قریب آ کر کرے گا اور دست بدستہ لڑائی میں اس نے کیا کرنا ہے یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں اچانک یہ خیال آیا کہ وہ آج خالص دین اور حق کے لئے جنگ کرے گا۔ اسے یہ خیال آیا کہ کالو مظلوم ہی نہ ان ظالموں کے ظلم کا نشانہ بن جائے۔ کمزور کی حفاظت ان ظالموں کا صفایا مجھ پر فرض ہو چکا ہے اور خاص کر اس وقت جب ان ظالموں کی وجہ عناد صرف اور صرف میرا حامی دین ہونا ہے اور اس لڑائی میں اس کا کوئی ذاتی مقصد پوشیدہ نہ ہے، خالصتاً اللہ کی راہ میں جہاد کی بات نے اس کے سراپے کو تو مسرور کر ہی دیا ساتھ ہی ساتھ اس کی روح اور جاں بھی تر و تازہ ہو گئی۔

علی احمد کو اس طرح محسوس ہوا گویا وہ ہوا میں معلق اور بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ خیر اس نے اسی سرشاری کے عالم میں دوبارہ اپنی ہمت جمع کر کے قبضہ تلوار پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے "نصر من اللہ و فتح قریب" کی آیت تلاوت کرنا چاہی مگر اس کے لبوں پر "یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبدی" کی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آیت جاری ہوگئی۔

بہر حال اس نے تلوار کو نیام سے کھینچ کر فضا میں بلند کیا اور ''اللہ اکبر'' کا فلک شگاف نعرہ لگایا ساتھ ہی تلوار کو دھار کی سمت گھمانے کا ارادہ کیا جو ہوائی حملوں کی کاٹ کے لئے ہوتا ہے کہ علی احمد کو اپنے سامنے ایک نورانی ہیولہ نظر آیا جو بیچ آسمان کے یکدم ظاہر ہوا اور آن کی آن میں وہ معقول سے طول و عرض کا حامل ہالہ زمین و آسمان کے بیچوں بیچ تن گیا۔ علی احمد اس نورانی رسی جو ارض و سماں کے مابین تنی ہوئی تھی کے نورانی حسن میں کھو سا گیا کہ اسے اچانک ایک شیریں صدا سنائی دی جس کی میٹھی تان نے علی احمد کے کانوں میں رس گھول دیئے۔ آواز فلک نے علی احمد کو مخاطب کیا۔ ''بتا تُو کون ہے؟ اور کون ہے وہ ذات جو دین کی حفاظت کرتی ہے، مظلوموں کی حفاظت کرتی ہے اور ظالموں پر قہر بپا کرتی ہے؟'' علی احمد اسی سراسیمگی حالت میں بے حس و حرکت اس نورانی راستے کو تکے جا رہا تھا جو زمین و آسمان کے بیچ پھیلا ہوا تھا اور اسی صورتِ شیرینی کے مزے لے رہا تھا۔ اس پیاری آواز کے سوال پر علی احمد کے منہ سے جواباً بے اختیار نکلا......

''اللہ''۔

اس کے بعد اس مردِ کامل کا ہیولہ پھر ظاہر ہوا جو محراب مسجد میں علی احمد سے پہلے ملاقات کر چکا تھا اور اس نے جھوم کر علی احمد کی طرف تکا اور خوشی سے کہا۔ ''اللہ کی قسم تُو کامیاب ہوگیا اور وہ بھی''۔ یکبارگی کئی بلمیں، نیزے، بھالے اور تیر ہوا میں لہراتے ہوئے آئے اور آن کر علی احمد کے کشادہ سینے میں پیوست ہو گئے مگر اسے کسی درد و زخم کا احساس تک نہ ہوا اسی کے ساتھ اس نے تیزی سے کالو کی طرف دیکھا جو منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے علی احمد پر نظریں لگائے ہوئے تھی۔ علی احمد کیا دیکھتا ہے کہ کالو کا جسم کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر جا پڑتا ہے اور کالو تیزی سے آگے آ کر علی احمد کے دل میں سما جاتی ہے پھر حملہ آور جتھے کے شور و غوغا سے نابلد علی احمد کے جسم میں کچھ اور آہنی ہتھیار آن پناہ لیتے ہیں۔ علی احمد کی نظر نوری راستے کی جانب اٹھتی ہے، اسی کے ساتھ جیسے اس کے سامنے نور کا ایک بے حد و حساب جسیم چھناکہ ہوتا ہے۔ اس چھناکے کے ساتھ علی احمد بھی اسی نوری رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اس بے پناہ نور کی طرف چل پڑتا ہے اور اس کا جسم چنن کی گردن پر آن ٹکتا ہے اور لگام سے اس کے ہاتھ ڈھلک کر چنن کو جیسے آغوش میں لے لیتے ہیں۔

اب ذمہ داری چنن پر آن پڑی وہ کیسے اپنی نسل کو لج لگواتا مالک کی میت کو صاف بچا کر میدان سے لے آیا اس کے کمر جیسے ہمالیہ پہاڑ جتنے وزنی ہو گئے۔

اور وہ بوجھل قدموں سے سر جھکائے غریب الوطنوں کے پڑاؤ کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

شیر خاں جو نیم بے ہوش ہو رہا تھا، رہ نہ سکا اور بڑے بھائی سے پوچھ ہی بیٹھا۔ ''پائی! منڈا آیا نہیں اجے! مینوں چنتا ہوندی پئی اے''۔

(بھائی! لڑکا آیا نہیں ابھی تک مجھے فکر ہو رہی ہے۔)

چوہدری حسین بخش خان نے اپنی سینے سے لگی ٹھوڑی اٹھائی اور شیر خاں کی جانب دیکھا اور وہ دلگیر آواز اور اجنبی لہجے میں بولا۔

''بس آتا ہی ہوگا جوان...... وعدہ نبھا کے''۔

حسین بخش کی آنکھیں فرط جذبات سے لبریز ہو کر کامیاب بیٹے کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے چھلک پڑیں۔

رسوائی کی

اسیرِ فریب

ثمر کے جھوٹے وعدوں پر اعتماد کر کے وہ تو لٹ کر بربادی کے ساحل پر کھڑی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ عائشہ بھی اس انجام کو پہنچے۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

21 جنوری 2015ء کی دوپہر تقریباً ڈھائی بجے تھانہ پیر مگر کو اطلاع ملی کہ جناح باغ میں گولی چلی ہے اور ایک زخمی نوجوان زندگی اور موت کے عالم میں ہے۔ اطلاع پاتے ہی انسپکٹر راحت امیر، سجاد شاہ، نصیب بیگ ہکرزوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔

راحت امیر نے دیکھا نوجوان کی چھاتی پر گولی لگی تھی۔ پکارنے یا ہلانے جلانے پر بھی وہ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ پولیس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو اس میں سے ڈرائیونگ لائسنس، پین، قائداعظم انجینئرنگ کالج اور زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کا سٹوڈنٹ آئیڈنٹٹی کارڈ ملا۔ ان ساری دستاویز سے زخمی نوجوان کی شناخت ثمر چوہدری کے نام سے ہوئی۔ کہنا مشکل تھا کہ ثمر چوہدری مر گیا تھا، کوما میں تھا یا بے ہوش تھا۔ اس لئے راحت امیر نے علاج کے لئے اسے عزیز فاطمہ ہسپتال بھجوا دیا اور خود موقع پر جمع بھیڑ سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

جناح باغ تاریخی و ہریالی سے بھرپور قابل دید مقام ہے۔ مقامی لوگوں کے علاوہ دور دراز سے پیر نگر آنے والے لوگ بھی اس باغ کو دیکھنے آتے ہیں۔ حادثہ والے دن بھی جناح باغ میں سینکڑوں سیلانی تھے۔ ان تماش بینوں سے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا کہ باغ میں ایک بنچ پر ایک لڑکی پہلے سے بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان یعنی ثمر چوہدری بھی باغ کے بڑے پھاٹک سے اندر آیا اور آ کر لڑکی کی بغل میں بیٹھ گیا۔ دونوں پہلے سے واقف لگ رہے تھے۔ کچھ دیر دونوں نے آپس میں بات چیت کی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ لڑکی تمتما کر بنچ سے کھڑی ہوگئی اور اس نے ثمر کے گال پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ ثمر پہلے تو بوکھلایا پھر وہ مشتعل ہوگیا۔ اس نے لڑکی کے بال پکڑ لئے اور زمین پر گھسیٹتا رہا۔ پھر لات گھونسوں سے پیٹنے لگا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور بینچ تھی جس پر تین نوجوان بیٹھے تھے۔ ان دونوں میں مار پیٹ ہوتے دیکھ کر وہ بینچ سے اٹھ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جو تم پر اعتبار کرتا ہے اس سے کبھی جھوٹ نہ بولو اور جو تم سے جھوٹ بولتا ہے اس پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔

کر ثمر کے قریب آئے اور ایک نے پسٹل سے اس کی چھاتی پر گولی ماردی۔

چشم دید گواہوں نے جو بیان دیا اس سے ظاہر تھا کہ حملہ آور لڑکی کے ساتھی تھے۔ ثمر کو گولی لگنے کے بعد لڑکی نہ بدحواس ہوئی نہ بھاگی۔ ثمر کے زخمی ہو کر زمین بوس ہوتے ہی اس نے اطمینان سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے صرف موبائل فون نکالا اور اسے اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کے بعد وہ حملہ آوروں کے ساتھ بائیک پر بیٹھی اور موقع سے فرار ہوگئی۔

راحت امیر اس بارے میں گہرائی سے سوچ رہے تھے کہ تبھی عزیز فاطمہ ہسپتال سے فون پر خبر ملی کہ ڈاکٹروں نے ثمر کو مردہ قرار دے دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موقع پر ہی اس کی موت ہوگئی تھی۔ پولیس نے ہسپتال میں ہی ثمر کی لاش کا پنچ نامہ بنایا اور لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا۔ اسی دوران تھانہ پیر نگر میں مقدمہ قتل کے تحت معاملہ درج کرلیا گیا تھا اور مزید تفتیش کے لئے ایس آئی سجاد شاہ کو مقرر کردیا تھا۔

سجاد شاہ نے قائداعظم انجینئرنگ کالج جاکر مقتول سے متعلق اطلاعات جمع کرنے کی کوشش کی تو چونکا دینے والی معلومات حاصل ہوئیں۔ ثمر چوہدری اس کالج کا طالب علم نہیں تھا اور اس کی جیب سے ملا وہاں کا شناختی کارڈ فرضی تھا۔ اس کے بعد سجاد شاہ نے زرعی یونیورسٹی کا رخ کیا۔ وہاں چھان بین کرنے پر پتہ چلا کہ ثمر چوہدری وہاں کا طالب علم بھی نہیں تھا اور دوسرا شناختی کارڈ بھی فرضی تھا۔ اب پولیس نے ثمر کے ڈرائیونگ لائسنس کی جانچ کو بنیاد بنایا۔ لائسنس میں اس کا پتہ معرفت مدثر چوہدری، جناح کالونی درج تھا۔ یہ علاقہ تھانہ سول لائن میں آتا تھا۔ پیر نگر پولیس نے تھانہ سول لائن سے تصدیق کرائی تو تین چار گھنٹے میں ہی اطلاع ملی کہ پتہ صحیح ہے۔ وہاں مدثر چوہدری ملے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ 2010ء میں ثمر چوہدری ان کے مکان میں کرائے پر رہتا تھا، اب وہ کہاں ہے پتہ نہیں۔

ثمر کے صحیح پتے اور شناخت کی محرومی کی وجہ سے پولیس کے سامنے مشکلیں کھڑی ہوگئیں۔ فرضی آئی ڈی سے طے ہو چکا تھا کہ ثمر سیدھا سادہ نوجوان نہیں بلکہ کوئی شاطر نوجوان تھا۔ اس کے بعد علاقہ افسر کی ہدایت پر راحت امیر نے کمپیوٹر ماہرین کو ثمر کا فیس بک اکاؤنٹ تلاش کرنے اور اسے کھولنے کے کام پر لگادیا۔

علاقائی افسر کاشف سیال نے دوسرا کام یہ کیا کہ انہوں نے خود تھانہ انچارج سول لائن سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ان سے کہا کہ وہ مدثر چوہدری سے ایک بار پھر ملاقات کریں۔ ممکن ہے ان سے ثمر کے اصلی پتہ کا علم ہو جائے۔ تھانہ انچارج سول لائن نے مدثر چوہدری کو تھانے بلا کر پوچھ گچھ کی تو اس نے یاد کرکے بتایا کہ ثمر ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا ہے۔ کاشف سیال نے اب بی ڈویژن پولیس سے رابطہ قائم کیا اور ثمر کی پہچان کے لئے انہوں نے اس کا ایک فوٹو بھی میل کردیا۔ اس کے چار پانچ گھنٹے بعد ہی تھانہ انچارج بی ڈویژن ٹوبہ نے کاشف سیال کو فون کیا۔

”سر! آپ نے جو فوٹو میل کیا تھا اس کی شناخت ہوگئی ہے۔ اس کا صحیح نام ثمر چوہدری ہے، وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے شاہد علی کا دوسرے نمبر کا بیٹا ہے۔ شاہد علی پہلی ٹرین سے پیر نگر روانہ ہو رہے ہیں جہاں پہنچ کر وہ سب سے پہلے آپ سے ملیں گے“۔

ایس ایچ او بی ڈویژن نے کاشف سیال کو دو موبائل نمبر بھی نوٹ کرائے۔ ان میں سے ایک موبائل نمبر شاہد علی کا تھا اور دوسرا نمبر ان کے مقتول بیٹے ثمر چوہدری کا۔

کاشف سیال نے پی ٹی سی ایل سے ثمر کا موبائل نمبر ڈائل کیا تو امید کے مطابق وہ بند ملا۔ کاشف سیال نے فوراً ایک تھانیدار کو ثمر چوہدری کے سیل فون کی کال ڈیٹیل نکلوانے بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نمبر سرولانس پر بھی لگوادیا۔ اسی دوران کمپیوٹر ماہرین ثمر کا فیس بک اکاؤنٹ کھوجنے میں کامیاب ہوگئے۔ ثمر نے اپنے نام سے تین اکاؤنٹ بنا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک میں ثمر کے فوٹو کو چھوڑ کر کچھ نہیں تھا۔ فیس بک پر ثمر کا دوسرا اکاؤنٹ طارق حسن کے نام سے تھا۔ جس میں ثمر کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس میں بھی ثمر یعنی کہ طارق حسن نے خود کو قائداعظم انجینئرنگ کالج کا طالب علم ظاہر کیا تھا۔ اس پروفائل میں اس نے تین دیگر نوجوانوں کے فوٹو اپ لوڈ کر رکھے تھے۔ فائل کے مطابق وہ تینوں طارق حسن کے دوست اور قائداعظم انجینئرنگ کالج کے طلباء تھے۔

تیسرا اکاؤنٹ ابرار کے نام سے تھا جس میں فوٹو ثمر کا لگا ہوا تھا۔ اس میں بھی اس نے خود کو انجینئرنگ کا طالب علم ظاہر کر رکھا تھا۔ اس فائل میں دوست کے طور پر حلیم، عائشہ اور پنجاب میں گورنر رہے غلام مصطفیٰ کھر کے فوٹو اپ لوڈ تھے۔

پولیس کے کمپیوٹر ماہرین نے مذکورہ تمام فوٹو ڈاؤن لوڈ کرلئے۔ حلیم اور عائشہ کا تو پتہ نہیں چل سکا مگر سابق گورنر غلام مصطفیٰ کھر کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ کاشف سیال نے ماڈل ٹاؤن میں واقع کھر کے گھر جاکر انہیں ثمر کا فوٹو دکھایا اور ان سے اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ کھر نے صاف انکار کردیا کہ اس نام کے کسی نوجوان کو ذاتی طور پر وہ نہیں جانتے، نہ ہی اسے پہلے کبھی دیکھا ہے۔ طارق حسن کے نام سے ثمر نے فیس بک میں جو اپنا اکاؤنٹ بنا رکھا تھا اس میں اس کے تین دوستوں کے فوٹو اپ لوڈ تھے۔ انہیں بھی انجینئرنگ کا طالب علم بتایا گیا تھا۔ شاید ان تینوں سے کوئی سراغ مل جائے۔ اس امید میں پولیس کی ایک ٹیم نے قائداعظم انجینئرنگ کالج جاکر فوٹو کی بنیاد پر ان تینوں طلباء کو تلاش کیا تو وہ مل گئے۔ تینوں حقیقت میں انجینئرنگ کے طالب علم تھے۔ پولیس نے تینوں کو ثمر کا فوٹو دکھا کر الگ الگ پوچھ گچھ کی۔ تینوں نے ہی ثمر کو پہچاننے سے انکار کردیا۔ وہ اس بات سے بھی حیران تھے کہ ایک اجنبی کے پاس ان کے فوٹو آئے کیسے اور اس نے ان کی تصویروں کو فیس بک پر کیوں اپ لوڈ کیا؟

جب رشتے سچے ہوں تو زیادہ سنبھالنے نہیں پڑتے اور جن رشتوں کو سنبھالنا پڑے وہ سچے نہیں ہوتے۔

حلیم اور عائشہ تک پہنچنے کا کوئی سراغ پولیس کے پاس نہیں تھا۔ البتہ موقع پر ایک لڑکی کی موجودگی سے صاف ظاہر تھا کہ یہ محبت وغیرہ کا کوئی چکر ہوسکتا ہے۔ ثمر کا کردار اور اس کا قتل ایک پیچیدہ راز بن کر رہ گیا تھا۔

پولیس افسران حلیم اور عائشہ تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تبھی کاشف سیال کو ثمر کے موبائل فون کی کال ڈیٹیل مل گئی۔ ثمر یوں تو بہت سارے نمبروں پر بات کیا کرتا تھا مگر ایک لوکل نمبر پر اس کی سب سے زیادہ باتیں ہو رہی تھیں۔ واقعے سے ایک گھنٹہ پہلے اس نمبر سے ثمر کو کال کی گئی تھی۔ ثمر کے موبائل پر آئی وہ آخری کال تھی۔ اس کے بعد پونے تین بجے فون بند کردیا گیا تھا۔ وہ نمبر ہاؤسنگ کالونی میں رہنے والی عائشہ کا تھا۔ ابرار کے نام سے بنائے گئے ثمر کے فیس بک اکاؤنٹ میں بھی عائشہ کا نام و فوٹو اور کال ڈیٹیل موجود تھیں۔ ظاہر تھا عائشہ اس کیس کی اہم کڑی تھی۔ پولیس کو اب کیس کی بکھری کڑیاں جڑتی سی محسوس ہوئیں۔ پولیس کو دوسری کامیابی یہ ملی کہ ثمر چوہدری کے موبائل فون کی لوکیشن

کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا گیا ہو اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔

ٹریس ہو گئی۔ وہ ڈی ٹائپ علاقے میں ایکٹیو تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ فون قاتل یا قاتلوں کے ہی پاس تھا۔ راحت امیر نے بلاتاخیر دو پولیس ٹیمیں بنائیں ایک ٹیم عائشہ کو حراست میں لینے کے لئے ہاؤسنگ کالونی بھیجی اور دوسری ٹیم کو قاتل یا قاتلوں کی تلاش میں ڈی ٹائپ بھیجا گیا۔

پہلی ٹیم کا کام آسان تھا۔ اتفاق سے عائشہ گھر میں ہی مل گئی۔ پولیس ٹیم اسے تھانہ ہیر نگر لے آئی۔ تھانہ میں عائشہ سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے یہ تو قبول کر لیا کہ ثمر اس کا عاشق تھا۔ مگر اس الزام کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کہ سازش کے تحت اس نے ثمر کو قتل کرایا تھا۔

''وقوعہ سے ایک گھنٹہ پہلے تم نے ہی ثمر کو فون کیا تھا؟'' راحت امیر نے فوراً اگلا سوال کیا۔

''جی ہاں!'' عائشہ کے لہجے میں صاف گوئی تھی۔ ''حلیم ثمر سے کچھ خاص بات کرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تو میں نے ثمر کو فون کر کے جناح باغ آنے کو کہہ دیا تھا۔ بس سر! میری اتنی ہی غلطی ہے''۔

عائشہ کے پچھتاوے کی طرف راحت امیر کا دھیان قطعی نہیں تھا۔ اس حلیم کا پتہ لگانے کے لئے تفتیش سے جڑے سبھی لوگ مغز پچی کر رہے تھے اور اس کی شناخت یک بیک سامنے آ گئی تھی۔

''یہ حلیم کون ہے؟''

''حلیم میری سہیلی ہے۔ پڑوس میں رہتی ہے''۔

''وہ ثمر سے کیا بات کرنا چاہتی تھی؟''

''یہ تو پتہ نہیں سر!'' عائشہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، حلیم کے ساتھ میں بھی جناح باغ گئی تھی لیکن میں اندر نہیں گئی۔ وہ دونوں آپس میں بات چیت کر لیں، اس لئے میں گیٹ کے پاس کھڑی رہی۔ دور سے ہی انہیں دیکھ رہی تھی، میں نے دیکھا کچھ دیر دونوں میں بات ہوئی۔ اس کے بعد حلیم نے غصے میں ثمر کو تھپڑ مار دیا۔ سرعام ہوتی اس بے عزتی کو ثمر برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے حلیم کے بال پکڑ کر گرا لیا اور زمین پر گھسیٹتا رہا۔ پھر لات گھونسوں سے پیٹنے لگا۔ تبھی کسی نے ثمر کو گولی مار دی۔ اس واقعہ سے میں اس قدر گھبرا گئی کہ میں نے سیدھے گھر پہنچ کر دم لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں پتہ۔

عائشہ سے پوچھ گچھ چل رہی تھی کہ تبھی دوسری پولیس ٹیم بھی کامیاب ہو کر لوٹ آئی۔ ثمر کے سیل فون کی لوکیشن کی بنیاد پر پولیس ٹیم نے ڈی ٹائپ میں واقع ایک مکان میں چھاپہ مار کر حلیم اور اس کے بڑے بھائی سجاول عرف شادو کو گرفتار کر لیا۔

> دوستوں کو اتنی اہمیت دو جتنی وہ تمہیں دیتے ہیں۔ کم دو گے تو مغرور کہلاؤ گے، زیادہ دو گے تو گر جاؤ گے۔

اس کے بعد عائشہ، حلیم اور سجاول سے الگ الگ تفتیش کی گئی۔ تو ایک فریبی عاشق کے فریب اور اس کی سابقہ محبوبہ کے انتقام کی حیرت انگیز کہانی سامنے آئی۔

حلیم ہاؤسنگ کالونی میں اپنے کنبے کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے والد کا نام یاور خاں تھا۔ حلیم کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ سجاول عرف شادو، حلیم کیمسٹری سے ایم ایس سی کر رہی تھی۔ اس کا انسٹیٹیوٹ قائد اعظم انجینئرنگ کالج کیمپس میں تھا۔ انسٹیٹیوٹ میں ہی حلیم کی ملاقات ثمر سے ہوئی۔ وہ حلیم کا سینئر تھا اور کمپیوٹر کا اچھا واقف کار تھا۔ ثمر بھی ایم ایس سی کر رہا تھا اور اپر مال میں کرائے کا کمرہ لے کر اکیلا رہتا تھا۔ حلیم کو جب بھی پڑھائی کے سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی یا کمپیوٹر کے کسی پروگرام کی باریکی جاننا ہوتی وہ ثمر کی ہی مدد لیتی تھی۔

بے حد شیریں زبان ثمر بااخلاق اور ہیلپ فل نیچر کا تھا۔ جتنا اس سے ممکن ہوتا وہ حلیم کی مدد کرتا۔ اسی وجہ سے حلیم اس سے بے حد متاثر تھی۔ جب کوئی کسی پر اچھا اثر چھوڑتا ہے تب اس کے لئے دل میں خاص جگہ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ثمر بھی حلیم کے دل میں بس گیا تھا۔ وہ سمارٹ بھی تھا۔ تیز دماغ کا بھی تھا اور خوش مزاج کا بھی۔ حلیم ثمر کو چاہنے لگی تو اس کے دل میں پیار کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ دوسری طرف ثمر بھی حلیم کے حسن و جمال سے متاثر تھا۔ اس لئے ان کی دوستی کو چاہت میں بدلتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ پیار ہوا تو کالج کیمپس سے باہر بھی ان دونوں کی ملاقات ہونے لگی۔ ان کی زیادہ تر ملاقاتیں جناح باغ میں ہوا کرتی تھیں۔ دونوں کے لئے ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل ہو گیا۔ محبت کی صحیح پہچان عزت ہے۔ جو عزت نہیں کر سکتا، سچا پیار بھی نہیں کر سکتا۔

ایک دن کی بات ہے۔ حلیم اور ثمر جناح باغ میں بیٹھے محبت بھری باتیں کر رہے تھے کہ اچانک حلیم نے کورس سے متعلق ایک سوال پوچھا۔

''یار حلیم! ان رنگین لمحات میں تم کورس کا بور سبجیکٹ شامل مت کرو''۔ ثمر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''میں بھی ایسا نہیں کرنا چاہتی لیکن مجبوری ہے''۔ حلیم نے عذر پیش کیا۔

''جو تم پوچھ رہی ہو اسے زبانی نہیں سمجھایا جا سکتا''۔ ثمر نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ ''کمپیوٹر پر جب تک کر کے نہ دکھاؤں۔ تم صحیح طریقے سے نہیں سمجھ سکتیں۔ ایسا کرو تم میرے کمرے پر چلو۔ وہاں لیپ ٹاپ ہے۔ میں تمہیں قاعدے سے سمجھا دوں گا''۔

حلیم تیار ہو گئی، ثمر اسے اپر مال میں واقع اپنے کمرے میں لے گیا۔ پھر وہاں لیپ ٹاپ کی مدد سے حلیم کے سوال کا جواب سمجھایا۔ ساری باتیں حلیم نے اپنے دماغ میں بٹھا لیں۔ اس کے بعد بولی۔ تھینک یو جان! چلو اب چلا جائے۔

''چلتے ہیں''۔ ثمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری خاطر میں نے اپنا رومانی موڈ خراب کیا۔ اس کا معاوضہ بھی تو دو''۔ حلیم کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لئے اس نے مسکرا کر ثمر کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس وقت وہ کہاں جانتی تھی کہ تنہا کمرے میں ثمر کو موقع دے کر وہ کتنی بڑی غلطی کر رہی ہے۔ ثمر اس روز حد سے بڑھنے لگا تو حلیم نے کچھ دیر مزاحمت کی مگر پھر ہار گئی۔ حلیم کی مزاحمت کمزور پڑی تو اس کے بعد کمرے میں آیا طوفان ایک نئے جرم کی زمین تیار کرنے لگا۔ ایک بار ممنوعہ پھل کا ذائقہ چکھ لیا تو بار بار اسے چکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس دن کے بعد ثمر حلیم کو اکثر اپنے کمرے میں لے جانے لگا۔

حلیم کے پیار اور اعتماد کا فائدہ اٹھا کر ثمر نے دھوکے سے اس کی فحش ویڈیو فلم بھی بنا لی۔ حلیم کو اس کی بھنک تک نہیں لگی کہ ثمر اس کے ساتھ کتنا بڑا فریب کر رہا ہے۔ وہ اس امید میں جی رہی تھی کہ ایم ایس سی کے بعد جب ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نوکری مل جائے گی تب وہ شادی کر لیں گے۔ ثمر نے بھی حلیم کو شادی کی یقین دہانی کرا رکھی تھی۔

> سمجھوتے انسان کو تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔ جس پر کوئی تحریر اپنی مرضی کی نہیں ہوتی۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ حلیم سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس نے اپنی سہیلی عائشہ کو ثمر سے ملوا دیا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے چیل کے گھونسلے میں گوشت رکھ دیا ہے۔ عائشہ بھی بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ جاب کے لئے سی وی بنوانے کے لئے حلیم اسے ثمر کے پاس لے گئی تھی۔ ثمر کی جسمانی کشش و مزاج ہی ایسا تھا کہ ملنے والا اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔ عائشہ بھی اس کی کشش سے اچھوتی نہیں رہی۔ ادھر ثمر نے اس کے حسن کی تعریف کر دی۔ عورت کو اپنے حسن کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ عائشہ کو بھی لگی اس کے بعد ثمر نے اپنے پیار کا اظہار کر دیا۔

''لیکن آپ تو حلیم سے پیار کرتے ہیں۔ حلیم کہہ

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

وہ جو اندھیرے میں راستہ دکھاتا ہے، یقین مانو وہ صرف اللہ ہی ہے۔

بھی رہی تھی کہ آپ دونوں شادی کر لیں گے"۔ عائشہ بولی۔

"بے وقوف ہے حلیم۔ جو دوستی کو پیار سمجھ بیٹھی"۔ ثمر نے جال پھیلایا۔

"میری اور حلیم کی شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ مسلمان ہے اور میں کرسچین ہوں۔ دونوں کے رسم و رواج، تہذیب، عقیدے الگ ہیں۔ تمہاری اور میری ذات الگ ہے تو کیا۔ خدا تو ایک ہے۔ ہم دونوں کی نبھ سکتی ہے۔ حلیم کو نہ میں قبول کر سکتا ہوں نہ میرا کنبہ"۔

اس کے بعد ثمر اور عائشہ کی لو سٹوری شروع ہو گئی تھی۔ ثمر نے حلیم کو وقت دینا بند کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے اپنے طریقے سے سراغ لگانا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ثمر نے اپنی دنیا ہی بدل لی تھی۔ ثمر کی نئی دنیا کا نام عائشہ تھا۔ جب حلیم شکایت لے کر ثمر کے کمرے پر پہنچی تو ثمر کا شیطانی چہرہ دیکھنے کو ملا۔ ثمر نے نہ صرف اسے دھمکایا بلکہ اس کی بلیو فلم بھی دکھا دی۔ ثمر کے موبائل میں ایک نہیں اس کی اور حلیم کی کئی بلیو فلمیں تھیں کچھ میں ثمر کا چہرہ تھا۔ کچھ میں نہیں تھا لیکن حلیم کا چہرہ ہر کلپنگ میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے بعد حلیم کو شک نہیں رہ گیا کہ ثمر عاشق نہیں فریبی ہے۔ اس کے دل میں پیار نہیں ہوس کا طوفان ہے۔ حلیم نے رو رو کر ثمر سے درخواست کی کہ وہ اس کی بلیو فلم موبائل سے ڈیلیٹ کر دے۔

"تمہیں اپنے پاس رکھنے کا یہی تو ایک میرے پاس ہتھیار ہے"۔ وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "دھیان سے سن لو۔ منہ بند رکھنا اور جب مجھے تمہاری طلب محسوس ہو گی میں تمہیں بلا لوں گا۔ چپ چاپ چلی آنا ورنہ یہ فلم میں نیٹ پر اپ لوڈ کر دوں گا۔ اس کے بعد تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہارے کارنامے ساری دنیا دیکھے گی۔ نیٹ پر میں وہی فلم ڈالوں گا جس میں میرا چہرہ نہیں ہے۔ صرف تمہاری مستیاں ہیں"۔

حالانکہ عائشہ نے اس کی جگہ لے لی تھی اس کے باوجود حلیم کے دل میں عائشہ کے لئے اپنائیت تھی۔ ثمر کے جھوٹے وعدوں پر اعتماد کر کے وہ تو لٹ کر بربادی کے ساحل پر کھڑی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ عائشہ بھی اس انجام کو پہنچے۔ اس لئے حلیم عائشہ سے ملی اور اسے ثمر کی حقیقت سے رُوشناس کرایا۔

"دور رہو، ثمر سے ورنہ میری طرح وہ تمہیں بھی لوٹ کر موبائل کیمرے میں قید کر لے گا"۔ حلیم نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "اور جب تک چاہے گا بلیک میل کرے گا"۔

عائشہ پر ثمر کے پیار کا نشہ چھایا ہوا تھا، اس لئے وہ کیسے یقین کر لیتی۔

"ثمر تیرا پیار تھا لیکن اب وہ میرا ہو گیا ہے"۔ عائشہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس لئے تُو جلتی ہے مجھ سے۔ اسی لئے مجھے بھڑکانے کے لئے ثمر کے بارے میں اناپ شناپ بک رہی ہے۔ تُو میری سہیلی ہے اس لئے آج بخش رہی ہوں، آئندہ میرے اور ثمر کے درمیان آنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا"۔

بے عزت ہونے کے باوجود حلیم اپنے فیصلے پر قائم رہی کہ وہ عائشہ کو ثمر کے ہاتھوں تباہ نہیں ہونے دے گی۔ حلیم کو خود بھی ثمر کے جال سے نکلنا تھا اور عائشہ کو بھی نکالنا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے بھائی شادو اور عائشہ کے بھائی عاطف کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا۔ اس نے دونوں کو ایک جگہ بلایا اور رو رو کر اپنی آپ بیتی بیان کر دی۔ دونوں بھائیوں کا خون کھول گیا۔ ثمر کو اس کی کرنی کی سزا دینا ضروری تھا۔ اس لئے ان دونوں نے ثمر کو قتل کرنے کا

فیصلہ کر لیا۔ اس کے لئے انہوں نے منصوبہ بھی بنا لیا۔ اس منصوبے میں انہوں نے دوستی کا واسطہ دے کر اپنے مشترکہ دوست علیم مغل کو بھی شامل کر لیا۔

منصوبے کے مطابق 21 جنوری کو حلیم عائشہ سے ملی۔

"میں آخری بار ثمر سے ملنا چاہتی ہوں"۔ اس نے عائشہ کی منت کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بلانے سے وہ آئے گا نہیں۔ اس لئے تم فون کر کے اسے دو بجے جناح باغ میں پہنچنے کو کہہ دو۔ پلیز! میرے لئے تم اتنا کر ہی سکتی ہو۔ یقین رکھو، آج کے بعد تم دونوں کے راستے میں مَیں کبھی نہیں آؤں گی"۔

حلیم کے منت سماجت کرنے پر عائشہ نے ثمر کو فون کر دیا۔ ثمر کے جناح باغ پہنچنے سے پہلے ہی موت کے فرشتے وہاں پہنچ گئے۔ ثمر جناح باغ پہنچا تو حلیم ایک بینچ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ عائشہ بھی ساتھ گئی تھی مگر وہ گیٹ کے پاس ہی کھڑی رہی تھی۔ ثمر حلیم کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ حلیم نے اس سے موبائل فون کا میموری کارڈ مانگا جس میں اس کی فحش فلمیں تھیں۔ ثمر نے کارڈ دینے سے انکار کر دیا اور اسے دھمکیاں بھی دینے لگا۔

اس دن حلیم کیوں ڈرتی؟ بازی کے سارے مہرے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے بینچ سے اٹھ کر ثمر کے گال پر کرارا تھپڑ جڑ دیا۔ ثمر نے حلیم کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا اور اسے پیٹنے لگا۔ تبھی دوسری بینچ پر بیٹھے شادو اور علیم مغل دوڑتے ہوئے آئے اور شادو نے ثمر کی چھاتی پر فائر جھونک دیا۔ ثمر زمین پر گرا تو حلیم نے اس کی جیب سے موبائل فون نکال لیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بائک پر سوار ہو کر فرار ہو گئی۔

حلیم کے بیان کی بنیاد پر پولیس نے سجاول عرف شادو اور علیم مغل کو گرفتار کر لیا۔ ان کی نشاندہی پر قتل میں استعمال ہونے والا پسٹل اور بائک بھی برآمد کر لی گئی۔ تادم تحریر سبھی ملزمان جیل میں تھے۔ پولیس حلیم سے ثمر کا موبائل فون برآمد نہیں کر سکی۔ حلیم کے مطابق اس نے ثمر کا فون توڑ کر پھینک دیا تھا۔ پولیس کی چھان بین میں جو ثبوت سامنے آئے ہیں وہ ثمر کو جھوٹا، مکار، فریبی اور عیاش بتاتے ہیں۔ نئی نئی لڑکیوں سے دوستی کرنا۔ انہیں محبت کے جال میں پھانس کر ان کا جسمانی استحصال کرنا اس کا شوق تھا۔ تلاشی کے دوران اس کے کمرے سے متعدد لڑکیوں کے فوٹو، بہت سی فرضی دستاویزات اور بیس سم کارڈ ملے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ الگ الگ لڑکیوں سے بات کرنے کے لئے ثمر الگ الگ سم کا استعمال کرتا تھا۔ ثمر اتنا بڑا دھوکے باز تھا کہ اس نے اپنے باپ کو بھی ہمیشہ دھوکہ دیا۔ خود کو انجینئرنگ کا طالب علم بتا کر وہ اپنے باپ سے فیس کے نام پر دس لاکھ روپے وصول کر چکا تھا۔

❀❀❀

روشنی

❀ جس طرح بیماری کی موجودگی میں زبان کو کھانے کی لذت محسوس نہیں ہوتی بالکل اسی طرح گناہوں کی موجودگی میں دل کو عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی۔

(مرسلہ: حکیم محمود۔ساہیوال)

❀ نیک لوگ ناحق کاموں میں شریک نہیں ہوتے اور بیکار چیزوں کے پاس سے وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔

(الفرقان: 72)

❀ شیشہ اور رشتہ بہت نازک ہوتے ہیں۔ شیشہ غلطی سے ٹوٹ جاتا ہے اور رشتہ غلطی فہمی سے۔

(مرسلہ: مظفر۔سرگودھا)

❀ امام غزالی کا قول ہے: "جتنے سجدے کرنے ہیں جوانی میں کر لو۔ میں نے اکثر لوگوں کو بڑھاپے میں سجدے کے بغیر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

(مرسلہ: تسیم سکینہ صدف)

WWW.PAKURDUBOOKS.NET

ضرب سکندری

کسی نے سچ کہا ہے کہ فوجی زندگی میں اندھے موڑ عام زندگی سے بہت زیادہ ہیں اور یہ اکثر جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

پوسٹنگ 2

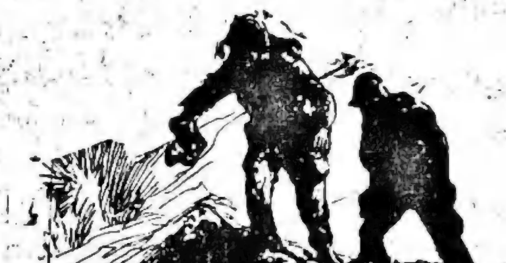

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

فوجی سروس کے دوران ملک سے باہر جانے کے لئے فوج کی آخری "ہاں" کو مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی نام کے انتخاب کے بعد جہاز کی روانگی تک بہت سے موڑ آتے ہیں جو بعض اوقات نا قابل برداشت ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی کا انتخاب ایران کے لئے ہوا۔ ظاہری بات ہے اس انتخاب پر بڑی خوشی ہوئی۔ ہر طرف سے مبارکبادیں وصول کیں۔ مٹھائیاں کھلائیں۔ جانے کے لئے تمام مراحل بخیر و خوبی انجام پا گئے۔ پاسپورٹ بن گیا۔ ٹکٹ کنفرم ہو گیا۔

یہ صاحب پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تعینات تھے۔ کراچی سے بذریعہ جہاز روانگی تھی۔ جانے سے دو دن پہلے گھر کا سارا سامان اونے پونے بیچ دیا کہ واپس آ کر نیا خریدیں گے۔ ویسے بھی پرانا فرنیچر رکھنے کی کوئی مناسب جگہ بھی نہ تھی۔ ہم سب دوستوں نے روانگی سے قبل کھانا دیا اور یہ صاحب خوشی خوشی کراچی روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن شام 5 بجے فلائٹ تھی۔ تیار ہو کر ایئر پورٹ پہنچے۔ سامان جمع کرا کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچے تو اعلان ہوا کہ کیپٹن فلاں فلاں ایئر پورٹ مینجر کے دفتر سے رابطہ کریں۔ وہاں گیا تو آگے سگنل منتظر تھا" کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر ایران کی سیکنڈمنٹ منسوخ کر دی گئی ہے لہٰذا واپس پاکستان ملٹری اکیڈمی رپورٹ کریں۔" اب اس آفیسر کی حالت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

میرے ساتھ خود بھی ایک ایسا حادثہ 1971ء میں پیش آیا۔ میں 1971ء کی جنگ سے پہلے شمالی علاقہ جات میں تعینات تھا۔ جنگ شروع ہونے سے تقریباً دس دن پہلے مجھے گلگت سے 80 میل آگے استور جانا پڑا پھر وہیں رکنے کا حکم ملا۔ حالات بہت گھمبیر تھے۔ ماحول میں بہت زیادہ ٹینشن تھی۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی ہر خبر بجلی بن کر گرتی۔ جنگ ناگزیر نظر آتی تھی لیکن ہم کر کچھ نہیں

سکتے تھے۔ جنگ کا انتظار اور جنگ کا خوف اصل جنگ سے بہت زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔ ہم چاہتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ جنگ جلدی چھڑ جائے تا کہ اس انتظار کی اذیت سے جان چھوٹے۔ پھر جب جنگ شروع ہوئی تو ہم سب نے اور ہمارے جوانوں نے بھی ایک سکون سا محسوس کیا جیسے یکدم بوجھ اتر گیا ہو۔ ہم سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ہمارے جوانوں نے بھی اور ہمارے آفیسرز نے بھی کئی دن اور کئی راتیں مسلسل کام کیا۔ نیند سے آنکھیں سوج گئیں لیکن کوئی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔ قوم تو پھر بھی کچھ دیر کے لئے آرام کر لیتی ہے لیکن جس جان لیوا تکلیف سے فوجی گزرتے ہیں اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں موت زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال جنگ شروع ہوئے ابھی تیسرا دن تھا۔ میں آگے مختلف محاذوں کی تبدیل شدہ صورت حال نوٹ کر رہا تھا کہ اچانک میرے کمانڈنگ آفیسر نے مجھے باہر بلایا اور ایک کاغذ کا میلا سا ٹکڑا میرے آگے رکھ دیا۔ میں سمجھا یہ کسی محاذ کی رپورٹ ہے کیونکہ شمالی علاقہ جات میں ہمارا محاذ جنگ کئی علاقوں میں بٹا ہوا تھا اور کافی وسیع تھا۔ دنیا کا بلند ترین پہاڑی علاقہ تھا۔ موسم بھی خراب۔ شدید برف باری۔ اس لئے تمام محاذوں سے رابطہ رکھنا مشکل ترین کام تھا اور سب سے اہم تھا۔ میں نے کاغذ لے کر پڑھا تو چونک پڑا۔ یہ میرا ڈھاکہ کے لئے پوسٹنگ آرڈر تھا اور مجھے فوری روانگی کا حکم دیا گیا تھا۔

1965ء کی جنگ میں بھی ڈھاکہ میں بطور سٹنر آفیسر کام کر چکا تھا اور شاید اسی تجربے کی بناء پر مجھے اسی سیٹ پر دوبارہ تعینات کر کے فوری وہاں پہنچنے کا حکم ملا۔ میں نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کی طرف مزید حکم کے لئے دیکھا کیونکہ ہیڈ آفس میں کوئی اور آفیسر موجود نہ تھا۔ علاقوں کی انٹیلیجنس، جنگ کی بدلتی صورت حال اور مختلف محاذوں پر جنگی احکامات کی تمام تر ذمہ داری میں نے سنبھالی ہوئی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر نے مغموم حالت میں کہا۔ "مجبوری ہے آپ فوری روانہ ہو جائیں۔"

شمالی علاقہ جات کے راستے نہایت دشوار گزار اور خطرناک ہیں۔ رات کو جیپ پر سفر ممکن نہیں اور نہ ہی اس کی اجازت تھی۔ استور سے گلگت کم از کم 6 سے 8 گھنٹے کی مسافت ہے۔ اس وقت دن کے تین بجے تھے۔ سردیوں کے دن تھے اور ڈیڑھ گھنٹے بعد اندھیرا ہو جاتا تھا۔ بہر حال بستر اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں جیپ میں تھا۔ اللہ اللہ کر کے چلتے رہے۔ خطرناک راستے کے ہر موڑ پر خون خشک ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت تھی کہ ڈرائیور پرانا تھا اور سمجھدار تھا۔ جیپ بدقسمتی سے پرانی تھی جو زیادہ قابل اعتماد نہ تھی۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ راستہ کچا تھا اور مختلف موڑوں پر کبھی اترائی اور کبھی چڑھائی۔ پھسلن کی وجہ سے مزید خطرناک ہو گیا۔ وہ سفر میری زندگی کا یادگار اور خطرناک ترین سفر تھا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی کرم نوازی تھی کہ ہم ہانپتے کانپتے رات گیارہ بجے گلگت پہنچے جہاں رات کو بلیک آؤٹ تھا۔

رات تو گلگت میں آرام سے گزری۔ خراب موسم کی وجہ سے گلگت کی تمام فضائی سروس بند تھی۔ اس دور میں گلگت اور پنڈی کے درمیان کوئی اور سروس نہ تھی۔ لہٰذا جو جیپ مجھے استور سے لائی تھی اسی کو قابو کیا اور صبح اسی میں پنڈی روانہ ہو گیا۔ اس دوران قراقرم ہائی وے بن رہی تھی۔ فی الحال وہ ایک کچی تنگ سی سڑک تھی جو تمام تر سفری خطرات سے پر تھی۔ میں صبح کا چلا ہوا دن کے تین بجے چلاس کے قریب پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں رک کر چائے کا کپ پیا جائے اور کچھ کھایا بھی جائے۔ میرے لئے تو کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن ڈرائیور کو چلتے ہوئے 24 گھنٹے ہو چکے تھے۔ رات کو اسے مکمل آرام بھی نصیب نہ ہو سکا تھا۔ راستہ بھی تنگ اور خطرناک تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر کے لئے رکنا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بہت ضروری تھا۔ پنڈی اس دور میں دو دنوں کا سفر تھا اور شاہراہ قراقرم پر رات کا سفر ممنوع تھا۔

قصبہ چلاس سے تھوڑا پہلے سڑک پر ایک چیک پوسٹ تھی۔ میں جونہی اس کے نزدیک پہنچا ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی نے بانس کا بنا بیریر نیچے گرا کر سڑک بند کردی۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ سپاہی نے ایسا کیوں کیا ہے؟ جبکہ جیپ بھی سرکاری تھی۔ مزید یہ کہ ڈرائیور اور میں دونوں سکاؤٹس کی یونیفارم میں تھے۔ جونہی بیریر کے نزدیک پہنچے تو ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی نے تیزی سے ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید آگے کوئی لینڈ سلائیڈ ہوگئی ہے کہ یہ ہمیں روک رہا ہے۔ جب ہم رکے تو یہ سپاہی دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ سلیوٹ مار کر پوچھا:

”سر آپ کیپٹن سکندر ہیں؟“ میں نے جب ہاں میں جواب دیا تو اتنی دیر میں دوڑ کر صوبیدار صاحب آگئے۔ پھر ایک سگنل میرے سامنے کر دیا۔ ”سر آپ واپس استور رپورٹ کریں۔“ میں یہ پڑھ کر پریشان ہوگیا یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں نے فوری واپس ہونے کی بجائے رک کر گلگت رابطہ کر کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ آدھ گھنٹے بعد گلگت سے رابطہ ہوا۔ پتہ چلا کہ مشرقی پاکستان سے فضائی رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا آپ کی پوسٹنگ وقتی طور پر ملتوی کی جاتی ہے۔ اس لئے واپس ہیڈ کوارٹر رپورٹ کریں جو فی الحال گلگت کی بجائے استور میں تھا۔

ان فوجی تجربات کی روشنی میں کسی فیصلے پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فوجی زندگی کی بے شمار خوبیاں ہیں لیکن وقت بے وقت غیر یقینی صورت حال بھی فوجی زندگی کا خاصہ ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ فوجی زندگی میں اندھے موڑ عام زندگی سے بہت زیادہ ہیں اور یہ اکثر جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

❀❀❀

نامور قلمکار محمد رضوان قیوم کا نیا ناولٹ

پُراسرار، ناقابل یقین واقعات، سطر سطر تحیر سے بھرپور سچی کہانی

سعدا

چھپ کر تیار ہے، آج ہی اپنی کاپی حاصل کریں۔

خورشید بکس شاپ نمبر 17-اقبال مارکیٹ، کمرشل مارکیٹ، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

کامل سٹیشنری اینڈ گفٹ سینٹر D/820 نزد دعوت ہوٹل، راولپنڈی

روسی ایٹم بموں کی چوری

ان لمحوں کی رُوداد جب روس سے چوری ہونے والے 12 ایٹم دہشت گردوں کے ہاتھ لگ گئے

☆ میاں محمد طاہر ابراہیم تمام حالات و واقعات فرضی ہیں، مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے..... 0300-4154083

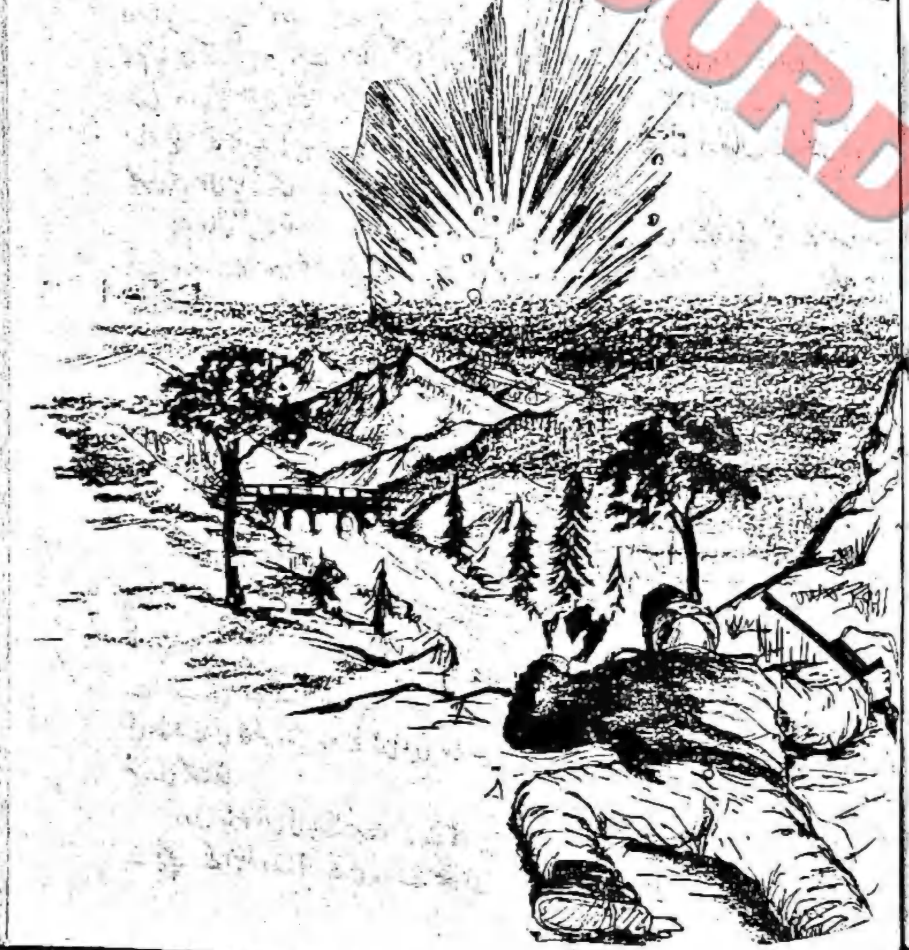

تاجکستان

کے ایک ملٹری ائر فیلڈ پر، جو کہ دارالحکومت دوشنبے سے جنوب مغرب کی طرف صرف 15 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا، دو امریکن جاسوس لا وارث کھڑے ایک روسی ٹرک کی تلاشی لے رہے تھے۔ دونوں ائرفورس کی یونیفارم پہنے ہوئے تھے لیکن یہ امریکن یونیفارم نہیں تھیں۔ ایک جاسوس، جس کا نام ڈین تھا، انڈین ائرفورس کے ونگ کمانڈر کی وردی میں تھا جس کی جلد اور بال اس طریقے سے رنگے گئے تھے کہ وہ برصغیر کا باشندہ دکھائی دے۔ دوسرا جاسوس روسی ائرفورس کی یونیفارم میں تھا اور اس کا نام چارلی تھا۔ اس کی رنگت روسیوں جیسی پیلی، چہرہ سرخ اور بال سنہری تھے۔ اس کے والدین روسی مہاجرین تھے جو نیو یارک کے علاقے بروکلین میں چھوٹی سی روسی کمیونٹی میں رہتے تھے۔

چند سال قبل تاجکستان نے ایک معاہدے کے تحت، فارخور (Farkhor) کا ایک غیر آباد ہوائی اڈا، جو افغانستان کے بارڈر کے پاس واقع تھا، انڈیا کے حوالے کر دیا تھا۔ اس سے انڈیا کا مقصد وسط ایشیا تک اپنی ٹانگیں پھیلانا اور اثر و رسوخ بڑھانا تھا اور تاجکستان اس سے افغانستان سے ملحقہ اپنے بارڈر کو جنوبی جانب سے محفوظ بنانا چاہتا تھا۔

سال 2007ء میں اس معاہدے کو تاجکستان کے دارالحکومت کے قریب واقع ''عینی ائر فیلڈ'' (Aynl) تک توسیع کر دی گئی، جس کا کنٹرول مشترکہ طور پر تاجک، روس اور انڈیا کے پاس تھا۔ وسط ایشیا سے جنوب میں انڈیا تک گیس پائپ لائن کے منصوبے کی حفاظت کی خاطر انڈیا علاقے میں اپنی موجودگی ضروری سمجھتا تھا۔

دونوں جاسوسوں کی بات چیت، ان کے کانوں کے پیچھے لگے الیکٹرونک آلات کی مدد سے سیٹلائٹ کے ذریعے ان کے ہیڈ کوارٹر واقع فورٹ میڈ، میری لینڈ، امریکہ کے آپریشن روم میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

ڈین کو یہاں بھیجنے سے پہلے ہندی زبان سکھائی گئی تھی تاکہ اس کی جلد اور بالوں کی رنگت کے علاوہ اس کی بول چال بھی ہندوؤں جیسی نظر آئے۔ چارلی تو تھا ہی روسی والدین کی اولاد اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان کی وردیوں کے اندر، ٹانگوں، کولہوں اور جسم کے مختلف حصوں میں جاسوسی اور الیکٹرونک کے کئی آلات چسپاں تھے اور ان کی بیلٹوں کے اندر ان فٹ لگے ہوئے تھے جن کی مدد سے ان کی بات چیت، ہزاروں میل دور، سیٹلائٹ کے ذریعے ان کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ رہی تھی اور وہاں سے انہیں ہدایات بھی مل رہی تھیں۔

قازکستان میں موجود ایک مخبر نے مصدقہ اطلاع دی تھی کہ ایک ملٹری ٹرک کو ایٹمی مواد لے کر دوشنبے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا اور امریکن اسی وقت سے اپنے سیٹلائٹ کے ذریعے اس ٹرک کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اب یہ ٹرک عینی ائر فیلڈ پر کھڑا پایا گیا تھا اور امریکن جاسوس اس کا جائزہ لے رہے تھے۔

چارلی نے ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ کر دیکھا تو وہاں لکڑی کے ایک خالی کریٹ کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے''۔ چارلی نے آہستہ سے اپنے ساتھی کو بتایا۔

''ٹرک کی رجسٹریشن بک کو چیک کرو''۔ چارلی کو اس کے کنٹرول سینٹر سے پیغام ملا۔

چارلی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ انہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ پھر وہ ڈرائیور سائیڈ کا دروازہ کھول کر ڈیش بورڈ کی تلاشی لینے لگا۔ پلاسٹک کے ایک لفافے میں بہت سے دیگر کاغذات کے علاوہ رجسٹریشن بک بھی موجود تھی۔ اس نے اپنے کان کے پیچھے لگے مکھی کے سائز کے مائیکروفون میں رجسٹریشن پڑھ کر دہرایا۔

چارلی کو اس کے کنٹرول سینٹر سے اس کے ڈائریکٹر جنرل نے بتایا۔

''یہی وہ ٹرک ہے جو دو ہفتے پہلے سپلو گورسن' کے موٹر پول سے انتولی زرنوف کو جاری کیا گیا تھا۔ سپلو گورسن' یہاں سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر قازکستان کا ایک قصبہ ہے۔ سوویت یونین کے وقت میں اس قصبے کا کوئی نام نہ تھا۔ اسے 'سالچیو گراد' 25 کے کوڈ نام سے پکارا جاتا تھا کیونکہ یہ ایک ایسا خفیہ مقام تھا جہاں روس کے سب سے زیادہ ایٹمی اور بائیو کیمیکل ہتھیار تیار کرنے کے کارخانے تھے''۔

''زرنوف اب کہاں ہے؟'' ڈین نے پوچھا۔

چارلی نے جواب دیا۔ ''ٹرک کا انجن تو ٹھنڈا ہے، زرنوف کہیں بھی ہو سکتا ہے''۔

کنٹرول روم سے اس کے ڈائریکٹر جنرل کی آواز چارلی کے کان سے ٹکرائی۔

''مال مسروقہ کہیں بھی ہو سکتا ہے''۔

ڈین نے کہا۔ ''یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ زرنوف مال مسروقہ یہاں تک لایا ہے لیکن آگے اس نے مال کس کو دیا اور وہ کس سے ملا، یہ جاننا ضروری ہے''۔

چارلی نے طنز کی۔ ''جاؤ، زرنوف کو تلاش کرو''۔ پھر خود ہی کہنے لگا۔

''کاش! ہمیں پتہ چل سکتا کہ وہ کب یہاں پہنچا، اس نے ایٹمی مواد کس کے حوالے کیا؟ کیا یہ تباہ کن مادہ ابھی تک یہیں ہے یا ہوائی جہاز یا سڑک کے راستے کہیں آگے روانہ کر دیا گیا ہے؟''

چارلی کے کان میں کنٹرول روم سے اس کے انچارج رابن کی آواز سنائی دی۔

''ہماری تمام مہارت اور تکنیکی کارکردگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ تم اس ائر فیلڈ پر ریڈیائی اثرات کا جائزہ لو اور تلاش کا کام جاری رکھو''۔

''یقیناً ہم اس کام میں جتے ہوئے ہیں''۔ چارلی نے اپنے ڈائریکٹر جنرل کو بتایا۔

''تم ائر فیلڈ عینی کے آپریشن ٹاور میں جہازوں کی آمد و رفت کی 'لاگ بک' کا بھی جائزہ لے سکتے ہو''۔ ڈائریکٹر رابن نے تجویز پیش کی۔ ''تم گزشتہ تین...... نہ پانچ روز میں یہاں سے پرواز کرنے والے جہازوں کی فہرست بھی تیار کر سکتے ہو''۔

''میں یہ کام کر سکتا ہوں''۔ چارلی نے اپنے باس کو بتایا۔ ''یہ ہندو لوگ بھی روسیوں سے دب کر رہتے ہیں''۔

''تمہاری روسی زبان تو میری ہندی سے دو درجے بہتر ہے''۔ ڈین نے لقمہ دیا۔ ''تم تو ان پر خوب رعب ڈال سکتے ہو''۔

''تمہیں بھی شاید اپنی ہندی کی پریکٹس کا موقع ملنے والا ہے''۔ چارلی نے اس کی 'کمپنی' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈین کو بتایا جو ان کی طرف چلی آ رہی تھی۔ یہ سب لوگ انڈین ائرفورس کی یونیفارم میں تھے۔ چند آدمیوں کا یہ گروپ ابھی ابھی ائرفیلڈ کے کنٹرول ٹاور سے برآمد ہوا تھا۔ ان میں سے ایک گروپ کیپٹن کی یونیفارم میں تھا جو عہدے کے لحاظ سے روسی کرنل کے برابر تھا۔

چارلی کے کان میں کنٹرول روم سے کھسر پھسر ہوئی۔ ''یہ آفیسر، گروپ کیپٹن شراد نارائن ہے۔ یہ تمہارے لئے دردِ سر بن سکتا ہے کیونکہ یہ انڈیا کے سکیورٹی ایڈوائزر کا رشتہ دار ہے ور روسیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے''۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

نارائن نے آتے ہی ڈین سے انگلش میں سوال کیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

ڈین نے اٹینشن ہو کر سلیوٹ مارتے ہوئے جواب دیا۔

''سر! مرا نام سلمان پٹیل ہے، ونگ کمانڈر سلمان پٹیل۔ میں ائر وائس مارشل صوبہ راؤ کے سٹاف میں ہوں''۔ ڈین نے پہلے ہندی اور بعد میں انگلش بگھار دی۔ ''مجھے اس بیس کی انسپکشن کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے''۔

ڈین کی ساری گفتگو فورٹ میڈ لے، میری لینڈ، امریکہ کے جاسوسی کے کنٹرول روم میں واضح طور پر سنی جا رہی تھی۔ یہاں بھیجنے سے پہلے ڈین کو نہ صرف ہندی کا کورس کرایا گیا تھا بلکہ جعلی کاغذات بھی تیار کر کے دیئے گئے تھے جو انڈیا کی سرکاری زبان ہندی اور انگریزی میں تھے۔

''اور یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' گروپ کیپٹن نے چارلی کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اگرچہ روس اور انڈیا کے تعلقات دہائیوں سے خوشگوار چلے آ رہے تھے اور سب سے بڑا روسی اسلحے کا خریدار انڈیا ہی تھا لیکن کچھ عرصے سے، بلکہ جب سے تاجکستان نے اپنی ائرفیلڈ انڈیا کے حوالے کی تھیں، روسی تاجکستان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ انڈیا کو ان ائر فیلڈز سے بے دخل کیا جائے، جس کی وجہ سے دونوں ملکوں، روس اور انڈیا کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے نارائن روسیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

''میرا نام سرگی کولیکوف ہے سر!'' چارلی نے روسی لہجے میں انگلش بولتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے ہی عارضی طور پر ائر وائس مارشل صوبہ راؤ کے سٹاف کا معاون بنایا گیا ہے''۔

''اور تم دونوں یہاں کھڑے کس چیز کا جائزہ لے رہے ہو؟'' نارائن نے پوچھا۔

اتنے میں ائر فیلڈ پر ایک روسی مگ جہاز طوفانی انداز میں شور و غل مچاتا ہوا لینڈ کیا، جس کی وجہ سے بات چیت ممکن نہ رہی اور سب کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ جب جہاز کے انجن بند ہو گئے اور شور ختم ہوا تو ڈین نے جواب دیا۔ ''ہم دھوپ سے بچنے کے لئے یہاں سائے میں کھڑے اس بات پر غور کر رہے تھے کہ روس اور انڈیا کے مشترکہ مفاد میں عینی ائر فیلڈ پر مزید کیا سہولیات پیدا کی جا سکتی ہیں''۔

گروپ کیپٹن نارائن نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

تینوں ملکوں، روس، تاجکستان اور انڈیا کے تعلقات کا معاملہ ایک نازک موضوع تھا جس میں گروپ کیپٹن نارائن اپنے آپ کو ملوث کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے اچانک ہندی زبان میں ڈین سے کوئی سوال پوچھا۔ ہندی زبان کی بہتیری پریکٹس کے باوجود سوال ڈین کے سر کے اوپر سے گزر گیا اور اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ نارائن نے کیا پوچھا ہے۔ اس موقع پر پھر کنٹرول روم ڈین کی مدد کو آیا اور اس کے کان میں لگے ننھے سے مائیکروفون میں بتایا کہ گروپ کیپٹن پوچھ رہا ہے کہ تمہارا تعلق انڈیا کے کس علاقے سے ہے کیونکہ تمہارا ہندی بولنے کا لب و لہجہ کچھ غیر مانوس سا ہے''۔

''سر! میں ہماچل پردیش میں پیدا ہوا تھا اور میرے ماں باپ گھر میں پنجابی بولتے تھے''۔ ڈین نے جواب دیا۔ وہ کچھ پنجابی بھی بولنا چاہتا تھا لیکن گروپ کیپٹن نے مزید بات چیت میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ پھر کچھ توقف کے بعد نارائن نے کہا۔

''ونگ کمانڈر! ہمیں رپورٹس ملی ہیں کہ اس ائربیس پر کچھ دہشت گردوں کے ایجنٹس موجود ہیں، بھیس بدلے ہوئے''۔ نارائن نے انگریزی میں پوچھا۔ ''وہ ہتھیاروں کا سودا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ غالباً غیر روایتی ہتھیاروں کا۔ تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟ ہمیں ایف ایس بی (FSB) نے یہ اطلاع دی ہے۔

ڈین نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔ ''نہیں گروپ کیپٹن! ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے، سر!''

اب چارلی نے بھی زبان کھولی۔ ''ایسی افواہیں ہمیشہ ہی گردش کرتی رہتی ہیں، سر! لیکن اب تک کوئی صحیح ثابت نہیں ہوئی''۔ اس کا انگلش بولنے کا انداز اب بھی روسی تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتے ہو، میجر!'' نارائن نے چارلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

جب تک انڈین ائرفورس کا افسر دونوں جاسوسوں سے بات چیت کرتا رہا، ان کے کنٹرول روم کے کارکنوں کی جان پر بنی رہی کہ کہیں ان کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔

روسی خفیہ ایجنسی ایف ایس بی گزشتہ دور کی کے جی بی (KGB) کی نئی شکل تھی اور اس میں مافیا کے کئی کرپٹ، بدعنوان، سمگلر اور بدمعاش لوگ گھسے ہوئے تھے، جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر روسی ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھ بیچنے پر تیار رہتے تھے۔ اب امریکنوں کو سب سے بڑا خطرہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں غیر روایتی ایٹمی ہتھیار ''مسلمان دہشت گردوں'' کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اسی لئے دونوں امریکن جاسوس اس ٹرک کے تعاقب میں عینی ائربیس تک پہنچے تھے جو قازکستان سے ایٹمی مواد پر مشتمل 12 صندوق لے کر یہاں تک پہنچا تھا لیکن جواب خالی پڑا تھا۔

امریکی جاسوس ایجنسی کو یقین تھا کہ روسی مافیا کے کارندوں نے ایک تاجک دچولے زردوف کے ذریعے یہ ایٹمی مواد کسی اسلامی تنظیم کو فروخت کیا تھا۔ یہ تنظیم القاعدہ، طالبان یا پاکستان کی وہ تنظیم ہو سکتی تھی جس کے رہنما ابراہیم اظہر نے 1999ء میں انڈین مسافر بردار جہاز اغوا (ہائی جیک) کر کے افغانستان کے شہر قندھار میں لا اتارا تھا اور مسافروں کی رہائی کے بدلے میں، کشمیری مجاہدین کے قائد مولانا مسعود اظہر اور دوسرے کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑنے والے آزادی کے متوالوں کو بھارتی عقوبت خانوں سے آزاد کرایا تھا۔

مولانا مسعود اظہر نے رہائی کے بعد کراچی پہنچنے پر اپنے فقید المثال استقبالی جلوس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا۔

''میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم 'مسلمان' اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ اسلام کے دشمنوں، امریکہ اور انڈیا کو تباہ و برباد نہ کر دیں''۔

سال 2000ء میں دونوں بھائیوں، ابراہیم حسین اظہر اور مولانا مسعود اظہر نے شمالی پہاڑی علاقے میں اپنی تنظیم ''جیش محمد'' قائم کی تھی جس کا مقصد وحید کشمیر کو بھارتی غاصبانہ قبضے سے آزاد کرانا تھا۔

ابراہیم کے خیال میں انڈیا یقیناً پاکستان کا دشمن نمبر ایک تھا لیکن اس کی اصل پشت پناہی اسرائیل اور امریکہ کرتے تھے جو عالم اسلام کے حقیقی دشمن تھے لہٰذا امریکیوں کا خیال تھا کہ یہ تنظیم ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی خفیہ کوشش کر رہی تھی۔

''آل رائٹ، اپنا کام جاری رکھو''۔ یہ کہتے ہوئے گروپ کیپٹن نارائن، اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور دونوں امریکن جاسوسوں کی جان میں جان آئی۔ ڈین کے کان میں کھسر پھسر ہوئی۔ ''انڈین

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آفیسر کو ائربیس پر روسیوں یا پاکستانیوں کی طرف سے تخریب کاری کا خطرہ ہے"۔ کیونکہ انڈیا وسط ایشیا تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر اپنے دشمن پاکستان کے اندر تخریب کاری کے لئے تاجکستان کے ہوائی اڈے فارخور کو جو افغان بارڈر کے قریب واقع تھا، پاکستان مخالف طالبان، لشکر جھنگوی اور دیگر مذہبی جنونیوں کو تربیت، اسلحے کی ترسیل اور مالی و فنی امداد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔

"آؤ لاگ بک چیک کریں"۔ چارلی نے ڈین کو کنٹرول ٹاور بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشورہ دیا اور وہ دونوں چلچلاتی دھوپ میں پسینہ بہاتے ہوئے بلڈنگ کی طرف چل پڑے۔

جب ڈین نے کنٹرول ٹاور آفس میں موجود انڈین ائرفورس کے سارجنٹ سے اپنا تعارف بطور ونگ کمانڈر سلمان پٹیل کرایا اور ائر فیلڈ کی لاگ بک دیکھنے کا حکم سنایا تو سارجنٹ نے قدرے بیزاری اور ہچکچاہٹ ظاہر کی اور ڈین کو بتایا کہ "ونگ کمانڈر سلمان پٹیل کا نام مجاز افسران کی اس فہرست میں شامل نہیں ہے جنہیں لاگ بک دیکھنے کا اختیار ہے"۔

ڈین اور چارلی کی انڈین سارجنٹ سے ہونے والی تمام گفتگو واشنگٹن کے نواح میں شمال مغرب کی طرف 20 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جاسوسی کے مرکز میں ڈائریکٹر جنرل رابن براہ راست سن رہا تھا۔ ڈین نے انڈین آفیسر کو ائر وائس مارشل صوبہ راؤ کے دفتر کا نمبر دیا اور حکم دیا کہ وہ دفتر سے خود ونگ کمانڈر بارے تصدیق کر لے۔ یہ نمبر دراصل سیٹلائٹ کے ذریعے جاسوسی کے مرکز سے جڑا ہوا تھا۔ سارجنٹ نے جیسے ہی کال ملائی اور ونگ کمانڈر سلمان پٹیل کے حکم کے بارے استفسار کیا، آگے سے ہندی، پنجابی اور انگریزی میں اس کی دھلائی شروع ہوگئی۔ کال سنتے ہوئے اس کے چہرے کے کئی رنگ بدلے۔ جیسے ہی فون بند ہوا، سارجنٹ نے انتہائی نیازمندی اور فرمانبرداری سے لاگ بک لاکر دونوں امریکن جاسوسوں کے سامنے رکھ دی۔

ڈین اور چارلی نے گزشتہ تین روز کی بجائے سات روز کے دوران عینی ائر فیلڈ پر لینڈ کرنے اور اُڑنے والے جہازوں کے کوائف آہستہ آواز میں پڑھنے شروع کر دیئے تاکہ ان کا کنٹرول روم تمام ڈاٹا ریکارڈ کر کے تجزیہ کر سکے اور انہیں مزید ہدایات دے سکے۔

پچھلے پورے ہفتے کے دوران عینی ائر فیلڈ سے ایک درجن جہازوں نے اڑان بھری تھی۔ ان میں سے صرف ایک روسی جیٹ یہاں سے اُڑ کر فارخور کی طرف گیا۔ فارخور ائر فیلڈ افغان بارڈر کے قریب واقع تھا۔ تاجکستان کے باقی تمام فوجی ہوائی اڈے یا تو روس نے کرائے پر لے رکھے تھے یا تاجکستان، روس اور انڈیا کے مشترکہ کنٹرول میں تھے۔ روس اس بات کے سخت خلاف تھا کہ تاجکستان آزادی کے بعد اپنی ائرفورس کھڑی کرے۔ دارالحکومت دوشنبے میں موجود روسی ائرفورس تاجکستان کی فضاؤں کی نگرانی کی ضامن تھی۔

عینی ائر فیلڈ پر واحد غیر روسی جہاز دو روز پہلے اترا تھا، وہ "انڈین ائرفورس" کا چھوٹا جہاز اے این 32 تھا، جو دونوں امریکن جاسوسوں کو "نئی دلی" سے لے کر آیا تھا اور جواب بھی رن وے کے آخری سرے پر کھڑا تھا۔ یہاں سے پاکستان کی طرف کسی بھی جہاز نے اڑان نہیں بھری تھی، جیسا کہ امریکنوں کا شک تھا کہ ایٹمی دھماکہ خیز مادہ پاکستانیوں نے سمگل کیا تھا۔ تین روز پہلے تک یہاں سے کوئی روسی جہاز نہیں اڑا تھا جبکہ امریکن کنٹرول سینٹر کا اندازہ تھا کہ ایٹمی مواد عینی ائر فلیڈ پر دو روز پہلے پہنچا تھا، یعنی دونوں امریکن

جاسوسوں کی آمد سے کچھ ہی دیر پہلے۔ البتہ ان کی آمد سے دو گھنٹے قبل "نیٹو" (NATO) کے ایک ہیلی کاپٹر ایم آئی-8 نے یہاں سے اڑان بھری تھی اور شمال کی طرف گیا تھا جس کے بارے میں لاگ بک میں صرف یہ اندراج تھا۔ "فضائی نگرانی پر"۔

اب سوال یہ تھا کہ اگر ایٹمی دھماکہ خیز مواد عینی ائر فیلڈ سے بذریعہ ہوائی جہاز آگے نہیں گیا تو وہ ائر فیلڈ پر کہیں موجود ہو سکتا تھا یا براستہ شاہراہ نمبر A384 جو یہاں سے سو میل دور تاجکستان، افغانستان بارڈر کو "دریائے پنج" پر 672 ستونوں سے بنے پل کے ذریعے، جو دونوں ملکوں کو ملاتی تھی، کے ذریعے آگے روانہ کر دیا گیا ہوگا۔

امریکنوں نے اس مہم یا مشق کا نام "ہیسٹک" (Haystack) یا گھاس کے ڈھیر میں سوئی کی تلاش رکھا ہوا تھا اور گزشتہ تین ماہ سے یہ ان کی جاسوس ایجنسی کے لئے دردِ سر بنا ہوا تھا جب سے روس کے ایک خفیہ ذریعہ نے قازکستان کے دارالحکومت آستانہ (Astana) میں واقع امریکن ایمبیسی میں موجود سی آئی اے کے ایجنٹ کو اطلاع دی تھی کہ وہاں سے ایٹمی دھماکہ خیز مواد بڑے پیمانے پر سمگل ہو رہا تھا۔ امریکن جاسوس ایجنسیوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

امریکن نیشنل سکیورٹی ایجنسی این ایس اے (NSA) کے ڈائریکٹر جنرل رابن نے اپنے آٹھ بہترین جاسوسوں کو متعلقہ ملکوں کی زبان، کلچر اور مذہب کی تربیت دے کر دو دو کو تاجکستان، قازکستان، افغانستان اور پاکستان میں تعینات کیا تھا اور انہیں جدید ترین جاسوسی آلات، سیٹلائٹ سسٹم کی سہولت کے ساتھ ان ملکوں میں بھیجا تھا کہ وہ یہ سراغ لگائیں کہ یہ سمگل شدہ دھماکہ خیز مادہ کن لوگوں کے ہاتھ میں جا رہا تھا کیونکہ امریکہ نائن الیون (9/11) کے بعد اس خبر سے بے حد گھبراہٹ کا شکار تھا۔

قازکستان میں متعین جاسوس، تھارٹن اور واٹز اس ملٹری ٹرک کا سراغ لگانے میں تو کامیاب ہو گئے تھے جو موٹر پول سے اناطولی زرنوف کو جاری ہوا تھا اور جس کے ذریعے سیلپنو گورسک کے مقام سے ایٹمی مواد، کراچی، پاکستان سمگل کیا جانا تھا۔ انہوں نے ٹرک کا رجسٹریشن نمبر بھی حاصل کر لیا تھا، جس کی اطلاع انہوں نے اپنے کنٹرول روم کو دے دی تھی اور یہ خالی ٹرک اب عینی ائر فیلڈ پر لاوارث کھڑا تھا۔

امریکن جاسوسی مرکز میں "آپریشن ہیسٹیک" کے تحت جمع شدہ اطلاعات کے مطابق اب تک قازکستان سے ڈیڑھ گز لمبائی اور آدھا گز چوڑائی اور موٹائی کے ایک درجن کنستر چوری ہو چکے تھے، جن میں ہر ایک میں 120 پونڈ ایٹمی دھماکہ خیز مادہ سمگل کیا گیا تھا۔ جو بڑی آسانی کے ساتھ ایک چھوٹے ہوائی جہاز یا ٹرک کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ ہر کنستر میں دو ٹن طاقت کا ایٹمی ہتھیار موجود تھا جو روسی 120 ایم ایم ایٹمی آرٹلری بم کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ امریکن سی آئی اے کی اطلاع کے مطابق ایسے ایک درجن کنستر روسی مافیا نے پاکستانی دہشت گردوں کے ہاتھ، گزشتہ دو ہفتے کے دوران فروخت کئے تھے۔

اب یہ ایٹمی ہتھیار یا تو ابھی تک تاجکستان میں ہی کہیں موجود تھے۔ یا ایک ہزار میل دور پاکستان کی بندرگاہ کراچی کی طرف محوِ سفر تھے۔ امریکہ کی طرف سے دوسری جنگ عظیم میں ہیروشیما پر گرایا جانے والا بم 16 کلوٹن طاقت کا تھا۔ دو ٹن طاقت کے ایک ایٹمی ہتھیار سے یورپ کے کسی بھی شہر کا بڑا حصہ تباہ کیا جا سکتا تھا۔

ڈین اور چارلی، عینی ائر فیلڈ کی کنٹرول ٹاور بلڈنگ سے باہر آئے تو خاصے پریشان تھے۔ "آخر ایٹمی ہتھیار کہاں غائب ہو گئے؟" ڈین نے سوال کیا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"یقیناً اسی ائر فیلڈ پر کہیں چھپائے گئے ہوں گے"۔ چارلی نے اپنے ساتھی کو تسلی دی۔

"ہمیں تلاش کا کام جاری رکھنا چاہئے، اگر ہم ایٹمی مواد کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوتے تو ہمیں اس ڈرائیور کو ڈھونڈ نکالنا چاہئے جس کا نام اناطولی زرنوف تھا جو ان کنستروں کو اس ائر فیلڈ تک لے کر آیا تھا"۔

"لیکن ہمارے جسم کے ساتھ منسلک "بلیک کیوب" (Black Cube) نامی آلہ ریڈیائی ایٹمی لہروں کی نشاندہی کیوں نہیں کر رہا؟" ڈین نے پریشانی ظاہر کی۔

"کیونکہ روسیوں نے ان کنستروں کو اتنی مہارت سے تیار کیا ہے کہ ان سے ریڈیائی لہریں اتنی کم مقدار میں خارج ہوتی ہیں کہ تمہارے پاس موجود آلہ ان کی نشاندہی کر ہی نہیں سکتا۔" کنٹرول روم سے اسے آگاہ کیا گیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس وقت تک ریڈیائی لہریں محسوس ہی نہیں کر سکتے جب تک کہ بم کو چلا نہ دیا جائے۔" ڈین نے شک کا اظہار کیا۔

ادھر امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے ایوان صدر کے تہہ خانے میں ہونے والے نیشنل سکیورٹی کونسل کے انتہائی اہم اجلاس میں "آپریشن اسٹیک" کے سربراہ ولیم رابن نے یہ بیان دے کر تھرتھلی مچا دی کہ "قازکستان کے دارالخلافے" آستانہ کے نزدیک واقع ایٹمی مرکز سپٹنو گورسک سے چوری ہونے والے 12 سوٹ کیس، افغانستان کے راستے کراچی (پاکستان) کی طرف لے جائے جا رہے ہیں اور ممکنہ طور پر روسی مافیا سے یہ سوٹ کیس، کشمیر میں آزادی کی جنگ لڑنے والی پاکستانی تنظیم "جیش محمد" نے خریدے ہیں۔ ہر سوٹ کیس میں ایک سے ڈیڑھ کلوٹن طاقت کا ایٹم بم موجود ہے جو واشنگٹن ڈی سی سمیت کسی بھی یورپی شہر کے مرکز میں تباہی مچانے کے لئے کافی ہے اور یقینی طور پر یہ ایٹمی مواد ان ملکوں کے خلاف استعمال ہوگا جو کشمیر میں انڈین قبضے کی حمایت کرتے ہیں"۔

نیشنل سیکورٹی کونسل کی اس میٹنگ میں صدر امریکہ کے قومی سلامتی کے مشیر، انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے (CIA) تینوں مسلح افواج کے نمائندے، پارلیمنٹ کے ایوان بالا اور ایوان زیریں کے ممبران اور امریکہ کی دیگر تمام خفیہ ایجنسیوں کے ارکان شامل تھے۔ لہٰذا سب کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا لازمی تھا۔

رابن نے اپنے خطرات و خدشات کی تصدیق کے لئے ان ایٹمی سوٹ کیسوں کے موجد اور منحرف روسی سائنسدان اور روسی صدر کے سابق سکیورٹی ایڈوائزر (مشیر) الیگزنڈر ایوانووچ لیبڈ کے اس انٹرویو کا حوالہ دیا جو امریکن نیوز چینل سی بی ایس (CBS) نے 7 ستمبر 1997ء کو نشر اور ٹیلی کاسٹ کیا تھا۔

لہٰذا اس اجلاس میں ایسا سیٹلائٹ سسٹم بنانے کی منظوری دی گئی جو کرۂ ارض پر رینگتی ہوئی چیونٹی کی بھی نشاندہی کر سکے۔

میری لینڈ میں نیشنل سکیورٹی ایڈمنسٹریشن کے کنٹرول روم کے قریب ہی ایک دوسرا مواصلاتی مرکز واقع تھا جسے "وار روم" کہا جاتا تھا اور جہاں لینگلے (Langley)، ورجینا (Verginia)، کے سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر سے آنے والی خلائی تصویروں اور ویڈیو فلموں کا تجزیہ کیا جاتا تھا۔ اس کے انچارج ڈاکٹر فریڈرک بیلی تھے جو گزشتہ روز سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے بھیجی گئی چھ گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل وہ فلم دیکھنے میں مصروف تھے جو سیٹلائٹ سسٹم سی ایف ون (C.F One) نے ریکارڈ کی تھی اور جس میں نیٹو کے ایک ہیلی کاپٹر کو جو فرانسیسی افواج کے زیر استعمال تھا،

کابل سے اڑ کر تاجکستان کی طرف نیچی پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔ یہ ہیلی کاپٹر عینی ائر فیلڈ پر اترا۔ اس میں سے پانچ مسافر جو اے کے ایم رائفلوں سے مسلح تھے، باہر آئے۔ انہوں نے پہلے سے وہاں کھڑے ٹرک میں سے 12 عدد سوٹ کیس ہیلی کاپٹر میں منتقل کئے اور واپس کابل کی طرف پرواز کر گئے۔ ڈین اور چارلی کو عینی ائر فیلڈ پر یہی خالی ٹرک ملا تھا۔

نیٹو کا یہ ہیلی کاپٹر 9:50 بجے واپس کابل انٹرنیشنل ائر پورٹ پر لینڈ کیا۔ وہاں اس میں دوبارہ تیل بھرا گیا۔ اس کی دیکھ بھال اور سروس کی گئی اور دوبارہ "ٹریننگ مشن" پر پاکستان کے شہر کوئٹہ کی طرف پرواز کر گیا۔ کوئٹہ، کابل سے 280 میل کے فاصلے پر واقع ہے اور کراچی سے آدھے فاصلے پر ہے۔

اس کے بعد سیٹلائٹ کا رابطہ کٹ گیا۔

24 گھنٹے کے بعد سیٹلائٹ نے جو تصویریں بھیجیں، ان میں فرانسیسی افواج کے زیر استعمال، نیٹو کا وہی ہیلی کاپٹر، کراچی کے جناح انٹرنیشنل ائر پورٹ کے ایک کونے میں کھڑا دیکھا جا سکتا تھا۔

کراچی کا ائر پورٹ بہت مصروف ائر پورٹ تھا جہاں سے روزانہ سینکڑوں پروازیں آتی اور روانہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح کراچی کی بندرگاہ میں بھی 24 گھنٹے میں بے شمار بحری جہاز لنگر انداز ہوتے اور مال تجارت اتار اور چڑھا کر آگے روانہ ہوتے تھے۔ لہٰذا اب یہ پتہ لگانا ممکن نہیں رہا تھا کہ ایٹمی ہتھیار کراچی سے آگے بذریعہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز کس طرف منتقل کئے گئے تھے۔ البتہ امریکنوں نے افغانستان میں موجود سی آئی اے کے ذریعے یہ پتہ لگا لیا تھا کہ نیٹو کے اس ہیلی کاپٹر کا پائلٹ کوئی فرانسیسی نہیں بلکہ ایک جرمن نومسلم الفریڈ کاخ تھا، جو اگرچہ جرمن فوجی دستے میں شامل ہو کر، نیٹو کی طرف سے افغانستان کے مجاہدین کے خلاف لڑنے کے لئے کابل آیا تھا لیکن اس کی ہمدردیاں طالبان کے ساتھ تھیں۔ اسی لئے ایک مسلمان مجاہد، ابراہیم حسین عرف "جیکال" کے ورغلانے پر وہ تاجکستان سے 12 سوٹ کیس اپنے نیٹو ہیلی کاپٹر میں لاد کر کراچی پہنچانے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس لمبے سفر میں "جیکال" مسلسل اس کا ہمسفر رہا تھا اور اس نے کاخ کو صرف اتنا بتایا تھا کہ ان سوٹ کیسوں میں کشمیری مجاہدین کے لئے جدید ترین اسلحہ لے جایا جا رہا تھا۔

امریکن انٹیلی جنس سینٹر نے اپنے سیٹلائٹ کے ذریعے یہ بھی دیکھا تھا کہ جس روز نیٹو کا ہیلی کاپٹر کراچی کے جناح انٹرنیشنل ائر پورٹ پر لینڈ کیا تھا، اسی روز ایک بڑا کنٹینر ائر پورٹ سے لا کر روسی بحری جہاز "یاکوٹسک" میں لادا گیا تھا جو مڈل ایسٹ کی طرف جا رہا تھا اور جس کی ایک منزل اسرائیل کی بندرگاہ حیفہ بھی تھی۔ لہٰذا امریکیوں کو شک تھا کہ ایٹم بموں سے بھرے ہوئے سوٹ کیس اسرائیل کی تباہی کے لئے حیفہ میں اتارے جائیں گے، اس لئے سی آئی اے نے اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کو چوکنا کر دیا تھا۔

اب امریکہ کے ایوان صدر "وائٹ ہاؤس" میں امریکی صدر کے مشیروں کے درمیان یہ بحث چل رہی تھی کہ روسی بحری جہاز کو کھلے سمندر میں روک کر اس کی تلاشی کے بعد ایٹم بموں کے سوٹ کیسوں پر قبضہ کر لیا جائے لیکن اکثریت کی رائے تھی کہ بین الاقوامی پانیوں میں کسی دوسرے ملک کے بحری جہاز کی تلاشی سے نہ صرف روس اور امریکہ کے درمیان نئی سرد جنگ کا آغاز ہو جائے گا بلکہ اس طرح بین الاقوامی قوانین کی بھی خلاف ورزی ہو گی، لہٰذا اس معاملے کو اسرائیل پر چھوڑ دینا چاہئے۔ جو اقوام متحدہ کی قراردادوں اور دنیا بھر کے تسلیم شدہ اصولوں کی کھلے عام دھجیاں اڑانے میں اپنے آپ کو مطلق آزاد سمجھتا ہے۔

WWW.AURDUBOOKS.NET

چنانچہ روسی بحری جہاز کے اسرائیلی بندرگاہ حیفہ پہنچنے سے بہت پہلے ہی کھلے سمندر میں اسرائیلی جنگی کشتیوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ فوجی جہاز پر چڑھ آئے اور اس کنٹینرکی جس کی نشاندہی امریکن جاسوس ایجنسی سی آئی اے نے کی تھی۔ کئی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ کنٹینر دریافت کر لیا گیا جو کراچی سے روسی جہاز پر لوڈ کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے تو کنٹینر سے خارج ہونے والی ایٹمی ریڈیائی لہروں کا، مختلف پیچیدہ سائنسی آلات سے جائزہ لیا گیا۔ اس مقصد کے لئے خصوصی ایٹمی ماہرین کو بلایا گیا تھا۔ ان ماہرین کو شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ کنٹینر سے ایسی کوئی ایٹمی ریڈیائی لہریں خارج نہیں ہو رہی تھیں۔

انہوں نے اسے روسی ماہرین کی پیکنگ کا کمال سمجھا اور کنٹینرکی لہریں اور سیلیں توڑ کر کھولنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لئے ماہرین کو ایٹمی ریڈیائی لہروں کے اثرات کے تحفظ کے لئے خصوصی لباس پہنایا گیا۔

جب کنٹینر کو انتہائی احتیاط اور بحری جہاز پر موجود تمام عملے اور اسرائیلی قابض فوجیوں کو کشتیوں کے جہاز سے دور ہٹا کر کھولا گیا تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کنٹینر میں بڑے بڑے گتے کے ڈبوں میں بند چین کے بنے ہوئے دنیا بھر کے سستے سٹوروں پر بکنے والے بچوں کے پوتڑے، خواتین کے زیر جامے اور انگیاں، رنگ برنگی عورتوں کی وگیں، لباس اور بچوں کے ڈائپر کے ملبوسات، کھلونوں، جوتوں کی پیٹیوں، غباروں کے پیکٹوں، ڈیکوریشن کی مختلف چیزوں اور مصنوعی پھولوں وغیرہ کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اب اسرائیلی ماہرین اور فوجی امریکہ کی جاسوس ایجنسی سی آئی اے کی غلط اطلاعات کا ماتم کرتے ہوئے روسی بحری جہاز سے اتر آئے۔

ادھر روسی تجارتی بحری جہاز کی تلاشی اور اسرائیلیوں کے ہاتھوں، کھلے سمندر میں گرفتاری کی خبر جب ماسکو پہنچی تو روسی صدر آپے سے باہر ہو گیا اور دھمکی دی کہ اگر اسرائیل نے 24 گھنٹے کے اندر اپنی اس گھناؤنی حرکت پر غیر مشروط معافی نہ مانگی تو روسی بحریہ، کھلے سمندروں میں سفر کرنے والے تمام اسرائیلی تجارتی جہازوں کو گرفتار کر لے گی۔ 24 گھنٹے تو دور کی بات، اسرائیلی وزیراعظم نے دھمکی ملنے کے چھ گھنٹے کے بعد ہی ہاتھ جوڑ کر روس سے معافی مانگ لی اور اس طرح سیاست میں آنے والا نیا طوفان ٹل گیا۔ البتہ موساد اور سی آئی اے کے درمیان شدید قسم کی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ سے قبل تو اسرائیلیوں کا مقولہ تھا کہ ”معافی مانگنا اور معافی دینا“ ہماری لغت میں شامل ہی نہیں۔

امریکیوں کو روسی جہاز پر چوری شدہ روسی ایٹمی سوٹ کیس نہ ملنے پر اپنی انٹیلی جنس ناکامی پر جو شرمندگی اور ندامت اٹھانا پڑی تھی، اس کے بعد انہوں نے اپنے جدید ترین سیٹلائٹ سسٹم کو مزید متحرک کر دیا اور یہ دیکھنے لگے کہ دنیا بھر میں کہیں پر کوئی غیر معمولی سرگرمی یا خلاف معمول حرکات تو نہیں ہو رہیں۔

اتفاقاً امریکیوں نے دیکھا کہ سپین کے ایک جزیرے ”لا پالما“ (La Palma) کی آتش فشانی چٹانوں پر بڑی بڑی دیوہیکل مشینیں کھدائی میں مصروف ہیں۔ ان پہاڑوں نے آخری لاوا 1971ء میں اگلا تھا۔ اس کے بعد یہاں بالکل خاموشی تھی۔ سطح سمندر سے لے کر چٹانوں کی چوٹیوں تک گھنے جنگلات اُگے ہوئے تھے۔ صرف ساحل کے قرب و جوار میں سیاحوں کی تفریح طبع اور قیام کے لئے چند ہوٹل اور ریسٹوران بنے ہوئے تھے جہاں اردگرد کے دوسرے جزائر کی طرح، دنیا بھر کے سیاح غسلِ آفتابی اور سیر و تفریح کے

لئے سال بھر آتے رہتے تھے اور یہاں کے معتدل موسم اور خوشگوار آب و ہوا اور ماحول کا لطف اٹھاتے تھے ورنہ جزیرے پر مقامی طور پر کوئی آبادی نہ تھی۔

جزیرے ”لا پالما“ کے مختلف دس مقامات پر کھدائی اور ڈرلنگ ہوتے دیکھ کر امریکیوں کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ دنیا کے کسی سروے میں ان جزائر کے اردگرد کے کئی سو میل کے علاقے یا سمندر میں تیل، گیس یا کسی قسم کی دیگر معدنیات کی کبھی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی تھی۔ پھر یہاں کھدائی کون اور کس مقصد کے لئے کر رہا تھا؟ امریکیوں نے اپنے تمام سیٹلائٹ سسٹم اور زمینی جاسوسوں کو اس پُراسرار کھدائی کا سراغ لگانے پر مامور کر دیا۔

امریکیوں نے جلد ہی پتہ لگا لیا کہ جزیرے پر کھدائی کے لئے استعمال ہونے والی بھاری مشینری ایک فرانسیسی کمپنی 'پٹو ٹیکنالوجی، پیرس“ کی تیار کردہ تھی اور یہی مشینری سعودی عرب میں امریکہ اور سعودی حکومت کی مشترکہ تیل کمپنی ”آرامکو“ (Aramcom) تیل کے کنوؤں کی کھدائی کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ جزیرے پر کام کرنے والے ورکر اور کارکن و انجینئر بھی وردیوں سے بظاہر آرامکو کے ہی ملازم نظر آتے تھے۔ ان کی نگرانی ایک فرانسیسی، ایک عربی اور ایک چینی افسر کر رہے تھے۔ ساحل سے چوٹیوں کی طرف جانے والے تمام راستے بند تھے اور ان پر مسلح گارڈ تعینات تھے جو بظاہر غیر ملکی، خصوصاً عربی یا ایشیائی نظر آتے تھے۔ ان چوٹیوں پر ساز و سامان ہیلی کاپٹروں کے ذریعے پہنچایا جاتا تھا اور اس مقصد کے لئے انتہائی بلندی پر ایک ہیلی پیڈ بھی بنا ہوا تھا جہاں ایک ہیلی کاپٹر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اردگرد کئی رہائشی خیمے نصب تھے۔ وہاں کام کرنے والے کارکن اور افسر زیادہ تر عربی زبان میں آپس میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک لفظ جو امریکن سینٹر میں سنا جا رہا تھا، وہ تھا ”ناران سماء“۔

اب امریکیوں کو یقین ہو چکا تھا کہ روسی ایٹم بموں کے ایک درجن سوٹ کیس پی آئی اے کی (PIA) کی ایک چارٹرڈ فلائٹ سے کراچی سے جیش محمد نے مراکش کے ایک غیر معروف ائر پورٹ موغادور پر منتقل کئے تھے جہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے 460 میل دور جنوب مغرب میں واقع لا پالما تک پہنچا دیئے گئے تھے اور یہ عمل جمعہ اور ہفتے کی رات کو مکمل ہوا تھا۔

امریکن جاسوسی کے مرکز میں سیٹلائٹ کے ذریعے لا پالما پر جاری تمام سرگرمیوں کی بڑی واضح تصاویر اور آوازیں تو پہنچ رہی تھیں لیکن عربی میں ہونے والی گفتگو کا ترجمہ اور تجزیہ کرنے والا کوئی ماہر زباندان موجود نہ تھا چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے عربی اور اردو زبان کے ماہر ڈاکٹر فہد النعیمی کی خدمات حاصل کی تھیں جس کا تعلق لبنان سے تھا۔ عربی اس کی مادری زبان اور اردو کی تعلیم اس نے ”اردو یونیورسٹی“ کراچی سے حاصل کی تھی۔

عربی زبان میں ہونے والی گفتگو میں چند الفاظ کی تکرار بار بار سننے میں آ رہی تھی۔ عذاب الٰہی، جہنم کی آگ، طوفانِ نوح۔

امریکیوں نے اندازہ لگا لیا کہ ”لا پالما“ پر آتش فشانی غاروں کے اندر کھدائی کا مقصد انتہائی گہرائی میں نصب کر کے روسی ایٹم بموں کا بیک وقت دھماکا کرنا تھا جس کے نتیجے میں پورے جزیرے کی پہاڑیاں سمندر میں جا گریں اور ان سے ایسا ”میگا سونامی“ (عظیم سمندری طوفان) جو بحر ہند میں 2004ء میں آنے والے ”سونامی“ سے سو گنا طاقتور ہو اور جس کی لہریں کئی سو میٹر بلند، آواز کی رفتار سے تیز تیز، امریکہ کی مشرقی ریستوں بشمول نیویارک، واشنگٹن کو نیست و نابود کرتی ہوئی برازیل کے ساحلوں تک تباہی مچا تیں اور

WWW.URDUBOOKS.NET

جیش محمد نامی تنظیم اسے ''غضب الٰہی'' قرار دے کر اسلامی اتحاد کے لئے بطور پروپیگنڈہ استعمال کر سکے۔

آپریشن فائر سٹارم

جب انٹیلی جنس ذرائع سے امریکہ کو یقین ہو گیا کہ خطرہ واقعی حقیقی اور فوری ہے تو امریکہ کی دفاعی کونسل جس میں تینوں مسلح افواج، بری، بحری اور فضائیہ کے سربراہ، تمام جاسوسی اداروں کے افسران کے مشترکہ مشورے سے امریکی صدر نے سپین کے جزیرے لاپالما پر فوری حملے کا حکم دے دیا جسے ''آپریشن فائر سٹارم'' کا خفیہ نام دیا گیا۔

علاقے سے قریب ترین 640 سمندری میل دور، امریکن بحریہ کا طیارہ بردار جہاز ''کان ٹائن'' بحر اوقیانوس میں گشت کر رہا تھا۔ بحریہ کے ہیڈ کوارٹر سے اسے حکم ملا کہ وہ اپنا رخ سپین کی طرف موڑ دے اور اپنے بمبار طیاروں کے ذریعے اگلے چھ گھنٹے میں کناری آئی لینڈ کے جزیرے لاپالما کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

لاپالما کے بارہ سرنگوں کی تہہ میں روس سے چوری کئے گئے ایٹم بم نصب کئے جا چکے تھے۔ بیک وقت دھماکہ کرنے کے لئے بجلی کی تاروں کے لئے انہیں آپس میں منسلک کرنا ڈیٹونیٹر لگانا اور دور کے کسی جزیرے میں بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبانا باقی تھا، جس کے لئے 24 گھنٹے کی مدت درکار تھی۔

جیکال یعنی ابراہیم حسین اظہر قیمر دیجا نامی سرنگ میں اپنا بارہواں ایٹمی ہتھیار دھماکے کے لئے تیار کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اسے پہاڑ کی چوٹی پر دھماکوں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بڑے بڑے دیوہیکل پتھر سرنگ کے اندر گرنے شروع ہو گئے۔ جیکال فوراً سمجھ گیا کہ دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ بارہویں بم کا ریموٹ کنٹرول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ٹرپل (AAA) کے دو سیل ریموٹ کنٹرول میں ابھی تک اس خدشے کے پیش نظر نہیں ڈالے تھے کہ کہیں غلطی سے بٹن نہ دب جائے۔ اب جب اس نے حقیقی خطرے کو سر پر دیکھا تو جیب سے دو بیٹری سیل نکالے اور ریموٹ کنٹرول میں ڈال کر بٹن دبا دیا۔

فضا سے پہاڑ کی چوٹی پر بم برسانے والے دو طیاروں کے پائلٹوں نے دیکھا کہ پہاڑی چٹانیں برق رفتاری سے آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ سنبھل سکتے، بڑی بڑی چٹانوں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ انہی چٹانوں کے ساتھ لڑھکنیاں کھاتے ہوئے سمندر میں جا گرے۔ صرف ایک ڈیڑھ ٹن کے ایٹمی دھماکے نے پورے پہاڑ کو اکھاڑ کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔ باقی 11 ایٹم بم اپنی سرنگوں میں ہی، اپنے لگانے والوں کے ساتھ دفن ہو کر رہ گئے۔

امریکیوں نے لاپالما پر وہ ''ڈیزی کٹر'' بم استعمال کئے تھے جن کا تجربہ وہ قبل ازیں افغانستان میں ''تورا بورا'' کے پہاڑوں میں کر چکے تھے اور جو پہاڑوں کو چیر کر گہرائی تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اس ایک ایٹمی دھماکے نتیجے میں جو سمندری لہریں اٹھیں ان کی بلندی 150 فٹ تھی لیکن امریکہ کے مشرقی ساحل تک پہنچتے پہنچتے دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی اور امریکی حکومت نے اپنی پبلک کو مطمئن رکھنے کے لئے اسے سمندری ''جوار بھاٹا'' کا نتیجہ قرار دیا تھا۔

(بنیادی خیال سٹیفن کونٹ اور ولیم کیتھ کی کتاب ''ڈیپ بلیک ڈیتھ ویو'' سے ماخوذ)

❀❀❀

طب و صحت

دست شفاء

SKIN DISEASE کا علاج

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)

0321-7612717

ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)، ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب،

ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن، شعبہ طب و نفسیات

بہت سے قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ دو ماہ سے ڈاکٹر صاحب کا کوئی کیس نہیں آ رہا اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا کیس ختم ہو گئے ہیں۔ جناب! ایسی کوئی بات نہیں، ہر کیس پہلے کیسوں سے بڑھ کر مشکل آتا ہے لیکن کئی لوگ اس کے انجام کی اطلاع ہی نہیں دیتے اور ہمیں اس وقت پتا چلتا ہے جب کوئی ایسی مرض کا نیا مریض آ کر بتاتا ہے کہ جی اتنے ماہ قبل آپ نے فلاں فلاں مریض کا علاج کیا تھا، اس نے ہمیں بھیجا ہے آپ کے پاس۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم تو مریضوں کا فون آنے پر بلا تاخیر ان کو دوائیاں بھیج دیتے ہیں اور پھر اس خیال میں ہوتے ہیں کہ جلد اس کی رقم وصول ہو جائے گی کیونکہ ہمارے ذرائع آمدن بہت محدود ہیں اور ہم مریضوں کی ہمدردی میں زیادہ تقاضا نہیں کرتے مگر انتہائی پریشان کن بات یہ ہے کہ وہ لوگ بعد میں یا تو سستی کی بناء پر یا کسی دوسری وجوہات کی بدولت تنگ کرنے لگ جاتے ہیں۔ کئی بار یاددہانی کرانی پڑتی ہے اور کئی بار تو ہمارا خرچہ بھی ادویات کی قیمت کے برابر ہی ہو جاتا ہے اور جو وقت ہم نے اگلی تحقیق میں لگانا ہوتا ہے وہ بھی برباد ہو جاتا ہے۔

کئی لوگ ایک ایک بات کے لئے بار بار فون یا MSG کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ فارم میں ساری ہدایات واضح طور پر لکھی ہوتی ہیں۔ اپنی قوم کی ادائیں دیکھ کر اتنا دل کڑھتا ہے اور کئی بار دل میں آتی ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر بیرون ملک چلا جاؤں۔ بعض عقل مند تو صرف Miss Bell ہی کرتے رہتے ہیں کیا میں اتنا فارغ ہوں یا میرے پاس قارون کا خزانہ ہے کہ ان کو کال کروں۔ ایسے کئی مسئلے ہیں جو کہ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ اپنا ہمدردانہ رویہ بدل کر دوسرے ڈاکٹروں کی طرح قصاب بن جائیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

تیسری بات یہ ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ ہمیں سپانسر نہیں کر رہا اور نہ ہی ہماری مثبت تجاویز کا مناسب جواب دے رہا ہے۔ حالانکہ ہم نے اس بارے میں ایک دو بار اشتہار بھی دیا تھا کہ اگر دوسرے علاقوں کے لوگ سہولت چاہتے ہیں تو ہم وہاں پر وزٹ رکھ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ان کی مرضی ہے کہ ان کو یہاں سہولت ہے یا بار بار خرچہ کرنا چاہتے ہیں۔

اب ہم اس ماہ کے کیس کی طرف آتے ہیں۔ یہ کیس اسلام آباد کے ایک سرکاری آفیسر کا ہے جو کہ بچپن سے ہی کسی Skin Disease کا شکار تھا۔ جسم پر،

WWW.URDUSOFTBOOKS.NET

بغلوں میں، رانوں میں بڑے بڑے پھوڑے نکلتے رہتے تھے جس کی وجہ سے کپڑے اکثر خراب رہتے۔ بعد میں ان میں بدبودار مواد بھرتا اور یہ بدنما بن جاتے اور جسم پر نشانات بھی پڑتے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔ نہ صرف مریض بلکہ اس کے گھر والے بھی بہت صفائی پسند تھے مگر مرض ایسا ڈھیٹ تھا کہ کئی علاج معالجے کئے گئے مگر اتنے ایکسپرٹ حکیموں، ڈاکٹروں اور ہومیو پیتھکوں کی کوششوں کے ٹھیک ہونے میں نہ آتا ہے۔ جس کے پاس بھی جاتے، رنگ برنگی ادویات، ٹوٹکے، مرہمیں ہی ملتیں اور خرچہ تو خیر ہوتا ہی ہے۔ کئی ایک اکسیری نسخے بھی آزمائے گئے۔ کئی سرکاری ڈاکٹروں نے بھی مغز ماری کی مگر نتیجہ صفر۔ اتنے لمبے عرصے میں نوجوان مریض بڑا ہو کر پڑھ لکھ کر سرکاری افسر بھی بن چکا تھا۔

ایک دو بار انہوں نے ہمارے شعبہ کے بارے میں پڑھا مگر دل کو تسلی نہ ہوتی تھی۔ پھر انہی کے خاندان کے ایک دو مریض بھی شفایاب ہوئے تب کہیں جا کر اس مایوس افسر نے علاج کی ہامی بھری۔ کیس کی تفصیلات لی گئیں۔ جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:

1- پسینہ سخت بدبودار آتا تھا حتیٰ کہ بنیان اور انڈرویئر بھی رنگے جاتے تھے۔
2- بار بار نہانے کے باوجود جسم گندہ ہی رہتا۔
3- مرض میں کئی بار گندے اور تخریبی خیالات بھی آتے۔
4- اگرچہ دوسروں کے ساتھ رویہ نرم تھا مگر مریض اندر سے سخت مزاج اور بے حد چڑچڑا ہو چکا تھا۔
5- یادداشت اور نیند بھی خراب سے خراب تر ہو چکے تھے۔
6- مریض بے حد صفائی پسند اور نفیس عادات کا مالک تھا۔

مندرجہ بالا علامات اور حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے درج ذیل ادویات تجویز کی گئیں:

1. ADIS 12 3 Time a day.
2. Psorinum 30 2 Time a day.
3. Kali Iodatum 3 Time a day.
4. Syphlenium 12 3 Time a day.
5. Kali Phos. 12 3 Time a day.

اس کے علاوہ کچھ کھانے پینے کے پرہیز بھی بتائے گئے۔ مثلاً کچی پیاز، ادرک، سافٹ ڈرنک، گوشت ہر قسم بند کر دیے گئے۔

اللہ کی قدرت دیکھئے کہ دو ہفتوں کے بعد ہی نہایت اچھے رزلٹ سامنے آنے لگے اور ایک ماہ میں خاصا فائدہ سامنے آ گیا۔ تقریباً 2½ ماہ کے علاج سے مریض کے تمام مسائل ختم ہو چکے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف ہوئی ہی نہ تھی۔ ذہنی مسائل بھی بڑے اچھے طریقے سے ٹھیک ہو چکے تھے اور پھر انہوں نے (نام کے بغیر) کیس شائع کرنے کی اجازت دے دی۔

اس سے ملتا جلتا ایک اور کیس بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ کیس لاہور کے ایک نوجوان کا ہے اس کے چہرے پر اکثر دانے اور کیل نکلا کرتے تھے اور ایک کیل تو ایسا تھا کہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ یوں لگتا تھا کہ اس نے خود ہی پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہوا ہے۔ ایک دن میں نے پوچھا تو وہ بیچارہ رونے پر آ گیا اور پھر اپنی بپتا سنائی کہ کس طرح بہت سے علاج معالجوں اور بڑے بڑے دعوے داروں کے علاج کے بعد بھی حالات دگرگوں ہیں۔ میں نے اس کی پوری رپورٹ لی اور اللہ کا نام لے کر علاج شروع کر دیا ہے۔ تقریباً اوپر والی ہی ادویات تھیں اور پرہیز بھی ویسا ہی۔ البتہ کریمیں اور دیگر ادویات بالکل روک دی گئیں۔ تقریباً دو ماہ کے علاج نے ہی 85% سے زیادہ فائدہ کر دیا۔

❁❁❁

افسانہ

سالِ نو

تاریخوں کے بدلنے سے کبھی تقدیریں بھی بدلی ہیں!
یہ تو سائے کی طرح ساتھ ساتھ گھسٹتی جاتی ہیں۔

☆ رحمیٰ شاہد

بس اونچے نیچے رستوں پر برق رفتاری سے رواں دواں تھی۔ یہ سفر بھی عجیب چیز ہے آگے بڑھتے بڑھتے ہمیشہ پیچھے کی یاد دلاتا ہے۔ انسان کو اس کی اوقات یاد دلاتا ہے۔ سفر کی اپنی ہی دنیا ہوتی ہے جس کے مکین منزلوں کے متعین کردہ راستوں کو خود پر جھیلتے ہوئے چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ سفر لمبا ہو تو راستے کے پڑاؤ بڑا ساتھ دیتے ہیں۔ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہوئے تازہ دم کر دیتے ہیں۔

پچھلے برس بھی اپنی نوکری کے سلسلے میں مَیں انہی راستوں سے گزری تھی ظاہری ہیئت کے علاوہ نہ مجھ میں کچھ بدلا نہ ان راستوں میں۔ خبر نہ تھی کہ اس سال بھی انہی سوچوں سے جوتی اور انہی ضرورتوں سے لڑتی ان راستوں سے گزروں گی۔ نئے سال کا آغاز ہوا تھا۔ ہر کوئی اس خوشی کو اپنے رنگ اور انداز سے منایا کرتا ہے۔ سو میرے آفس کے ساتھیوں نے بھی تفریح کی سوچی یہ سفر اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

ہاں تو بات سفر کے پڑاؤ کی ہو رہی تھی، ہر کسی نے اپنے اپنے مزاج کے پڑاؤ کی بات کی۔ آخر اتفاق رائے سے اس پڑاؤ پر رکنے کی بات طے پائی جس پر گزشتہ برس ٹھہرے تھے۔ سب تازہ دم ہونے اپنے اپنے ٹھکانوں کی اور بڑھ گئے۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور میں بھی ایک ڈھابے پر جا پہنچی۔ تندور پر موجود عورت مجھے دیکھ کر اتنی خوش دلی سے مسکرائی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مسکراہٹ گاہک اور دکاندار کے باہمی رشتے کی ڈور سے ہرگز نہیں بندھی لیکن میں پہچان کی حدوں سے ابھی دور ہی کھڑی تھی۔

بھوک مٹی تو ذہن کے دریچوں سے روشنی اور روشنائی کی لہریں ابھریں مجھے یاد آیا کہ پچھلے برس بھی اسی ڈھابے پر اس عورت سے ملاقات ہوئی تھی۔ 25، 26 سال کی جواں سال عورت چہرے کی فکروں سے 50 سال کی لگتی تھی۔ مجبوریوں نے سالہا سال میں بس اس کے چہرے کو ہی ٹھکانہ بنایا تھا۔ وہ چھوٹے سے چبوترے پر بنا تندور سامنے بنے شیلف پہ رکھے برتن، مٹی کے چولہے پر دھری ہانڈی اور رنگ برنگے پرانے پردے کے پیچھے دھرے لکڑی کے گھسے پھٹے ڈیسک۔ تندور کے سامنے بیٹھی بشیراں بی بی اور اس کے پاس کھیلتے تین چار بچے بشیراں کے پاس بیٹھا ایک سال کا بچہ۔ ہاں یاد آیا کہ گزشتہ برس بھی ایسا ہی منظر تھا۔ بس پس منظر سے یہ بچہ اب منظر عام پہ آ چکا تھا۔ گویا یہ تبدیلی آئی تھی مگر بشیراں کی حالت تو وہی تھی تو کیا مزید؟

میں نے بشیراں سے از راہ مذاق پوچھا اس سال کیا بنا ہے؟ ہر جگہ نئے نئے کی رٹ لگی ہے مگر میرا یہ سوال اس کے درد کی ہر گرہ کو کھولتا چلا گیا۔

"کیا بدلنا ہے باجی! تاریخوں کے بدلنے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

کبھی تقدیریں بھی بدلی ہیں؟ یہ تو سائے کی طرح ساتھ ساتھ گھسٹتی جاتی ہیں۔ یہ سالوں کا ہیر پھیر تو وقت کی دھوکے بازی ہے۔ یہ انسانوں کو خود میں ہی الجھائے رکھنے کے لئے ہے۔ بتائیں ناں باجی نیا سال آیا ہے تو کیا بدلا ہے؟ کیا روٹی کی تمک و دو سمٹ گئی ہے؟ تکلیفوں کے سائے ٹل گئے ہیں؟ ناانصافی ختم ہو گئی ہے؟ کچھ نیا ہوا ہے تو ٹھیک ہے ہمیں بھی بھی مبارک دو۔ ہم بھی خیر مبارک کہہ کر اپنی ہی قبروں پہ دھمال ڈال لیتے ہیں"۔

یہ عام سی عورت جو معمولی سی جگہ پہ بیٹھی تھی، اس کی زبان سے یہ بڑی بڑی باتیں سن کر میں حیران رہ گئی۔ اپنی نیو ایئر پارٹی اور رنگ و سرور کی محفلیں سب پھیکی پڑ گئیں واقعی کیا نیا تھا جس کے آنے کی خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔

عمر کی دیوار میں وقت نے ایک سال اور جڑ دیا تھا۔ بالوں میں چاندی کے کچھ اور تار چمک اٹھے تھے جن کو چھپا چھپا کے ادھ موئے ہوئے جا رہے تھے۔ ذمہ داریوں کے جال گہرے سے گہرے ترین ہوتے جا رہے تھے۔ معاش کی فکر نے دن اور رات کا تصور دھندلا دیا تھا گویا خوشی کے یہ پل سالہا سال کی محنت اور ریاضت کا ثمر تھے۔

سہنے والے سے بڑا تجربہ کار اور لکھاری کوئی نہیں ہوتا۔ باقی تو سب تماش بین ہوتے ہیں جو اپنی غرض کی پوٹلی سے اپنے مطلب کے کھلونے نکال نکال کر دوسروں کا دل بہلاتے ہیں اور انہیں دھوکہ دے کر خوش ہوتے ہیں۔

بشیراں کے لہجے کی سنجیدگی اگرچہ اس کی غرض کی ڈور سے بندھی تھی۔ یہ ڈور مضبوط سہی مگر انمول نہ تھی۔ گزشتہ سال کی طرح میں نے کچھ رقم بشیراں کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی جسے اس نے بلا حیل و حجت رکھ لیا۔ کبھی کبھی خودداری ضرورت کے سامنے روتی رہ جاتی ہے اور ضرورت خودداری کے سامنے اتنے زور زور سے ہنستی ہے کہ خودداری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ میں چپ چاپ وہاں سے لوٹ آئی، یہ غریب لوگ اور ان کی مجبوریاں۔

آفس سے لوٹتے لوٹتے ایک ہفتہ لگ گیا۔ واپسی کا سفر جہاں سکون آور ہوتا ہے وہیں پیچھے رہ جانے والا وقتی سکون اور آنے والی ذمہ داریاں اور الجھنیں فکر میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ بچوں سے ملنے کی طلب اور گھر کی فکر نے ذہن و دل میں عجیب ہلچل مچا رکھی تھی۔ گھر پہنچتے ہی یہ تشنگی حلاوت میں بدل گئی۔ یہ ذریعہ معاش بھی عجیب چیز ہے۔ یہ تنگی کو دور کرتی ہے اور رشتوں کو کبھی کبھی تنگ کر دیتی ہے۔

بچوں سے ملنے اور گھر کو دیکھنے کے بعد رات کو نیو ایئر پارٹی رکھی آخر یہ میری اپنی فیملی کے ساتھ سال کی پہلی پارٹی تھی۔ 'صاحب' کا انتظار کرتے کرتے بچے تو سو گئے مگر نیند میری آنکھوں سے ابھی دور تھی۔ رات گئے صاحب لوٹے تو روح میں خوشی کی ایک رمق ابھری مگر وہاں ایک جامد خاموشی تھی۔ "فرصت مل گئی تمہیں اپنی عیاشیوں سے جو گھر کی یاد آئی"۔

کوٹ اور بیگ پھینکا اور اندر چلے گئے۔ مجھے بشیراں کی بات یاد آئی۔ تاریخوں کے بدلنے سے قسمتیں نہیں بدلا کرتیں۔ میں جسے غریب لوگوں کے مسائل اور دوسروں کی الجھنیں، کہا کرتی تھی دراصل وہ تو انسانی ذات کے مسائل تھے اور وہ ذات امیری و غریبی کے ہر فرق سے آزاد تھی۔

کبھی تاریخوں سے پہلے قسمتیں مہرباں ہوئیں تو یقین جل پری کے حسن اسرار سے خود کو چھڑا کر کہے گا۔

نوید نو......سال نو!

❀❀❀

اندھیرے سے اُجالے تک

اشکِ ندامت

"اس ایک بجی سی عمر والے کے فلسفے کو کوئی نہ سمجھا۔ جب اس کے کمرے سے لاش نکلی، خطوط نکلے تو لوگ سمجھے"۔

☆ رمیز احمد
0331-5178929

آخری قسط

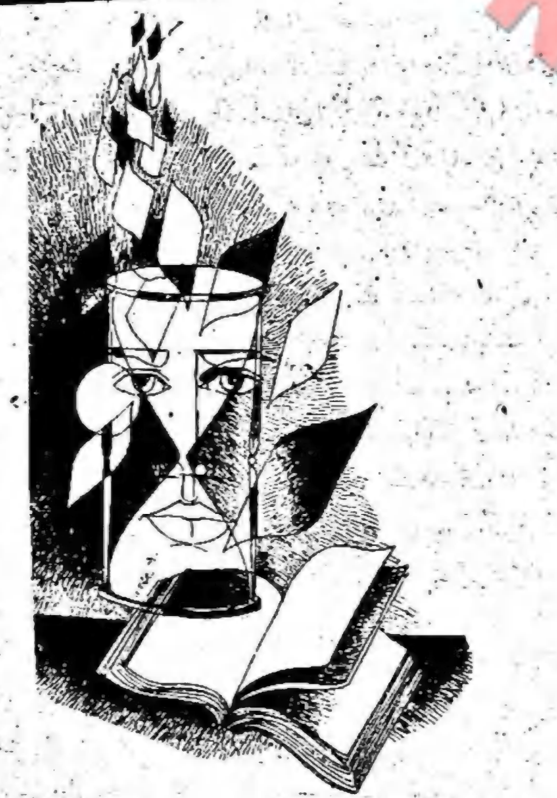

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

صوفی

جاذب اب مکمل طور پر معراج بابا کی جگہ لے چکا تھا۔ وہ اب تقریباً روزانہ درس دیتا تھا۔ لوگ اب اس کے لئے خاص طور پر سوال اکٹھے کر کے لاتے تھے۔ جاذب کو بھی اب اس کام میں مزہ آتا تھا۔ اسے ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات مل جاتی۔ وہ اب اس جگہ کو بالکل اپنے گھر کی طرح محسوس کرتا تھا۔

انسان کی یہ رَچ بس جانے کی عادت ہمیشہ اسے کامیاب کرتی آئی ہے۔ آج بہت خوش گوار رات تھی۔ عشاء کے بعد وہ سویا اور رات کے پچھلے پہر جاگا۔ جاذب کے چہرے پر اب باقاعدہ ایک رعب آ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خوب صورت داڑھی تھی۔ سفید شلوار اور ہلکی سی کالی چادر کندھوں پر ڈالے وہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اور سن کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ انسان عمر سے نہیں، تجربہ سے بڑا ہوتا ہے۔

سردیاں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ آج وہ اپنے آپ کو بہت آزاد محسوس کر رہا تھا۔ وہاں جو لوگ آتے تھے، جاذب کی ان سے خوب جان پہچان ہو چکی تھی۔ وہ سب اب اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

چہرے پر مسکراہٹ سجائے وہ لوگوں کے درمیان جا بیٹھا جو اس کے آنے سے پہلے ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے۔ اس نے آتے ہی اونچی آواز میں سلام کیا۔ سب نے ذوق سے جواب دیا۔ پھر جاذب نے سب کا حال احوال دریافت کیا۔ اس نے کچھ دیر غریبوں کی کفالت پر بات کی، پھر کہنے لگا۔

''میں ایک روز ہسپتال میں تھا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ کے گرد کچھ لوگ جمع ہیں۔ قریب پہنچا تو پتا چلا کہ وہ بزرگ آخری سانسیں لے رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کو قریب بلایا اور کہا کہ یہ تمہاری دو بہنیں اب تمہاری ذمہ داری ہیں۔ ان کی شادی بھی تمہیں ہی کرنی ہے اور ان کی زندگی کا ہر مسئلہ اب تمہیں ہی حل کرنا ہے۔ اس نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور اسے بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں سچائی کے آنسو تھے۔

اتنے میں بزرگ نے اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔ اپنے باپ کی آنکھیں بند کرتے ہی وہ باپ کا وارث اُٹھا اور اپنی روتی ہوئی بہنوں کو گلے لگا لیا۔ اس کی آنکھ میں پڑھا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی باپ کی آخری خواہش سے رُوگردانی نہیں کرے گا۔ مجھے اس کی Determination بہت اچھی لگی۔

مجھے اس واقعہ سے وہ ذات یاد آئی جسے اپنے والدین اور اولاد سے زیادہ چاہے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔ جب ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحلت کا وقت قریب تھا، انہوں نے بھی تو ایک پیغام دیا تھا کہ نماز کبھی نہ چھوڑنا اور میری اُمت کے غریبوں کی مدد کرتے رہنا۔ کیا ہم ان دونوں چیزوں کو اسی بزرگ کے وارث کی طرح گلے لگائے ہوئے ہیں......؟ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے کرتے رہنا چاہئے۔''

وہ کچھ باتیں سمجھانے کے بعد اب خاموش تھا اور سوالات کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک آدمی نے سوال کیا۔

''ہمارے ہاں اتنے علماء ہیں، وہ ہمیں سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر پیغام ہم تک پہنچا دیتے ہیں تو صوفیاء کی کیا ضرورت ہے......؟''

جاذب نے اس آدمی کو غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی، پر وہ کوئی نیا آدمی تھا۔ جاذب تعارف پوچھے بغیر جواب کی طرف آیا۔

''دیکھئے، جس طرح انسان کا ایک ظاہر ہوتا

ہے اور ایک باطن، اسی طرح عمل کا بھی ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ مثال کے طور پر ہماری نماز میں 2 سنت اور 2 فرض ہیں۔ اس میں ہم سجدہ کر رہے ہیں اور رکوع کر رہے ہیں۔ یہ ہماری نماز کا ظاہر ہیں۔ ہماری نماز میں یکسوئی ہونی چاہئے۔ ہمیں نماز کے دوران نفس پر قابو رکھنا ہے۔ دکھاوے کے لئے نماز نہیں پڑھنی۔ یہ سب چیزیں ہماری نماز کا باطن ہیں۔ اب اللہ نے ظاہر کو سدھارنے کی ذمہ داری علماء کو دی ہے اور باطن کو سدھارنے کی ذمہ داری صوفیاء کے لئے ہے۔ وہ اس کو نظر کے فیض سے سدھارتے ہیں۔

اب جس طرح ظاہر اور باطن کی اہمیت اپنی اپنی جگہ ہے، اسی طرح عالم اور صوفی کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ بلکہ میرے خیال میں باطن کی اہمیت زیادہ ہے۔ اگر کسی عمل کے ظاہر میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کی قبولیت کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ لیکن اگر اس کے باطن میں کوئی خامی ہو تو قبولیت کا کوئی امکان نہیں رہتا، اور اس بات کے بھی امکانات زیادہ ہیں کہ ہر صوفی عالم ہو اور اس بات کے امکانات کم ہیں کہ ہر عالم صوفی ہو۔''

وہ الفاظ کے پیچ وخم میں سوال کرنے والے کو اُلجھانا نہیں چاہتا تھا، اس لئے اپنی بات کو روک کر اس کے اگلے سوال کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن شاید وہ جواب سے مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ جواب سنتے ہی اُٹھا اور چلا گیا۔ شاید وہ بس ایک سوال ہی کرنے آیا تھا۔ جاذب کو کچھ عجیب لگا۔

اتنے میں ایک لڑکے کی آواز آئی۔ کچھ اُلجھن تھی اس آواز میں۔ وہ عمر کے حساب سے کافی چھوٹا تھا۔

''بھائی جان......! اگر ہمیں اللہ کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے تو اللہ کی ظاہری شکل کیوں نہیں ہے......؟ میں اس کو تلاش کرنا چاہتا ہوں، وہ چھپا ہوا کیوں ہے......؟ وہ سارے پردے ہٹا کیوں نہیں دیتا......؟ جب اس جیسا اور کوئی موجود نہیں تو اسے سامنے آجانا چاہئے ناں......؟''

جاذب کو اس بچے کی آنکھوں میں تڑپ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ اس نے اس کی معصوم باتوں پر مسکرا کر جواب دینا شروع کیا۔

''بیٹا......! دیکھو، اگر اللہ سامنے آجائے تو کسی انسان کے پاس اس کو ماننے کے علاوہ کوئی چوائس ہی نہیں بچے گی۔ لیکن ہمیں چوائس دے کے ہی تو آزمایا گیا ہے۔ اللہ نے پردے ڈالے تاکہ جستجو پیدا ہو اور جس میں جس قدر تڑپ ہو، وہ اسی قدر محنت کرے اور اللہ محنت کے حساب سے پردے ہٹاتا جائے۔ اگر اس نور کی زیارت ہو جائے تو منکر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

دیکھو، تمہارے سکول میں امتحان ہوتا ہے۔ اگر امتحان کے دوران پرچہ حل کر کے تمہارے سامنے رکھ دیا جائے تو امتحان کے تو معنی ہی ختم ہو جائیں گے ناں......! ابھی ہمیں بس اپنے اندر تڑپ پیدا کرنی ہے۔ جس حد تک سکت ہے، اس حد تک اپنے پرچے کو حل کرنا ہے، اور آخرت میں حل شدہ پرچہ سامنے آئے گا۔ پھر ہمارے پرچے کو اس سے میچ کیا جائے گا۔ جس کا جس حد تک مشابہت رکھتا ہوا، اسے اس حساب سے اس کا مقام دے دیا جائے گا۔''

پھر کسی نے سوال کیا۔

''تو کیا صرف یہی ایک مقصد ہے زندگی کا......؟ باقی اسلام کچھ نہیں......؟''

جاذب نے گہرا سانس لیا۔

''یہ اتنی سادہ چیز نہیں ہے۔ اللہ کو تلاش کرنے کے لئے اس کا دین ہی تو ضابطہ ہے، پر فرق اتنا آتا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

ہے کہ بندہ فرض سمجھ کر کرے تو مجبوری لگتا ہے اور اگر عشق میں کرے تو مزہ آتا ہے۔ فائدہ تو ہمارا اپنا ہی ہے۔ دُنیا بھی آسان، آخرت بھی آسان۔"

پھر ایک آدمی نے لب کشائی کی۔

"ہم اپنی سوچ اور خیال میں کیسے پاکیزگی لائیں.....؟"

جاذب نے چند لمحے سوچا اور کہنے لگا۔

"صفائی کو میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصف ایمان کہا ہے۔ اپنے آس پاس خوب صفائی رکھا کرو۔ خیال پاکیزہ ہونے لگ جائے گا۔"

وہ آدمی پھر بولا۔

"آس پاس کی صفائی سے خیال اور نفس کی صفائی کا کیا تعلق.....؟"

جاذب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ عاجزی سے محروم تھیں۔

"شیطان کا صفائی میں دم گھٹتا ہے۔ وہ تمہارے نفس کو کمزور کرنے نہ آئے تو تمہیں اپنے خیال پر قابو رکھنا آسان ہوگا۔"

"یہ بات تو تھی سمجھانے کے لئے، پر جہاں میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات آجائے تو وہاں عقل کو کچھ دیر ایک طرف رکھ کر عمل کا دامن تھامنا چاہیئے۔ عقل کو خود ہی بعد میں دلائل مل جائیں گے۔"

ایک آدمی نے کچھ لوگوں کے درمیان سے جھانکا۔ جاذب کو کچھ محسوس ہوا لیکن وہ اپنی محسوسات کو سمجھ نہ پایا۔ وہ آدمی بولا۔

"جناب.....! بہت خوش حال تھا میں۔ اب تنگ دستی دروازہ نہیں چھوڑتی۔"

وہ آدمی کچھ اور بول رہا تھا، جاذب کچھ اور سن رہا تھا۔ وہ اپنے کان واپس لگاتا تو حسیات اجازت نہ دیتی۔ جتنی بات اس کے پلّے پڑی، اس نے اس کا جواب دماغ میں ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ ابھی مصروف ہی تھا کہ اس کی زبان نے اس کی اجازت کے بغیر ہی چلنا شروع کردیا۔

"آپ مجھے اس محفل کے بعد اکیلے میں ملئے گا۔"

وہ یہ کیا کہہ رہا تھا.....؟ اس کو اس آدمی سے کوئی کام نہیں تھا، وہ تو اس کو جانتا بھی نہیں تھا، اور اس کی زبان نے اپنی مرضی کب سے شروع کردی.....؟

وہ آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

ایک اور سوال آیا۔

"خاندانوں کے فسادات کا کوئی حل تو بتا دیجئے۔"

جاذب حیران تھا کہ واپس آنے اور سوچنے میں صرف چند لمحے لگے۔

"زبان..... زبان کی مٹھاس، ہمارے سارے فسادات ہماری زبان درازی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کو قابو میں رکھو تو مسائل شروع نہیں ہوں گے، اور جو شروع ہو چکے ہیں، انہیں کبھی بندوق سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح صرف بڑھایا جا سکتا ہے۔ جس نے مسئلہ شروع کیا ہے، سدھارے گا بھی وہی۔ زبان کو ہی جیسے پہلے استعمال کیا تھا، اس کے مخالف انداز میں استعمال کرو۔ ان شاء اللہ.....! مسئلہ حل ہو جائے گا، اور یاد رکھنا، جو خود ناانصافی کا شکار ہوتے ہوئے بھی معافی اور مصلحت کا رستہ اپنائے تو اس کے لئے خوب درجات کا وعدہ ہے۔"

اسی طرح سوالات کا سلسلہ چلتا رہا۔ آج اس کا مشکل باتیں کرنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ فجر کا وقت ہونے والا تھا۔ وہ سب کو بتا رہا تھا کہ ہم اس وقت اس لئے اکٹھے ہوتے ہیں کیونکہ یہ قبولیت کا وقت ہوتا ہے اور ہمیں اس کی راہ میں قبول کرلیا جائے، اس کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ محفل ختم ہوئی تو وہ شخص جس کو جاذب نے رُکنے کا کہا تھا، وہ قریب آیا۔ جاذب کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بولے کہ اس کی زبان خود ہی چلنے لگی۔

"زبانی صاحب.....! مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ مہمان اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ برا سلوک کرنے کا مطلب اللہ کی رحمت کو جھٹلانا ہے، اور ہم انسان کیا جانیں کہ کون اللہ کے کتنا قریب ہے.....؟ ہو سکتا ہے کہ جس کو گھر سے نکالنے کے منصوبے کئے گئے ہیں، اس کی ایک آہ اللہ کے قہر کو آواز دینے کے لئے کافی ہو۔ بس صدقہ دیں، یہ رزق میں برکت ڈالے گا اور ان کو منا لیں جن کی مہمان نوازی کرنے کی بجائے تذلیل کی ہے۔"

وہ آدمی اپنا نام اور ساری بات سن کر زار و قطار رونے لگا۔ اس نے جاذب کا ہاتھ پکڑ کر چومنا شروع کردیا اور کہنے لگا۔

"آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی تھا کہ میں اپنا قصور بھول چکا تھا۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ مجھے حکم کیجئے، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں.....؟"

جاذب کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ یہ نہیں بولنا چاہتا تھا۔ یہ اس نے کیوں بولا۔ آخر اس نے ہر سوچ کو جھٹکتے ہوئے اس آدمی کی منتظر نظروں کو جواب دیا۔

"بس.....! جب آپ کا ہاتھ کھل جائے تو اپنے محلے میں دیکھیے گا، ایک بہت غریب خاندان ہے، اس کی ماہانہ کفالت شروع کر دیجئے گا۔"

وہ آدمی مشکور ہوتا ہوا واپس چلا گیا۔ جاذب حیرت کا مجسمہ بنا سب دیکھتا رہا۔

فجر پڑھی گئی۔ پھر وہ سب لوگ جن کو وہ اپنے اندر اُترنے کی پریکٹس کراتا تھا، جمع ہو گئے۔ شروع والوں میں سے کچھ چھوڑ چکے تھے اور کچھ نئے آچکے تھے۔ تعداد پہلے دن سے کافی زیادہ تھی۔ اب سب کو تمام اُصول پتا تھے۔ سب لوگ بیٹھ کر شروع کر دیتے جاذب کچھ دیر بعد درمیان میں آکر سمجھانے لگا۔

جاذب کو محسوس ہوا کہ آج وہ یہ سب آخری بار دیکھ رہا ہے۔ اس نے ان بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان چکر لگانا شروع کیا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز میں بھاری پن، رعب اور مٹھاس کا ایک مختلف ذائقہ تھا جو روح تک محسوس ہوتا تھا۔

"اب تم جاگ چکے ہو..... پوچھو اپنے آپ سے..... کہ تم کون ہو.....؟ پہچانو اپنے آپ کو..... کہ پہچاننے کے لئے بنانے والے سے رابطہ بہت ضروری ہے سمجھ لو اس بات کو..... کہ اپنے باطن میں جانے سے پہلے تمہیں وقت کے باطن میں جانا ہوگا..... توڑ دو اس وقت کے حصار کو..... ڈوب جاؤ ایک لمحے کی گہرائی میں..... بڑھا دو اس خزانے کو..... کہ وقت سے بڑا کوئی خزانہ نہیں..... اور خزانہ کبھی بہانے میں اچھا نہیں لگتا..... اپنی ساری حسیات اس سانس پر لگا دو..... اپنے اندر اُتر جاؤ کہ تم کو اسی لئے بنایا گیا ہے..... اس گہرائی میں اُتر جاؤ جو تمہارے ہر سوال کا کامل جواب رکھتی ہے۔

ہاں.....! یہاں پر ہی وہ راز بالکل اسی جگہ پر چھپا ہے..... جو فاش ہوگیا تو سب عیاں ہو جائے گا..... بس تھوڑا سا سفر باقی ہے..... ڈھونڈو اسے، اپنے خون کی اس گردش کو محسوس کرو..... یہ خون جس نے اسی سانس کو جذب کیا ہے..... جس کا تم پیچھا کر رہے تھے..... اپنے خون کے ساتھ سفر کرو..... کہ یہ تمہیں کہاں لے کر جاتا ہے.....؟

www.aiourdubooks.net

ہاں......! یہی...... یہی وہ پردہ ہے...... جس نے سب کچھ چھپا رکھا ہے...... ہٹا دو اسے...... اُٹھا دو اسے...... اضطراب کی ہر شکل کو بھول جاؤ...... لوٹ آؤ حال میں کہ سب کچھ یہاں موجود ہے...... ماضی، مستقبل، یہ دُنیا سب جھوٹے ہیں...... جو مجھے دکھتا نہیں...... بس وہ ہی ایک سچا ہے۔

جاگ جاؤ...... کہ یہ دُنیا ایک خواب ہے...... صرف ایک سراب ہے...... توڑ دو اس خواب کو کہ خواب ٹوٹنے سے پہلے حقیقت ہی معلوم ہوتا ہے...... پر ہم حقیقت کے متلاشی ہیں...... خواب کے نہیں...... جان جاؤ...... کہ تم روح کو تلاش کرنے نکلے ہو...... اسی سے اسی کو مانگو جو تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے...... اور شہ رگ تک تم کو یہ خون لے کر جا سکتا ہے...... اسے محسوس کرو...... کہ یہ کہاں سے گزر رہا ہے......؟ مانگو اس سے کہ ہم دُنیا نہیں مانگتے...... کہہ دو اس سے کہ ہمیں تو مل جا...... ہم تیری مخلوق کے غلام ہو جائیں گے۔"

معراج بابا اس کی باتیں روز بیٹھ کر سنتے تھے۔

جاذب بولتا چلا جا رہا تھا اور معراج بابا سوچ رہے تھے کہ ابھی اس کو تھوڑی سی زندگی دی گئی ہے تو یہ ہر ایک کو پیچھے چھوڑتا جا رہا ہے۔ بلکہ اپنے ساتھ ایک فوج تیار کر رہا ہے۔ اگر اس کی زندگی تھوڑی زیادہ ہوتی تو کیا ہوتا......؟ وہ بس اللہ کی حکمتیں سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ آج جاذب نے مشق کے بعد ایک لڑکے کو بلایا اور کہنے لگا۔

"ناصر بھائی......! کل سے یہ کلاس آپ لیا کریں گے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔"

وہ ایک سلجھا ہوا درمیانے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"جاذب بھائی......! میں کیسے لے سکتا ہوں......؟ آپ ایسا کیجئے، مجھے کام بتایئے۔ میں وہاں آپ کی جگہ کسی اور کو بھیج دیتا ہوں۔ بلکہ آپ حکم کریں، میں خود چلا جاؤں گا۔ مگر آپ کی یہاں ضرورت ہے۔"

جاذب مسکرایا۔

"نہیں ناصر صاحب......! میرے علاوہ وہاں کوئی میری جگہ نہیں جا سکتا۔ جانا بھی ضروری ہے۔"

جاذب نے سب کچھ ناصر کو سونپا اور بابا جی کے پاس آ گیا۔ بابا جی نے اس کے پہنچتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں میاں......! رازِ "اناالحق" فاش کروانے کا ارادہ ہے کیا......؟ بہت گہرائی میں لے گئے ہو تم سب کو۔"

جاذب نے آسمان کی طرف نگاہیں بلند کیں اور کہنے لگا۔

"نہیں بابا جی......! بس جہاں تک لے جا سکتا تھا، لے گیا۔ اب وقت قریب آ گیا ہے، بہت ہی زیادہ قریب۔"

جاذب کی آنکھوں میں کوئی حسرت نہیں تھی، کوئی غم نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی معراج [illegible] کو [illegible] مسکراتی ہوئی آنکھیں چبھ رہی تھیں۔

جاذب اُٹھا اور حجرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ اس نے تکیے کے ساتھ پڑی ہوئی وہ گھڑی اُٹھائی جسے وہ کبھی اپنے سے دُور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کی گہرائی میں جا کر اس نے سیپ کھولنا شروع کئے تو ایک اور موتی نکل کر چمکنے لگا۔

"زینب......! آپ کالج میں اور کسی لڑکے کے ساتھ فالتو بات بھی نہیں کرتیں، اور میرے ساتھ اتنا وقت گزار لیتی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے......؟"

زینب نے کہا تھا۔

"جاذب......! آپ کو یاد ہے جب پہلی دفعہ ہم ملے تھے، اس وقت جب آپ نے چلتے چلتے مجھے سڑک کی سیف سائیڈ پر کر دیا تھا۔ مجھے اس وقت ہی محسوس ہوا تھا کہ جو انسان ایک معمولی سے متوقع خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کر رہا، اور وہ خطرے کا امکان بھی اپنے اوپر لے رہا ہے، تو وہ خود کیسے کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے......؟ اس لئے اس بات کے بعد مجھے آپ کے ساتھ غیر محفوظ ہونا محسوس نہیں ہوتا۔"

جاذب تو اس بات کو کب کا بھول چکا تھا۔ اسے اس دن سمجھ میں آیا تھا کہ صنف نازک کو جیتنے کے لئے کوئی بڑے بڑے قلعے فتح کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اپنی طرح نازک نازک باریکیاں ڈھونڈتی ہیں زندگی میں۔

ہمارے لئے جو بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، ان پر یہ زندگی کی بنیاد رکھ دیتی ہے اور ہم جن چیزوں کو زندگی کا مقصد سمجھ کر بیٹھے ہوتے ہیں، وہ کئی بار ان کے لئے کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔

شجرِ وقت

"انسان دو وجہ سے جھوٹ بولتا ہے۔ ایک خوف یا ڈر اور دوسرا لالچ۔ اگر انسان صرف اللہ سے ڈرے اور اپنا ہر لالچ اللہ سے وابستہ کرے تو وہ جھوٹ سے بچ سکتا ہے۔"

اب جاذب اپنی کتاب کو آخری شکل دے رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ میں آنے والی ہر بات اس میں لکھ چکا تھا۔ آج اس نے دن بھر ہر اُدھورا کام پورا کیا۔ اپنی کتاب کو سامنے رکھ کر مسکراتے ہوئے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اسے اپنے بستر کے پاس رکھ دیا۔

اب وہ باہر کی طرف جا رہا تھا۔ مغرب کی طرف اس نے جو پودے لگائے تھے، وہ اب کچھ حد تک بڑے ہو چکے تھے۔ درگاہ کا وہ حصہ ان پودوں کی وجہ سے سب سے زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس نے ان پودوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں ایک آم کے پودے کو دیکھ کر اسے بچپن یاد آیا۔

وہ گھر سے باہر کوڑا پھینکنے گیا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک ننھا سا آم کا پودا اُگا ہوا تھا۔ اس نے وہ پودا احتیاط سے نکالا اور اسے اپنے صحن کے ایک کونے میں لگا دیا۔ وہ اس سے خوب باتیں کیا کرتا تھا۔ اس کو صبح شام پانی دیتا، اس سے انتہاء کی دوستی ہو گئی۔ وہ سکول جاتا تو بھی اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ ہر نئے پتے کے نکلنے پر اسے اپنا قد بڑا ہونے کے برابر خوشی ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ پودا ہنستا بھی ہے، پریشان بھی ہوتا ہے اور اس کی باتیں بھی سنتا ہے۔

ایک دن جاذب سکول سے واپس آیا تو وہ آم کا پودا گھر کا دروازہ کھلا رہ جانے کی وجہ سے بکری کھا چکی تھی۔ جاذب نے اس کو دیکھا تو رونے لگا۔ اسے اس پودے کی حالت دیکھ کر بہت درد ہو رہا تھا۔ وہ فوراً کلثوم کے پاس گیا۔ ان کو رو رو کر اس نے سارا ماجرا بتایا۔ انہوں نے اس کے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کئے اور بہت ہی پیار سے سمجھایا۔

"بیٹا......! دیکھو، اس سے تمہیں سبق سیکھنا چاہئے کہ کبھی کسی سے اتنی زیادہ فیلنگز اٹیچ نہ کرو کہ اگر وہ چھوڑ جائے تو برداشت ہی نہ کر سکو اور دیکھو، کئی بار چھوڑ کر جانے میں چھوڑنے والے کی مرضی بھی شامل نہیں ہوتی۔ یہ تو اٹل فیصلے ہیں اس کی ذات کے۔"

اسے ایک دم محسوس ہوا کہ وہ آج بھی اس درد کو محسوس کر سکتا ہے۔ ہاں......! بائیں طرف، پسلیوں کے نیچے، گہرائی میں، دل میں......؟ نہیں......! یہ دل سے کچھ نیچے کی جگہ تھی۔ اس کے ہاتھ سے [illegible] چھوٹا۔ اُف......! درد کی شدت، نہیں......! یہ بچپن والے درد سے کچھ زیادہ تھا۔ اسے ایک زور دار جھٹکا لگا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اور اس کے منہ سے خون کی بوچھاڑ نکلی اور سامنے پیپل کے ایک چھوٹے سے پیڑ کے پتوں کو لال کر دیا۔ اس پیپل کے پیڑ کی جڑیں جیسے انتظار میں تھیں، وہ خون جذب کرنے لگیں۔

اسے وہ پیڑ ہنستا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے آنکھیں مکمل کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے دوبارہ وہ مگ اُٹھایا، پانی بھرا اور کلی کرنے کے بعد اس پیڑ کے پتوں کو ایسے دھونے لگا جیسے اس سے معذرت کر رہا ہو۔ اس نے نظر اُٹھائی، سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ سب سمجھتے ہیں کہ میں نے تمہاری طرح غروب ہونا ہے۔ نہ جانے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں نے تمہاری طرح کہیں اور طلوع ہونا ہے......؟"

وہ لال رنگ کے اس چہرے سے باتیں کرتا رہا۔ نماز کا وقت ہوا، نماز ادا کرنے کے بعد جاذب اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے چارپائی چبھی، پھر یادوں کے سمندر میں جوار بھاٹا اُٹھا، جس کا چاند کلثوم ہی تھیں۔

وہ بال کٹوا کر آیا تھا۔ نہانے کے بعد بھی اس کو کپڑوں میں بال چبھ رہے تھے۔ وہ ماں کے پاس آیا اور معمہ بتایا۔ کلثوم نے کہا۔

"جاؤ، اس بار پانی ڈالتے ہوئے اپنے دل میں کلمہ پڑھنا۔ بال تو کچھ بھی نہیں ہوتے، اس کے بعد کوئی گندگی نہیں رہتی انسان پر۔"

مائیں قدرتی سائیکا ٹرسٹ ہوتی ہیں۔ اس دن کے بعد جب بھی وہ کوئی غلطی کر بیٹھتا تو اپنے اوپر خوب پانی ڈالتے ہوئے اپنے دل میں کلمہ پڑھتا تھا۔ اس سے اسے بہت ہلکا محسوس ہوتا اور چبھن ختم ہو جاتی تھی۔ درد ایک بار پھر کروٹ لے کر اُٹھا، پر اب دائیں طرف کیوں......؟ وہ بستر سے اُٹھ کر باہر بھاگا۔ حجرے سے نکلتے ہی اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل بیٹھے ایک اور خون کی اُلٹی آئی۔

معراج بابا سامنے نوافل ادا کر رہے تھے، فوراً بھاگتے ہوئے آئے۔ انہوں نے اسے اُٹھایا اور حجرے میں لے گئے۔ بستر پر بٹھا کر پانی پلاتے ہوئے کہنے لگے۔

"چلو......! ہسپتال چلیں۔"

جاذب نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا جی......! اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں مہلت ختم ہو چکی ہے۔"

معراج بابا نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا اور اس کا موبائل اُٹھا کر فون کرنے لگے۔

"بیٹا......! جاذب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جلدی سے ایمبولینس منگواؤ۔"

موبائل بند کر کے وہ پھر جاذب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بیٹا......! اپنے والدین کو بلا لو۔"

اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔

"مرشد......! آپ جاتے جاتے مجھے حکم عدولی کا مرتکب تو نہ بنائیں۔ بس چند گھڑیاں باقی ہیں، تھوڑا سا انتظار کر لیجیے۔"

جاذب نے معراج بابا کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کو بہت راحت کا احساس ہوا۔

"بابا جی......! آپ وعدہ کیجیے کہ میرے بابا کو بتائیں گے کہ میں ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں نے کبھی ان کی چاہت سے جان بوجھ کر ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ ان کی ہر بات ماننے کی کوشش کی ہے۔ آپ مجھ پر ایک اور احسان کر دیں گے بابا جی......؟"

معراج بابا اپنے آنسو روکتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ جاذب کی آنکھوں میں نہ جانے حسرت کیوں نہیں تھی......؟ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شروع سے اتنا ہی جینا چاہتا تھا۔ اس کو اور کرنا بھی کیا تھا......؟ زندگی کی خواہش مکمل ہو گئی۔ اس نے بہت سے لوگوں کی زندگی سلجھائی۔ اللہ کے قریب بھی رہا۔ دُنیا سے پیار بھی ملا۔

"آپ بابا کو کہہ دیجیے گا کہ وہ وعدہ اس نے میرے کہنے پر توڑا تھا، اور اگر ان کو میری اس کتاب سے اختلاف ہوا تو اسے جلا دیجیے گا۔"

جاذب کو وہ پہاڑ پر جلتے ہوئے صفحات نظر آئے۔ بابا جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ "تھا" کا لفظ بہت چھوٹا ہوتا ہے، پر اس کے معنی کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ جاذب نے خیال کو جھٹکتے ہوئے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

"اور یہ خط بابا کو میری طرف سے دے دیجیے گا۔"

معراج بابا نے اس سے خط پکڑ کر وعدہ لے لیا۔ اتنے میں ناصر بھاگتا ہوا حجرے میں داخل ہوا اور اونچی آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا ہے......؟"

معراج بابا اُٹھے اور اسے مختصر بات بتائی۔ ان دونوں نے جاذب کے لاغر جسم کو سہارا دے کر اُٹھایا اور ایمبولینس تک لے گئے۔ وہاں لٹا کر ناصر نے جاذب کے چہرے کو اضطراب بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سطر گھوم رہی تھی۔

"مجھے وہاں جانا ہے، جہاں میری جگہ کوئی نہیں جا سکتا۔"

وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پا رہا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جاذب کو بلڈ کینسر ہو سکتا ہے۔ معراج بابا چپ چاپ ایک طرف بیٹھے تھے۔ جاذب نے آنکھیں کھولیں۔ ایمبولینس کے سائرن کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ سونا چاہتا تھا، پر یہ آواز اس کو تنگ کر رہی تھی۔ اس نے ناصر سے کہا۔

"ناصر بھائی......! یہ سائرن تو بند کروائیں۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

ناصر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"جاذب بھائی......! آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ابھی سونا نہیں ہے، جاگیں پلیز......! آنکھیں کھولنے کی کوشش کریں۔"

ناصر زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے چلا کر ڈرائیور سے کہا۔

"یار......! تیز کیوں نہیں چلاتے......؟ ہمیں جلد سے جلد ہسپتال پہنچنا ہے۔"

جاذب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ناصر پھر بولا۔

"بس جاذب بھائی......! ابھی سائرن بند ہو

مفید باتیں

* کوشش کیجیے وہ شخص آپ کو زندگی میں ہمیشہ مسکراتا ہوا ملے جسے آپ روزانہ آئینے میں دیکھتے ہیں۔
* کوئلوں کی سیاہی اس وقت چھوٹتی ہے جب وہ آگ میں داخل ہوتے ہیں۔ انسان بھی امتحان میں سے گزر کر ہی سرخرو ہوتا ہے۔
* حسد روح کا سرطان ہے۔
* سچ نیکیوں کی جڑ ہے۔
* نفس سے زیادہ کوئی جانور لگام کے قابل نہیں۔
* غلطیاں کرو لیکن غلطیاں دہراؤ مت۔
* پڑوسی کا جبر سہنا بھی باعث اجر ہے۔

(محمد زہیر-لاہور)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جائے گا۔ ہم پہنچنے والے ہیں ہسپتال۔"

جاذب نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ سامنے زینب کا چہرہ تھا۔ پہلے دن والا چہرہ، وہی خوشبو دار گلاب جیسا۔ اسے اپنی ایک ایک تحریر یاد آنے لگی۔ وہ بچپن میں آم کا پودا، وہ اس کے باپ کا اس کو کندھے پر اُٹھانا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ چند سیکنڈ میں بچپن سے یہاں تک کا سفر کر آیا ہے۔ اس کو اپنی روح میں ہلچل محسوس ہوئی۔ اب وہ جانتا تھا اپنی روح کو، اس نے آنکھیں کھولیں۔

"ناصر بھائی......! میری تلاش مکمل ہوئی۔ ملنے کا وقت آگیا ہے۔"

ناصر بس روئے جا رہا تھا۔ جاذب نے پھر آنکھ بند کی۔ پرانے درخت سے وہی پیلے پتے گرتے جا رہے تھے۔ وہ ان کو روز گرتے دیکھتا تھا، پر آج وہ آخری پتہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آنے لگا۔ جاذب اس کو اپنے پاؤں کے پاس گرتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ یہ وہی اس کے وقت کے درخت کا آخری پتہ تھا۔

اس کا چہرہ اب بھی مسکراہٹ سے بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ناصر نے اس کی سانسیں رُکتے ہوئے دیکھیں تو اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

معراج بابا نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہوئے ناصر سے موبائل مانگا اور جاذب کے والدین کو فون کرنے لگے۔

آخری پتھر

"بابا......! میں آپ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ بس میں شرمندہ ہوں کہ میں نے اپنا وعدہ توڑا۔ اس لئے آپ سے مل کر نہیں جا سکا۔ پر بابا......! آپ دیکھئے گا، آپ جو چاہتے تھے، وہ ہوگا۔ بس طریقہ بدلے گا۔ آپ کی خواہش کے مطابق میں ایم بی بی ایس تو نہیں کر پایا۔ کیونکہ وقت کم تھا۔ وقت ہوتا تو ضرور کرتا۔ چاہے ذیشان سے تھوڑے نمبر لیتا، پر کرتا ضرور۔ لیکن آپ پریشان نہ ہونا بابا......! اب میری کتاب وہی کام کرے گی۔ یہ آپ کے لئے عزت بھی کمائے گی اور پیسے بھی، اور اللہ کو منظور ہوا تو شہرت بھی۔ پھر بھی اگر آپ کو برا لگا ہے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔"

جاذب کے خط کا ایک ایک حرف جبار کو کوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ اپنا وزن بھی سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ جاذب کے گھر اس کی میت کو پہنچا کر معراج بابا نے اس کی ساری کہانی سنائی اور خط بھی دیا۔

جبار کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ کرسی پر گرے، ان سے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا جا رہا تھا۔ پھر زور لگا کر انہوں نے آواز نکالی۔

"ایک بار بتا تو دیا ہوتا۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ ہاں......! میرا قصور تو ہے، پر اتنی بڑی سزا کیوں دی مجھے......؟"

جبار کو ان کے بھائی نے سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ اپنا وہ وعدہ یاد کر کے پچھتا رہے تھے۔ ان میں میت کے سامنے جانے کی ہمت نہیں تھی۔

کلثوم خبر سن کر ابھی تک سکتے سے باہر نہیں آئی تھیں۔ جاذب کا بھائی انہیں سنبھال کر بیٹھا ہوا تھا۔ پورے گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ آخر جبار میت کے پاس گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"بیٹا......! اُٹھو، دیکھو میں تمہیں آئندہ کبھی نہیں ڈانٹوں گا۔ تم جو بھی کرو گے، میں کبھی نہیں روکوں گا۔ بلکہ میں خود کرواؤں گا تمہارے ساتھ۔ مجھے دیکھو بیٹا......! تم کیوں نہیں سن رہے......؟ تم اپنے باپ کی بات کیسے ٹال سکتے ہو......؟ میں بلا رہا ہوں، میں تمہارا باپ جبار احمد......!"

وہ بولتے جا رہے تھے، پر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ جاذب کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر اور اضطراب میں جا رہے تھے۔ ان کے بھائی نے پھر انہیں گرتے ہوئے سنبھالا۔ وہاں پر وہی پورا خاندان جمع ہو چکا تھا جس میں وہ عزت بنانا چاہتے تھے۔

اس کے باپ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر اسلام میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہ اس کے سامنے اپنی جان لے لیتے۔ ساری رسومات ادا کی گئیں۔ اس کا جنازہ معراج بابا نے خود پڑھایا۔ جنازے میں ارباب خان بھی نم آنکھوں کے ساتھ شامل تھے۔ قبر میں اُتارنے کا وقت آیا۔ قبر میں اُتارنے کے بعد آواز دی گئی کہ کون یہاں مرحوم کا سب سے قریبی ہے۔ آخری پتھر رکھنا ہے۔

جبار کو گڑھے میں اُتارا گیا۔ جبار نے لڑکھڑاتے ہوئے اُتر کر آخری پتھر رکھا۔ جبار کی آنکھوں کے سامنے جاذب کی پہلی تحریر فلم بن کر چل رہی تھی۔

"بے رحمی کے کفن میں لپیٹ کر آپ کی خواہشات کا جنازہ نکالتے ہوئے خودغرضی کے قبرستان میں لے جاتے ہیں۔ اور تنہائی کی قبر میں اُتار دیتے ہیں۔ لیکن زیست میں موت کا اصل مزہ اس وقت آتا ہے جب آپ سے سب سے زیادہ قرابت داری کا دعویٰ کرنے والا انسان قبر کا آخری پتھر لاپروائی کا رکھتا ہے۔"

ٹھنڈی چھاؤں

ایک پیپل کے درخت کے نیچے ایک خاتون اور ایک آدمی بیٹھے تھے۔ خاتون اس آدمی سے کہہ رہی تھی۔

"حسن......! آپ کو پتا ہے، میں آپ کو یہاں کیوں لاتی ہوں......؟"

وہ آدمی جو کافی حیران بیٹھا تھا، اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ خاتون پھر بولی۔

"کیونکہ مجھے اس درخت کے نیچے بہت سکون ملتا ہے۔ اس کی چھاؤں بہت ٹھنڈی لگتی ہے مجھے۔ آپ کو کچھ محسوس نہیں ہو رہا......؟"

اس آدمی نے پھر اُکتا کر اپنا سر دائیں بائیں گھمایا۔ اتنے میں ایک بزرگ قریب آئے اور دریافت کیا۔

"بیٹا......! آپ کو کافی دفعہ یہاں بیٹھے دیکھا ہے۔ درگاہ پر کوئی خاص منت مانی ہے......؟"

وہ آدمی فوراً بولا۔

"بابا جی......! پتا نہیں میری بیوی کو اس درخت میں کیا مل گیا ہے......؟ یہ ایک بار اس درگاہ میں دُعا مانگنے آئی تھی اور یہاں کچھ دیر بیٹھی۔ یہ مغرب کی سمت میں اُگا پیپل کا درخت اس کو اتنا پسند آگیا کہ اب جب بھی پریشان ہوتی ہے تو یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس درخت کی چھاؤں اس کو سکون دیتی ہے۔"

بابا جی کو کچھ یاد آیا۔ انہوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور خاتون سے پوچھنے لگے۔

"بیٹا......! نام کیا ہے تمہارا......؟"

اس خاتون کے تبسم ناز سے دائیں گال کا گڑھا واضح ہوا اور نازک آواز ہونٹوں سے باہر آئی۔

"زینب......!"

معراج بابا نے نام سنا تو مسکرائے اور زینب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل میں سوچا۔

"اچھا......! تو اس لئے شجر کاری صدقہ جاریہ ہے۔ درخت لگانے والے کب مرتے ہیں......؟!"

وہ دونوں بابا جی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ وہ پیپل کا درخت آج بھی مسکرا رہا ہے۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

مستقبل

آج جاذب کی کتاب ''من الظلمات الی النور'' چھپ چکی تھی۔ اس کی تقریبِ رُونمائی پر جبار کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ وہ وہاں سب سے واضح کرسی پر بیٹھے تقریب دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر تقریب کو گرم کر کے میزبان نے جبار کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور کچھ الفاظ کہیں۔

جبار کچھ ہچکچائے لیکن لوگوں کی پُرزور فرمائش پر انہیں سٹیج تک جانا ہی پڑا۔ انہوں نے اپنا تعارف آج پہلی بار جاذب احمد کے باپ کے نام سے سنا تھا اور اب ان کو لگ رہا تھا کہ وہ ساری عمر اسی تعارف سے جانے جائیں گے۔ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

''میں اب جبار احمد نہیں رہا، صرف جاذب احمد کا باپ ہی رہ گیا ہوں۔ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ اس طرح کے انسان کا باپ ہوں، پر بہت بدنصیب ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے سے بات بھی نہیں کر پایا۔ جوان بیٹے اپنے باپ کے جنازے کو کندھا دیتے ہیں لیکن میں نے ان ہی کندھوں پر اپنے بیٹے کا جنازہ اُٹھایا ہے۔ یہ بہت اذیت ناک تھا۔

لیکن میرے بیٹے کی عمر وہ نہیں تھی جو وہ جی کر گیا۔ میرا بیٹا اپنے خیالات کے زندہ رہنے تک لوگوں کے دلوں میں جیئے گا۔ اس کی زبان یہ کتاب ہے جس میں اس نے اپنی پوری سوچ ڈال دی۔ میں اس کتاب کے ہوتے ہوئے اس سے ملتی جلتی بات بتانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

لیکن ایک درخواست ہے۔ میری آپ سے کہ آپ کی اولاد مستقبل میں جس طرف جانا چاہتی ہے، ان کو اس طرف جانے دیجئے۔ میں جانتا ہوں آپ ان کی بھلائی کے لئے کر رہے ہوتے ہیں لیکن اب اپنا

بہت بڑا نقصان ہونے کے بعد میں یہ بات سمجھا ہوں کہ کسی کو اس کے چھوٹے سے نقصان کے صرف امکان کی وجہ سے عمر قید کی سزا دینا مناسب نہیں ہے۔

اگر وہ اپنی مرضی کا کام کریں گے تو شاید تھوڑا کمائیں، پر خوش اور پُرسکون ضرور رہیں گے اور اصل دولت سکون ہی ہوتی ہے۔

میں زندگی کے پچاس سال گزار چکا ہوں۔ اب پیچھے دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ چند لمحے گزرے اور آگے جتنے لمحے ہیں میرے پاس، وہ بھی بہت جلد گزر جائیں گے۔ یہ فیوچر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کروڑوں بھی کماؤ گے تو یہ لمحات گزر جائیں گے، اور ہزاروں کمانے والے کے بھی کٹ جاتے ہیں، یہ کبھی نہیں رُکتے۔

ہم پتا نہیں کس لئے پیسہ کما رہے ہیں کہ ہمارے پاس اس کو خرچ کرنے کا وقت بھی نہیں ہے......؟ جس اولاد کی خاطر کما رہے ہیں، اس کو اسی کے نام پر قربان کر رہے ہیں۔''

جبار کافی دیر بولتے رہے۔ وہ جب سٹیج سے اُترے تو بہت سی تالیاں بج رہی تھیں۔ سٹیج کے سامنے لوگ دو حصوں میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک گلی نما رستہ تھا، جو دروازے تک جاتا تھا۔ دروازے سے جاذب داخل ہوا۔ وہ باپ کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

''اس ایک کچی سی عمر والے کے فلسفے کو کوئی نہ سمجھا۔ جب اس کے کمرے سے لاش نکلی، خطوط نکلے تو لوگ سمجھے''۔

لیکن اب جاذب کو اس بھری محفل میں صرف جبار ہی دیکھ سکتے تھے۔

ختم شد

ایک تاثر ایک کہانی

بُزدل

میرا خیال تھا کہ ڈیانا ایسی ویسی نہیں، وہ آزاد خیال ضرور ہے بے حیا نہیں۔ مگر میرے دوست اس سے متفق نہ تھے۔

☆ محمد سعید اعوان
0333-6000708

کہتے ہیں کہ علم پر تجربے کو فوقیت حاصل ہے۔ جتنا انسان معاشرتی علم پر عبور رکھتا ہے اس قدر ہی خوشی اور غم اس کی زندگی کا حصہ بنتے ہیں۔ دوستوں کی ایک محفل جمع ہوئی تھی جو اہل علم پر مشتمل تھی۔ ایک موضوع سخن تھا۔ ''کامیاب انسان کون ہے؟'' مختلف آراء تھیں۔ کوئی دولت، کوئی شہرت، اعلیٰ تعلیم، بیرون ملک روانگی کو کامیابی کی منزل گردانا جا رہا تھا باوجود اس کے کہ ایک مشہور ضرب المثل ہے۔ زندگی کو اتنا نقصان سیلابوں، زلزلوں اور بیماریوں نے نہیں پہنچایا جتنا غلط مشوروں نے۔ جس کی مثال ہیروشیما پر گرتے ہوئے ایٹم بم، مختلف سیاسی و دینی مشورے، جو فرقہ پرستی کا سبب بنے۔ قومیں تقسیم ہوئیں اور یوں امیر کبیر ہوتے ہوئے بھی انسان پس کے رہ گیا۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو ارسطو، افلاطون کے ارشادات سے مزید بور کروں اپنی ایک دلچسپ کہانی سناتا ہوں جو انہی مشاہدات اور تجربات کے موضوع سے ملتی جلتی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں کویت میں کام کے سلسلے میں دوسرے مزدوروں کی طرح اپنا مستقبل روشن بنانے کے لئے دن رات کوشاں تھا۔ میں جس علاقے نیو خیطان میں رہتا تھا یہ تقریباً مزدور طبقے پر مبنی خالصتاً مردانہ علاقہ تھا جہاں دور دور تک کوئی فیملی یا خاتون نظر نہ آتی تھی۔ آتی بھی تو دیر تک گھورنے کا عمل اور تبصرے جاری رہتے۔ اپنے خاندان سے دوری کا حل (صنفِ مخالف کی دید) کی تشنگی کو دور کرنے کے لئے شہر کی ماڈرن مارکیٹوں، پارکوں یا ساحل سمندر کا رخ کیا جاتا کہ جہاں اس صنف کی دید سے من کو شانتی مل جاتی تھی۔ ایک اس کے علاوہ بھی تفریح کا راستہ تھا جو ہر گھر بلکہ ہر کمرے میں وی سی آر پر انڈین، پاکستانی فلموں کا دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ پاکستانی فلمیں بھی ان دنوں خاصی مقبول تھیں اس لئے یہ بھی خاص و عام میں برابر دیکھی جاتی تھیں۔ عموماً یہ فلمیں ویڈیو شاپس سے کرائے پر دستیاب تھیں۔

ہمارے قریب تر ایک دُکان 'فیر یو المرجان' تھی جس کا مالک تو کویتی عربی تھا لیکن وہاں سیلز مین پاکستانی تھے جو انڈین/ پاکستانی گاہکوں کو بآسانی ڈیل کر سکتے تھے۔ اکثر میرا بھی وہاں جانا ہوتا اور میں پاکستانی فلموں کا بڑا خریدار تھا۔ ننھا، علی اعجاز، انجمن، سلطان راہی کی فلمیں بڑی پُرلطف بھی ہوتیں اور وطن سے قربت کا احساس بھی رہتا۔ ایک دن میں نے یونہی

WWW.AIOURDUBOOKS.NET